THE PEOPLE OF THE MOSQUE

اہلِ مسجد

مُصنّفہ

پادری بیون جونز صاحب
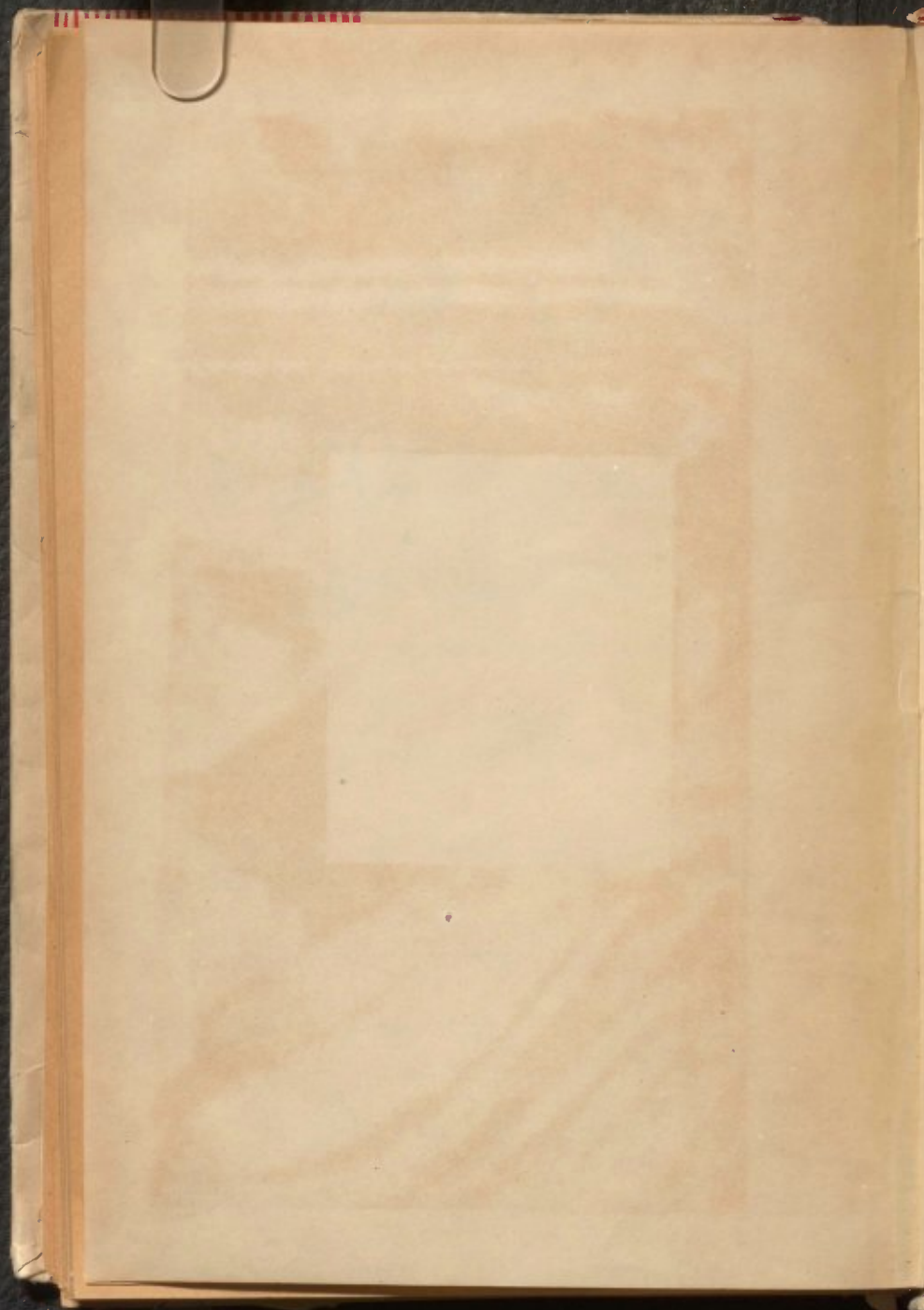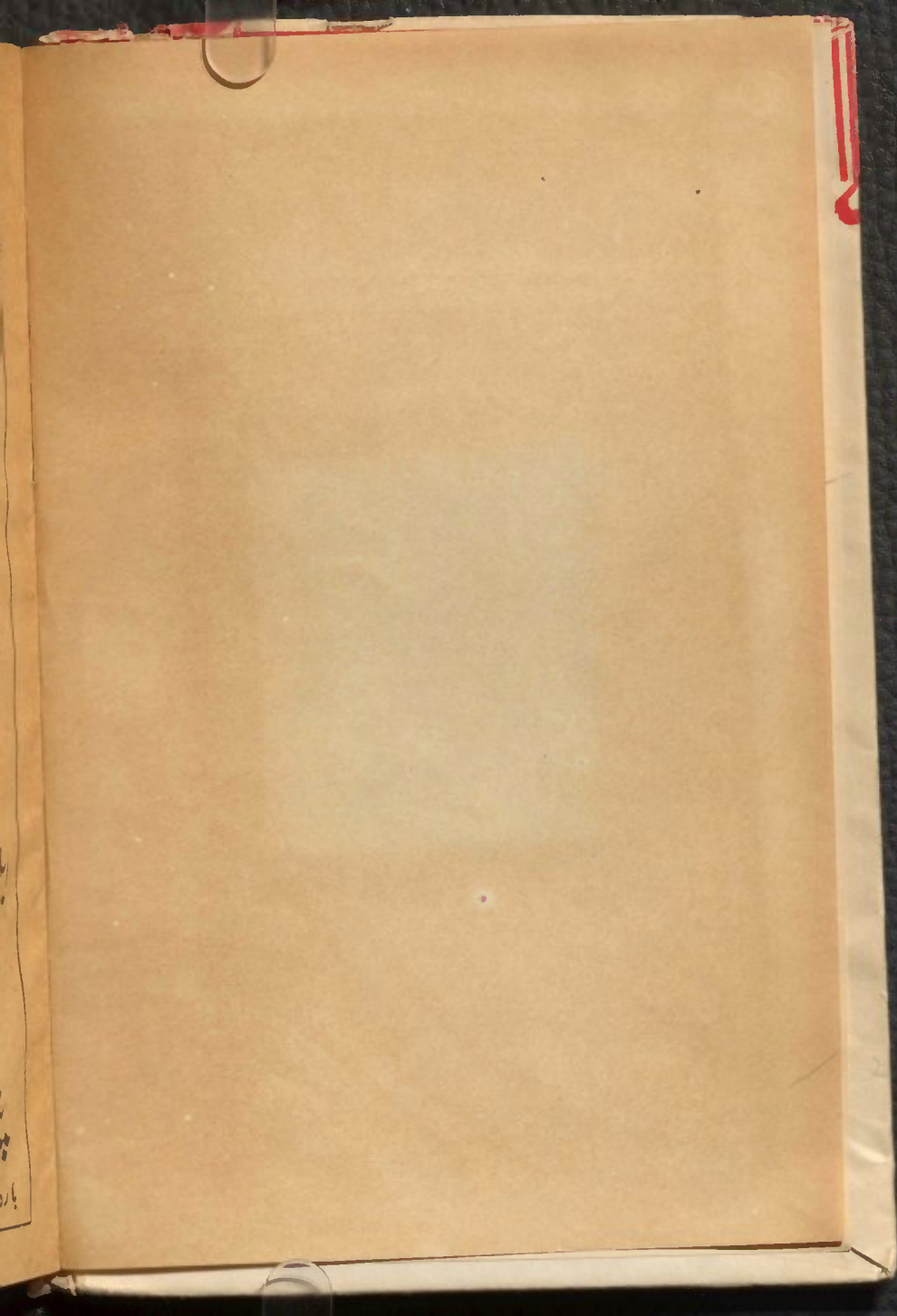
اہلِ مسجد

یعنی

اسلام کے آغاز و ارکان - اسکی ہندو پاکستانی تواریخ تحریکات اور اصلاحات کا مختصر بیان

مُصنّفہ

ایل - بیون جونز - بی - اے (ویلز) بی - ڈی (الندن)

مُترجمہ

جے - عبدالسبحان - بی - اے - بی - ڈی

پنجاب رلیجس بُک سوسائٹی - انارکلی لاہور

بار دوم — سنہ ۱۹۵۲ء — تعداد ۱۰۰۰

پی-آر-بی-ایس پریس لاہور میں
باہتمام
پادری-آر-گرین (پرنٹر و پبلشر)
سیکرٹری
پنجاب رلیجس بک سوسائٹی- انارکلی لاہور
چھپ کر شائع ہوئی۔

دیباچہ

یہ کتاب اسلام کا ابتدائی مطالعہ ہے۔ جیسا کہ خود اس کے نام سے ظاہر ہے اور پاکستان کی خاص ضرورت کو پورا کرنے کے لئے تالیف کی گئی ہے۔ نیشنل کرسچین کونسل کی خاص کمیٹی کی درخواست پر اس کتاب کی تیاری کا کام شروع کیا گیا تھا ۔

چند برسوں سے یہ ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ پاکستان کی زبانوں میں جدید معلومات کے مطابق دیسی پادریوں۔ پاسبانوں مبشّروں اور اُستادوں وغیرہ کے مطالعہ کے لئے اس طرز کی کوئی کتاب تیار کی جائے۔ جو کتابیں اِس مضمون پر دستیاب ہیں وہ بہت تھوڑی ہیں۔ اور ان میں زیادہ تر ایسی کتابیں ہیں۔ جو قدیم طرز پر لکھی گئی ہیں۔ اور موجودہ زمانہ کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ناکافی ہیں ۔

علاوہ ازیں ہند و پاکستانی مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ میں تبدیلی ہونے کے سبب اس قسم کی کتاب کی اور بھی اشد ضرورت ہے۔ اور اگرچہ یہ صحیح ہے کہ راسخ الاعتقاد مسلمانوں کا شمار اب بھی زیادہ ہے اور اسلام کے متعلّق ان کا دعوٰی وہی ہے جو قدیم سے چلا آرہا ہے اور مسیحیت کی نسبت بھی ان کے خیالات جیسے تب تھے ویسے ہی اب بھی ہیں۔ تاہم مسلمانوں کے تعلیمیافتہ حلقہ میں ایسے لوگ نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں جن کے مذہبی خیالات پلٹا کھا رہے ہیں ۔ اور اب

وہ نہ صرف مسیحی مبلّغین بلکہ پرانی وضع اور کٹر خیالات کے ملّاؤں پر بھی حملہ کر رہے ہیں۔ جیسا کہ اِس کتاب سے ظاہر ہوگا ؛

مسلمانوں کا یہ تعلیمیافتہ طبقہ ارادیث کے ساتھ جو مسلمانوں میں نہایت مقبول عام ہیں بڑی لاپرواہی کا سلوک کر رہا ہے۔ اور قرآن کی تفسیر عقلی اصول کی بنا پر کر رہا ہے۔ راسخ الاعتقاد مسلمان اگرچہ قرآن و حدیث کے ساتھ ان تعلیمیافتہ مسلمانوں کے بیباکانہ سلوک پر اپنی برانگیختگی کا اظہار کر رہے ہیں تاہم جب کبھی ضرورت پڑتی ہے تو مسیحیت کی منادی کی مخالفت میں اُن کے دلائل کا استعمال کرنے سے نہیں جھجکتے ؛

قرآن کے اقتباس پیش کرنے میں ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ استعمال کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ ترجمہ عام فہم ہونے کے علاوہ مسلمانوں میں مستند بھی ہے ؛

کتاب کا یہ ترجمہ میرے دوست اور ہم خدمت پادری جے۔ اے۔ سبحان کا ہے۔ جنہوں نے احتیاط اور خلوص دلی کے ساتھ اس کام کو انجام دیا ہے ؛

ہم دونوں نے بہتیرے گھنٹے اس کام کے پورا کرنے میں ایک ساتھ صرف کئے ہیں اور ہمارے ہم خدمت مسیحی مبشّرین دکارندے جن کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ ہمیشہ ہمارے ذہن میں رہے ہیں اور ہم اب اس امید اور دُعا کے ساتھ اسے شائع کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے درمیان خوشخبری کے پھیلانے میں یہ ہندوستانی اور پاکستانی مسیحیوں کے لئے واقعی مفید ثابت ہو ؛

ایل۔ بیون جونز

ر

فہرست مضامین

چوتھا باب - دُنیائے جدید میں اسلام کی حالت

پانچواں باب - مسیحیت اور اسلام -

پہلا باب

اِسلام کا آغاز اور اُس کا پھیلاؤ

پہلی فصل

مُلک عرب اور وہاں کے لوگ

اسلام کے مطالعہ کے شروع میں ملک عرب اور وہاں کے لوگوں کے بیان کا عام دستور رہا ہے۔ اس دستور العمل کی معقول وجہ ہے۔ یہ ملک اسلام کا گہوارہ ہے۔ اس میں پیغمبرِ اسلام کی جائے پیدائش اور مدفن واقع ہیں۔ یہاں وہ مرکزی سجدہ گاہ ہے۔ جس کی پاسبانی بڑی غیرت کے ساتھ کیجاتی ہے تمام دنیا کے مسلمان اس رُخ ہو کر اپنی نمازیں پڑھتے ہیں اور وہاں اکثر ہر سال حج کو جاتے ہیں ؛

(۱) قدیم روائتیں

ان کے علاوہ راسخ الاعتقاد مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ مکّہ کے اس مقدس کو جسے کعبہ اور بیت اللہ یا خدا کا گھر کہتے ہیں ان کے پیغمبر کی آمد

کے بہت عرصہ پیشتر سے اسے خاص عظمت حاصل ہے چنانچہ اس خیالِ خام میں بڑی دلچسپی لی جاتی ہے اور مدرسوں میں اب تک لڑکوں کو سکھایا جاتا ہے کہ آدم نے اس مقدس کی بنیاد رکھی اور وہ سیاہ پتّھر جو حجرِ اسود کہلاتا ہے اور جسے وہ بہشت سے اپنے ساتھ لائے تھے اسے وہاں نصب کیا اور حج کے رسوم جبریئل نے آدم کو سکھائے ۔ جن میں کعبہ کے گرد چکّر لگانا بھی شامل تھا اور یہ بھی ان کا عقیدہ ہے کہ ابراہیمؑ اسی سرزمین میں ہاجرہ اور اسماعیل کو لائے تھے اور چاہِ زمزم کے پانی سے جو کعبہ کے بالکل قریب ہے اسماعیل کی پیاس بجھائی گئی تھی اور جب نوحؑ کے طوفان سے کعبہ کو نقصان پہنچا تو اس کی مرمت کا کام خدا نے ابراہیم اور اس کے بیٹے کے سپرد کیا تھا ۔ (دیکھو قرآن سورۂ بقر ۱۱۹ آیت سے ۱۲۲ آیت ۔ سورۂ حج آیت ۲۷)۔

(۲) عرب کی جغرافیائی حالت

سرزمین عرب ایک علیحدہ اور بنجر ملک ہے ۔ اس کے حدود اربعہ سے ظاہر ہے کہ عربوں نے اس جزیرہ نما کو جو ان کا وطن ہے جزیرۃ العرب کے نام سے صحیح طور پر پکارا ہے ۔ اس کے مشرق میں خلیج فارس اور خلیج عمان ہیں ۔ جنوب میں بحر ہند اور مغرب میں بحیرہ احمر واقع ہیں اور اس کے شمال میں وہ بڑا ریگستان ہے جو مثل سمندر کے خارجی حملہ آوروں کے لئے بڑی روک ثابت ہوا ہے ۔

اس ملک کا سب سے کم دلکش حصّہ وہ ہے ۔ جو سب سے پہلے نظر آتا ہے یعنے ساحل ۔ ساحل کے پرے ملک کے چاروں طرف مثل ایک قسم کے بُرّ کے حلقہ کئے ہوئے چھوٹی چھوٹی بنجر پہاڑیوں کا سلسلہ ہے تاہم

عرب میں خلاف توقع زرخیزی اور آب وہوا کے حیرت انگیز مناظر موجود ہیں۔ سارے رقبہ کا دو تہائی (⅔) حِصّہ۔جس کی سب سے بڑی لمبائی ایک ہزار میل اور اوسط چوڑائی چھ سو میل ہے۔مزروعہ زمین ہے یا قابل زراعت ہے باقی ملک خصُوصًا جنوبی حِصّہ ریگستان ہے جو زراعت کے بالکل ناقابل ہے +

اس ملک کی عام ساخت یوں واقع ہوئی ہے کہ اس کے وسط میں زمین مرتفع ہے۔جس کی اوسط بلندی تین ہزار فٹ ہے اور جس کے چاروں طرف ریگستان کا ایک حلقہ ہے۔جو جنوب۔مغرب و مشرق میں ریتلا ہے اور شمال میں اس کی زمین پتھریلی ہے۔اس ریتلے حلقے اور سمندر کے بیچ میں مذکورہ بالا بنجر پہاڑیاں ہیں۔لیکن یمن اور عمان میں ان کی چوٹیوں کی بلندی آٹھ ہزار اور دس ہزار فٹ تک پہنچتی ہے اور یہاں ان کی آب وہوا زیادہ بہتر اور زمین زیادہ زرخیز ہو جاتی ہے ÷

عرب میں کوئی ندی نہیں ہے اور نہ اس کے پہاڑی جھرنے ساحل تک پہنچ پاتے ہیں۔اس کی وادیاں جو برسات کے پانی کی نالیاں ہیں وہ بھی سال کے نَو مہینے خشک پڑی رہتی ہیں۔عموماً موسم سخت ہوتا ہے اور گرمی کے موسم میں شدّت کی گرمی پڑتی ہے اور بعض اوقات جاڑے میں کڑاکے کی سردی۔علاوہ ان کے کوہ آتش فشاں کے سیاہ اور بنجر قطعات جنہیں حرّہ کہتے ہیں۔اس کے ایک وسیع حِصّہ پر خصُوصًا شمال مشرق میں پھیلے ہیں۔ان سے ملک کی ہیئت نہایت بدنما معلوم ہوتی ہے ÷

یہ سرزمین قریب اسّی لاکھ لوگوں کا وطن ہے۔جن کی جسمانی صورتوں اور عام خصلتوں سے وہاں کی آب وہوا کی سختی کے آثار نمایاں ہیں +

فی الحال ملک عرب کے صرف اس ہی حِصّہ سے ہمیں سروکار ہے کہ

جس کا تعلق اسلام کے ظہور سے ہے اور جسے صحیح طور پر اسلام کا گہوارہ کہہ سکتے ہیں یعنی صوبۂ حجاز۔ اس صوبہ میں مکّہ اور مدینہ کا علاقہ شامل ہے جنہیں حرمین کہتے ہیں یعنے دو مقدّس مقامات کہ جن میں سے ایک پیغمبرِ عرب کی جائے پیدائش اور دوسرا اُن کا مدفن ہے۔ کافروں یعنے غیر مُسلموں کو اجازت نہیں ہے کہ ان کی حدود کے اندر داخل ہو کر وہاں کی زمین ناپاک کریں (سورۃ التوبہ آیت ۲۸)

تاہم اکثر اولوالعزم اور صاحبِ ہمّت سیّاح اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر وہاں کی مقدّس عبادت گاہوں کے اندر بھی داخل ہوئے ہیں اور مسلمانوں کے ذریعہ وہاں کے حالات کا جو کچھ پتہ لگا ہے اُس پر اُنہوں نے مزید اضافہ کیا ہے ٭

(۳) اہلِ عرب

ملک عرب کی آبادی دو قسم کے لوگوں پر منقسم ہے ایک قسم کے لوگ بدو کہلاتے ہیں یہ خانہ بدوش چرواہے ہیں اور دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو گاؤں یا قصبوں میں بسے ہیں آبادی کے لحاظ سے بدوؤں کا شمار ہمیشہ زیادہ رہا ہے۔ اُنہوں نے عربی عادات کا اصل نمونہ اب تک قائم رکھا ہے۔ لیکن گاؤں اور قصبوں میں رہنے والے خارجی اثرات اور غیر عربوں سے خلط ملط کے باعث بہت بدل گئے ہیں۔ تاہم دراصل یہ ایک ہی قوم ہیں۔ ایک ہی زبان بولتے ہیں اور ایک ہی قسم کے عادات اور ایک ہی مذہب کے پَیرو ہیں ٭

مُسلم مورّخین اسلام کے جلال کو بڑھا کر ظاہر کرنے کی آرزو میں اسلام سے قبل کے حالاتِ عرب زیادہ خراب بتاتے ہیں۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے

کہ اسلام سے پیشتر کے عرب بڑے گنوار جاہل اور توہمات پرست تھے اور اس لئے اُس زمانہ کو "ایّامِ جاہلیّت" کہتے ہیں۔ لیکن کیا اصل عرب کی زندگی و عادات سے اُن کے اس خیال کی تردید نہیں ہوتی۔ بجائے اس کے کہ یہ وحشی اقوام جیسے معلوم پڑیں ان کے انداز سے استقلال اور چہرے سے جوانمردی ٹپکتی ہے ۔ یہ ایسے لوگ معلوم پڑتے ہیں کہ جنہوں نے اپنی قوّت ودانش کو ترقی دی ہے کیونکہ ان صفتوں کی ہر ایسے شخص کو ضرورت ہے کہ جسے سخت موسموں اور ریگستان کی تنگیوں میں زندگی اور موت کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ عرب ہمیشہ سے ایسی ہی قوم رہی چلی آئی ہے ؂

عربی زبان کی خوبیاں اور عربوں کا شہرۂ آفاق شوقِ شاعری زمانۂ اسلام سے پیشتر ان کے اوصاف رہے ہیں اور اس کے بعد بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ اس اَن پڑھ قوم کے لوگوں میں یہاں تک کہ عورتوں میں بھی شاعری کا شوق تھا اور اب بھی ہے اور اس فن کے حاصل کرنے میں بڑے سرگرم رہتے ہیں۔ ہجرت سے قبل کی چند نظمیں ابتک محفوظ ہیں۔ علاوہ ازیں عربی زبان خود ایک اعلیٰ زبان ہے اور یہ ایسی زبان نہیں ہے کہ پست اقوام میں پائی جاتے ؂

(۴) بدوؤں کی خصلت

عربوں کی زندگی کے متعلّق جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ انکی زندگی میں اصلاح کی گنجائش نہیں ہے۔ ریگستانی زندگی اگر ایک طرف چند قابلِ تحسین عادات جیسے قبیلہ کی وفاداری کو ترقی دیتی ہے تو دوسری طرف ناقابل پسند خاصیّتوں کا بھی باعث ہے۔ کیونکہ بدو حقیقت میں خود پرست واقع ہُوا ہے اور یہ اس وجہ سے کہ ریگستان افرادی حیثیت سے زندگی بسر کرنے پر اُسے مجبور

کرتا ہے۔ چھوٹے نالے اور تھوڑی ہریالی پر وہ اپنے ہمسایہ سے جھگڑتا اور لڑ پڑتا ہے کیونکہ ان کے بغیر اپنی زندگی بسر کرنا اور مویشی پالنا اس کے لئے ناممکن ہے۔ غرضیکہ اسماعیلی نمونے پر "اس کا ہاتھ سب کے خلاف اور سب کا ہاتھ اس کے خلاف" ہے وہ ہمیشہ لوٹ کی تاک میں رہتا ہے اور ایسے مسافر کو جو دوستانہ قبیلہ کے کسی رہبر کی حفاظت میں نہ ہو وہ بلاپس وپیش لوٹ لیتا ہے ؛

لہذا چالاکی اور عیّاری میں وہ ماہر ہے اور اپنے دشمن پر اچانک حملہ کردینے کی تاک میں رہتا ہے۔ ایسی لڑائیوں میں جان بوجھ کر بھاگ جانا بُزدلی نہیں خیال کی جاتی ہے ؛

تاہم وہ مہمان نوازی کرسکتا ہے اور کرتا بھی ہے۔ جس سال اُسے اچھی فصل ملتی ہے وہ ایک فیّاض مہمان نواز کے سے کام کرتا ہے لیکن اُس کی یہ فیّاضی کسی رحمدلی یا ہمدردی کے خیال سے نہیں ہوتی بلکہ خودنمائی کی غرض سے ؛

اس قسم کی سخت اور خطرہ کی زندگی نے اس میں حیرت انگیز قوّت برداشت پیدا کردی ہے جو فی الحقیقت صبر کرنا نہیں ہے بلکہ ایسی قوّت کہ جس کے وسیلہ وہ زندگی گذارتا رہتا ہے اگرچہ فطرت اس پر سختی ہی کیوں نہ کرے اور اس کا پڑوسی ممکن ہے کہ چور ہی کیوں نہ ہو وہ مستقل رہتا ہے ؛

لہذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ وہ بآسانی کسی حکومت کا تابع نہیں ہوتا ؛ قبیلہ کا شیخ یا سردار آزادانہ انتخاب کے ذریعہ مقرر کیا جاتا ہے اور اُس کا اثر و اقتدار اُس وقت تک رہتا ہے جبتک سب کے ساتھ اُسکا برتاؤ برابری کا ہے لیکن جونہی شیخ کے تسلّط میں کمی واقع ہوتی ہے تو بدو کی دبی ہوئی باغیانہ رُوح فوراً ظاہر ہوجاتی ہے ؛

(۵) مکّہ اور وہاں کے لوگ

برعکس بدوؤں کے اہالیانِ شہر خارجی اثرات کے ہمیشہ زیر اثر رہے

ہیں۔ اس لئے ان کی خصلت و عادات سمجھنے کو چاہیئے کہ محمد صاحب کے زمانہ میں جیسے کچھ ان کے حالات تھے اُن کے مطابق ان کا مطالعہ کریں۔

اُس زمانہ میں حجاز کا مذہبی اور تجارتی مرکز مکّہ تھا اور اس لئے وہاں کے لوگوں اور ان کے تجارتی مشغلوں کا مختصر بیان ان کی زندگی کا ایک نمونہ سمجھنا چاہیئے۔ مکّہ جغرافیائی حیثیت سے یعنے تجارتی شہروں اور ہندوستان کی راہ کے نہایت قریب ہونے کے سبب مالدار شہر تھا۔ سب سے بااثر قبیلہ مکّہ میں قریش کا تھا۔ جس نے تاجروں کی انجمن قائم کر کے نہ صرف تجارت کو ہی اس کے ذریعہ ملک میں ترقی دی تھی بلکہ آئین و انتظام بھی برقرار رکھا تھا۔

یہ انجمن قبیلوں کے سرداروں کی جماعت تھی۔ جس میں بڑے مالدار اور با اقتدار خاندانوں کے لوگ شامل تھے۔ محمد صاحب کے زمانہ میں ابو سفیان اپنی دولت کی کثرت اور حب الوطنی کے سبب سب سے زیادہ ممتاز تھا۔ تاہم انجمن کے ہر شریک کو کسی مسودہ قانون کے نفاذ کو روک دینے کا حق و اختیار حاصل تھا۔ اور یوں وہ کسی بااثر شریک مثلاً ابو سفیان کی تجویز کو جو اُن کے خیال میں رفاہِ عام کے خلاف ہو متحد ہو کر روک سکتے تھے۔

اہلیانِ مکّہ ہر ایسی چیز سے کہ جو اُن کی شہری تجارت کو خطرہ میں ڈال دے خائف تھے اس سبب سے سالانہ حج کی رسم عرب کے تمام لوگوں کے لئے بلا کسی مزاحمت کے قائم رکھنا اور جن مہینوں میں جنگ حرام سمجھی جاتی تھی اُن کا پورا احترام کرنا ضروری تھا۔ ان باتوں میں اگر کوئی قصور کرتا تو پہلے وہ متنبہ کیا جاتا اور پھر اُسے دھمکی دی جاتی۔ اور اس پر بھی اگر وہ نہ مانتا تو قانونی پناہ سے خارج سمجھا جاتا اور خود اپنے قبیلہ کی حمایت سے بھی محروم کر دیا جاتا۔ ہم آگے چل کر دیکھینگے کہ محمد صاحب کے زمانہ میں یہ پکّی یگانگت مکّہ کے لوگوں

کی خاص صفت تھی۔

غرض کہ مکہ کے لوگ پورے شوق کے ساتھ تجارت اور دولت کی افزائش میں منہمک تھے۔ اس مقصد کے سبب اُونٹ اور قافلے اُن کے خیالات اور منصوبوں میں سب سے مقدّم تھے بعض اوقات شہر کے قریب قریب تمام لوگ مرد و عورت اپنا اپنا روپیہ کسی قافلہ میں لگاتے تھے جو تجارتی اشیائے لے کر شہر سے روانہ ہوتا اور یوں ہر ایک کو ایسے قافلہ سے مالی سروکار ہوتا۔ اور اس قافلہ کے لوٹنے پر ہر ایک اپنا اپنا منافع حاصل کرتا اور اس طریقہ سے بہتیرے واقعی دولت مند بن جاتے تھے۔

یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوتا ہے کہ جہاں مکّہ بسا ہوا ہے وہ مقام صحت کے لئے نہایت مُضر ہے۔ یہ شہر دو ڈھلوان اور بنجر پہاڑوں کے درمیان ایک کھلی وادی میں واقع ہے۔ جس میں جاڑے کے طوفان کا پانی بہ کر جمع ہو جاتا ہے۔ اس طوفان سے جائداد کو بڑا نقصان پہنچتا ہے اور خود کعبہ کئی مرتبہ اس سے منہدم ہو چکا ہے۔ برسات میں یہ جگہ دلدل بن جاتی ہے اور گرمیوں میں بھٹی۔ اور جب گرمیوں کے دنوں میں کہیں پانی نہیں ملتا تو یہاں کے باشندے زمزم کا پانی جو قدرے بدمزہ ہوتا ہے استعمال میں لاتے ہیں۔

(۶) کعبہ اور وہاں کا مذہب

عرب کی مرکزی عبادت گاہ کعبہ کا ذکر کئی بار آچکا ہے۔ کعبہ کیا ہے۔ اور اس سے کیا مراد ہے؟ یہ لفظ کعب سے نکلا ہے۔ اس کی پیمائش لمبائی میں ۳۹ فٹ اور عرض میں ۳۳ فٹ ہے اور اونچائی اس کی ۴۹ فٹ کے قریب ہے کعبہ میں خاص چیز جس کی یہ تعظیم کرتے ہیں حجرِ اسود یا سیاہ پتّھر ہے جو زمین سے ۵ فٹ

بلندی پر اس کے جنوب مشرقی کونے میں جڑا ہوا ہے۔ مکّہ کا یہ سب سے پرانا خزانہ ہے۔ غالباً یہ شہاب ثاقب کا ایک ٹکڑا ہے اور چونکہ یہ آسمان سے گرا تھا اس لئے قدیم زمانہ سے لوگ اس سے ڈرتے اور اس کا احترام کرتے ہیں۔ یہ خاص پتھر اُن بہیترے پتّھروں میں سے اکیلا رہ گیا ہے۔ جن کو اہل عرب اسلام سے پیشتر مقدّس سمجھتے تھے۔ یہ پتّھر عجیب شکلوں کے تھے۔ بعض ان میں سے انسان کی شکل کے ملیے تھے۔ لیکن آدمیوں کے ہاتھوں کی تراشی ہوئی یہ مورتیں نہیں تھیں بلکہ ہوا اور بارش کے اثر سے مختلف شکلوں میں یہ ڈھل جاتے تھے اور اُنہیں کو دیوتا اور دیوی سمجھ کر وہ پوجتے تھے۔ بعض پتّھر جہاں ہوتے وہیں انکی پوجا کی جاتی تھی اور بعض کے گرد پتّھروں کا ایک گول احاطہ بنا دیتے تھے اور بعض کو کسی مندر میں جڑ دیتے تھے جیسے حجرِ اسود۔ کسی زمانہ میں تین سَو سے زیادہ اُیسے پتّھر کعبہ میں تھے۔ اس قسم کے مندر کے قریب عموماً ایک کنواں پوجا کرنے والوں کی رسمی طہارت کے لئے ہوا کرتا تھا اور بعض اوقات ایک مقدّس درخت بھی مندر کے پاس ہوتا تھا تاکہ جس پر لوگ اپنی منّتیں یا نذریں چڑھایا کرتے تھے۔ مندر کا پورا احاطہ حرم کہلاتا تھا اور یہ حصّہ نہایت مقدّس سمجھا جاتا تھا اور کل جاندار انسان ہوں یا حیوان سب اس میں پناہ لے سکتے تھے۔ وہاں کے درخت تک واجب الاحترام سمجھے جاتے تھے اور کسی کو اجازت نہیں تھی کہ ان کی ایک ٹہنی بھی توڑ لے۔ زیادہ تر تمام سال یہ مقامات ویران پڑے رہتے تھے لیکن خاص موقعوں پر قبیلے ان مندروں میں اکٹھے ہو کر قربانیاں چڑھاتے تھے۔ یہ قربانیاں خاصکر اونٹوں کی ہوا کرتی تھیں جنہیں ہر قبیلہ اپنے خاص دیوتا یا دیوی کے نام پر چڑھاتا تھا۔ ان قربانیوں کے وقت جتنے وہاں حاضر ہوتے چند خاص طہارت کے رسوم پورے کرتے تھے۔ اور پوجا کرنے والے جانور کی قربانی کا خون ان مقدّس پتّھروں پر اونڈیلتے اور اپنے سروں

کو مونڈ کر قربانی کا گوشت کھاتے تھے ۔

بعض اوقات مثلاً قحط کے ایام میں جلوس بنا کر ان پتھروں کو نکالتے اور حج کے موسم میں جلوس کے ساتھ ان کو مندر میں لے جاتے اور وہاں پہنچکر مندر کے گرد سات مرتبہ گھومتے تھے ۔ ان مندروں میں لوگ غیب کی خبریں معلوم کرنے بھی آیا کرتے تھے ۔ اور کاہن یا غیب داں خبر بتانے والے ہوا کرتے تھے ۔

مندروں میں پرستش کرانے کے لئے پجاریوں کی کوئی مخصوص جماعت نہیں ہوا کرتی تھی ۔ ان کے محافظ یا کاہن ضروری فرائض انجام دیا کرتے تھے ۔ کہانت کے کام کیلئے اکثر عورتیں ہوا کرتی تھیں جنہیں کاہنہ کہتے تھے اور جو غیب بین سمجھی جاتی تھیں ۔

عرب قسمت کے قائل تھے آئندہ زندگی یا بقاءِ روح کے متعلق ان کے خیالات نہایت ناقص تھے ۔ یہ جنات کو مانتے اور ان سے ڈرتے تھے ۔ یہ خلقت ان کے خیال کے مطابق عالم ارواح کی قسم سے تھی کہ جن میں انسانی فطرت بھی موجود تھی اور دہشت انگیز طریقے پر یہ اپنے آپ کو دکھائی دیکر غائب ہو جاتے تھے ۔ لیکن محمد صاحب سے ایک صدی پیشتر ایسے عرب بھی تھے جو اللہ یعنے خدا کو ماننے لگے تھے اور اللہ اکبر کہا کرتے تھے ۔ جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اللہ اور معبودوں سے بڑا ہے ۔ قرآن میں اکثر ایسے لوگوں کا ذکر آیا ہے ۔ جنہیں حنیف کہا گیا ہے (دیکھو سورہ آل عمران ۶۰ و ۸۹ آیت ۔ سورۂ یونس ۱۰۵ و ۲۲ آیات) عام طور پر ان سے موحدین کی ایسی جماعت سمجھی گئی ہے جو نہ یہودی تھی نہ مسیحی ۔

(۷) یہودی اور مسیحی

اب اختصار کے ساتھ حجاز کے یہودیوں اور مسیحیوں کا ذکر کرنا رہ گیا ہے ۔

یہودی جن کا شمار شہریوں میں تھا عرب کے سرسبز باغات اور مکہ کے قریب شہر طائف میں رہتے تھے ۔ لیکن ان کی خاص آبادی مدینہ میں

تھی جہاں کی تجارت اُنہوں نے اپنے ہاتھ میں لی تھی۔ مدینہ کے عرب کہ جن کے یہ سوداگر تھے۔ شمار میں اُن سے آخر کار بڑھ گئے اور وہاں کی سرداری کی آرزو کرنے لگے۔

عرب کے مقابلہ میں یہودی ان سے بہتر تھے اور اس میں شک نہیں کہ وہ خود بھی اپنے آپ کو افضل سمجھتے تھے۔ یہودیوں کے ربّی۔ عبادت خانے اور مدرسے تھے۔ اور سب سے بڑھ کر اُن کے پاس اُن کی پاک کتاب تھی برعکس اس کے عرب اُمّی یا غیر قوم تھے اور اُن کے پاس کوئی کتاب نہ تھی اِس لِئے یہودی اُن سے نفرت کرتے تھے۔

یہودیوں کے مقابلہ میں مسیحیوں کی جماعت مختصر اور کمتر درجہ کی تھی۔ اور جگہ جگہ منتشر ہونے کے سبب اُن کا اثر بھی کم تھا۔ اُن کی سب سے با اثر جماعت یمن میں تھی۔ اور کچھ عراق اور کچھ ملک شام کی سرحدوں پہ بستے تھے ملک شام کے مسیحی راہبوں کے ساتھ محمدؐ صاحب نے دوستانہ ملاقات کی تھی۔ خود مکہ میں ابی سبینیا کے مسیحیوں کی ایک جماعت رہتی تھی یہودیوں کی طرح مسیحیوں کا پیشہ بھی تجارت تھا اور اپنا مال لے کر یہ شہر اور ریگستان کے بدوی خیموں کا سفر کرتے تھے۔ یہ مسیحی جن میں سے اکثر ظلم کے سبب اپنا ملک چھوڑ کر یہاں آ کر بسے تھے زیادہ تر اپنے مذہب سے ناواقف تھے۔ اگرچہ غالباً مسیحیوں ہی کے ذریعے عربی زبان تحریر میں آئی تاہم محمدؐ صاحب کے زمانہ میں بائبل عربی زبان میں نہیں تھی اور اپنی عبادتوں میں مسیحی غالباً سریانی زبان استعمال کرتے تھے۔ ایسے حالات کے تحت یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ محمدؐ صاحب مسیحی ایمان کے اصل مفہوم کو نہ سمجھ سکے۔

دوسری فصل

محمدؐ صاحب

محمدؐ صاحب کی پیدائش ۵۷۰ء کو مکہ میں ہوئی جو ملک عرب کے بہتیرے دلچسپ واقعات کا مرکز ہے۔

محمدؐ صاحب کے متعلق ہماری معلومات کے ذرائع قرآن اور حدیث ہیں۔ لیکن حدیث کے استعمال میں ہمیں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ عام طور پر لوگوں نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ ان کا ایک بڑا حصہ جعلی ہے۔ یہ خاص کر اُن حدیثوں کے متعلق درست ہے کہ جن میں محمدؐ صاحب کی اوائل زندگی کے حالات پائے جاتے ہیں۔ اور یوں بدقسمتی سے اُن کی زندگی کے صحیح حالات کا بہت کم پتہ ہم کو لگتا ہے۔

(۱) مکّی زندگی

محمدؐ صاحب کے والدین اگرچہ غریب تھے تاہم قریش جیسے باثر قبیلہ کے خاندان بنو ہاشم سے ہونے کے باعث کعبہ کی حفاظت موروثی طور پر اُن کے سپرد تھی۔ یہ بات محمدؐ صاحب کے لئے شروع میں ایک بڑی بات تھی۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے۔ اُن کی پیدائش سے قبل اُن کے باپ عبداللہ کا انتقال ہو گیا اور چھ سال کی عمر میں اُن کی ماں آمنہ فوت ہو گئی اور یوں بچپن ہی میں اُن کو سچّے اور وفادار دوست کی ضرورت پڑی۔ اُن کے

دادا عبدالمطلب نے اُنہیں اپنی حفاظت میں لیا۔ عبدالمطلب کی عمر اُس وقت اسّی سال کی تھی اور خاندان بنو ہاشم کے سردار اور نیک دل تھے اور لوگوں میں اُن کی بڑی عزت تھی۔ دو سال بعد عبدالمطلب کا انتقال ہو گیا۔ لیکن مرنے سے پیشتر محمدؐ صاحب کو اپنے بیٹے ابو طالب کی حفاظت میں سونپ گئے۔ ابو طالب علی کے باپ تھے کہ جس کے نام نے بڑی شہرت پائی ہے۔ کہتے ہیں کہ ابو طالب کو محمدؐ سے اس قدر محبّت تھی کہ انہیں کبھی اپنی آنکھ سے اوجھل ہونے نہیں دیتے تھے۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اگرچہ اُن دنوں لکھنے پڑھنے کا فن لوگوں کو معلوم تھا تاہم محمدؐ صاحب اَن پڑھ ہی رہے۔ غالباً چونکہ سنِ طفولیت ہی میں یتیم ہو گئے تھے اِس لئے ابتدائی تعلیم بھی حاصل نہ کر سکے۔

سارے راوی اس پر متفق ہیں کہ محمدؐ صاحب جب بڑے ہوئے تو لوگوں میں اُن کی بڑی عزت تھی۔ اور لوگوں سے اپنے لئے الامین کا خطاب حاصل کیا اور مکہّ کی انجمن کے ایک ممتاز شریک مانے جانے لگے۔ محمدؐ صاحب کی اوائل زندگی کے ایک واقعہ سے اُن کی فراست کا اظہار ہوتا ہے کعبہ کی دیواروں کو طوفان سے صدمہ پہنچا تھا اور اُن کی مرمت کی جا رہی تھی۔ کہ آپس میں جھگڑا اُٹھا کہ کون حجرِ اسود کو اُٹھا کر اس جگہ رکھے۔ ہر خاندان دعویٰ کرتا تھا کہ اس خدمت کا حق اُس ہی کو حاصل ہے کہ یکایک محمدؐ صاحب کعبہ میں داخل ہوئے اور اس جھگڑے کا انہوں نے یوں فیصلہ کیا کہ اپنی چادر بچھا کر اُس میں حجرِ اسود رکھ دیا اور قبائل کے چار سرداروں کو چادر کا ایک ایک کونہ پکڑا کر پتھر کو اس کی اپنی جگہ پر پہنچا دینے کو کہا۔

چونکہ محمدؐ صاحب کے چچا غریب تھے اس لئے کسبِ معاش کی غرض

سے محمدؐ صاحب کو تجارتی قافلہ کا شریک ہونا پڑا اور یوں اُن کو سفر کرنے کا اتفاق ہُوا۔ خاص کر مُلک شام میں جانے کا۔ اور دوران سفر میں مختلف قسم کے لوگوں سے ملے کہ جن میں یہودی۔ مسیحی اور دیگر مذہبی خیال کے لوگ بھی شامل ہیں۔ ایسا معلوم پڑتا ہے کہ ملک شام کے مسیحی راہب بڑی مہربانی کے ساتھ محمدؐ صاحب سے پیش آئے تھے۔ چنانچہ قرآن کی سورة المائدہ کے گیارھویں رکوع میں ہم پڑھتے ہیں "مسلمانوں کے ساتھ دوستی کے اعتبار سے سب لوگوں میں اُن کو قریب تر پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں (مسلمانوں کی طرف نصاریٰ کا) یہ (میلان) اس سبب سے ہے کہ ان میں علماء اور مشائخ ہیں اور (نیز) یہ کہ یہ لوگ تکبّر نہیں کرتے۔"

خدیجہ مکّہ کی ایک مالدار خاتون خود تجارت کرتی تھی۔ محمدؐ صاحب کی عُمدہ خوبیوں کا ذکر سُن کر اُس نے اپنے تجارتی قافلہ کا اُن کو سردار مقرر کیا۔ محمدؐ صاحب نے اِس کام کو اِس عُمدگی کے ساتھ انجام دیا کہ وہ اُن کی طرف مائل ہو گئی اور اُن سے محبّت کرنے لگی اور آخر کار اُن سے شادی کر لی۔

اگرچہ خدیجہ کی عمر چالیس سال کی تھی اور محمدؐ صاحب صرف ۲۵ برس کے تھے تاہم یہ رشتہ داری بڑی اچھی ثابت ہُوئی۔ خدیجہ سے کل سات بچے پیدا ہُوئے۔ جن میں تین لڑکے تھے جو صغر سنی ہی میں مر گئے اور چار لڑکیاں تھیں لڑکیوں میں فاطمہ محمدؐ صاحب کے بعد بھی زندہ رہیں۔ اور اُن کی شادی علیؓ سے ہُوئی جو محمدؐ صاحب کے چچازاد بھائی تھے اور اُن کے بعد چوتھے خلیفہ ہُوئے۔

محمدؐ صاحب کی سیرت کے متعلق معلوم پڑتا ہے کہ عام طور پر وہ کم سخن تھے لیکن دوستوں کی صحبت میں بڑی خوش طبعی سے پیش آتے تھے اور اپنے رہنے سہنے اور کھانے پینے اور پہننے میں سادگی کا لحاظ رکھتے تھے۔ اُن کے

متعلق مشہور ہے کہ بچوں سے اُن کو اُلفت تھی۔

امام غزالی اپنی کسی تصنیف کی ایک مشہور عبارت میں محمدؐ صاحب کو حلیمی کا نمونہ بتاتے ہوئے اُن کی تعریف میں یہ لکھتے ہیں:

"اے میرے بیٹے خدا ہی کے لئے کھاؤ اور خدا ہی کے لئے پیو اور خدا ہی کے لئے پہنو۔ لیکن ان سب باتوں میں جو کچھ کہ تم کرتے ہو فخر یا ریاکاری کا دخل ہو تو یہ معصیت ہے۔ جو کچھ تم اپنے گھر میں کرتے ہو اس طرح کرو جیسے رسول اللہ کرتے تھے۔ کیونکہ وہ بکریوں کا دودھ دوہتے اور اپنی جوتیوں کی مرمت کرتے اور اپنا چوغہ سیتے اور نوکروں کے ساتھ کھاتے تھے اور بازار میں خود سودا خریدتے اور کبھی اُن کو تکبر نے اپنی گٹھڑی خود گھر لے جانے سے باز نہیں رکھا۔ اور امیر غریب سب کے ساتھ دوستانہ سلوک کرتے اور جو اُن کو ملتا آپ پہلے سلام کرتے تھے۔"

(۲) :۔ دعوٰئے رسالت

محمدؐ صاحب کی شادی خدیجہ کے ساتھ اُن کے حق میں بڑی مفید ثابت ہوئی۔ خدیجہ ایک نیک سیرت عورت تھی اور اُس کی مدبرانہ اصلاح اور سچی حمایت محمدؐ صاحب کے لئے گویا ایک بیش قیمت ملکیت تھی۔ خدیجہ کی دولت نے بھی محمدؐ صاحب کو اس قسم کے تفکرات سے جو غربت میں ہوا کرتی ہے آزاد کر دیا تھا۔ اور اس سے دھیان کرنے کی کافی فرصت اُنہیں مل گئی تھی۔ خدیجہ کے گھر میں محمدؐ صاحب کی ملاقات اُن لوگوں سے ہوئی جو حنیف کہلاتے تھے کہ جن میں خدیجہ کا چچازاد بھائی ورقہ بھی شامل تھا۔ یہ اُن لوگوں کی چھوٹی سی جماعت تھی کہ جو بُت پرستی ترک کر کے ایک سچے خدا کی پرستش

کرتے تھے۔ اُن کے خیالات نے جو خدیجہ بھی مانتی تھی محمدؐ صاحب پر بڑا اثر کیا۔ لفظ حنیف کا ترجمہ راڈول نے "صحیح الاعتقاد" کیا ہے۔ یہ لفظ محمدؐ صاحب کی تعلیم میں ابتداءً ایک غالب عنصر رہا ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے دعویٰ کیا کہ وہ ابراہیم حنیف کے دین کی تبلیغ کے لئے مبعوث ہوئے ہیں۔ ملاحظہ ہو سورۃ الانعام آیت ۱۶۲۔

محمدؐ صاحب یکسوئی کے ساتھ دھیان کرنے کی غرض سے غار حرا میں چلے جاتے تھے جو شہر سے تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اہل حنیف کے اور لوگ بھی وہاں اُن کے ساتھ ہوتے اور اس قسم کی تنہائی میں اکثر اپنے ہم وطنوں کی جہالت۔ ابتری۔ تفرقے اور بدامنی پر غور کرتے اور عالم خیال میں ایک ایسے عمدہ زمانہ اور اصلاح کا خواب دیکھتے کہ جس اصلاح کے پھیلانے میں خود فی نفسہٖ وہ شریک ہوں گے۔

جب محمدؐ صاحب کی عمر چالیس سال کی ہوئی اس غار حرا میں اُن کو ایسا تجربہ ہُوا کہ جسے اُن کے لئے کایا پلٹ کہنا بے جا نہ ہو گا۔ اس تجربہ کے بعد وہ اپنے ہم وطنوں کی بُت پرستی کے کاموں سے بالکل علیحدہ ہو گئے اور خُدا کی حضوری محسوس کرنے لگے اور اس کے بعد اعلان کیا کہ اُنہوں نے خُدا کی "پُکار" سُنی ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ انہوں نے ایک آواز سُنی جو اُن سے یہ کہتی تھی۔ "اے پیغمبر اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھ چلو جس نے مخلوقات کو پیدا کیا۔ (جس نے) آدمی کو گوشت کے لوتھڑے سے بنایا پڑھ چلو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے۔ (سورۃ العلق ۱-۳ آیات)

قرآن کی سب سے پہلی نازل شدہ سورۃ اقراء کی پہلی چھ آیتوں میں یہ عبارت اب پائی جاتی ہے۔ (مقابلہ کرو یسعیاہ ۴۰ : ۶) اس تجربہ

کا ذکر دوسروں سے محمدؐ صاحب نے یُوں کیا ہے۔ "مَیں نے چلتے ہُوئے ایک آواز سُنی اور اپنی آنکھیں اُٹھائیں تو دیکھو آسمان و زمین کے درمیان تخت پر ایک فرشتہ بیٹھا ہُوا مجھے دکھائی دیا جو میرے پاس آیا۔ اُس سے مجھ پر بڑی ہیبت طاری ہو گئی اور مَیں زمین پر گھٹنوں کے بل گر پڑا۔"

گھر پر بڑے اضطراب کی حالت میں محمدؐ صاحب نے خدیجہ سے کہا "یا تو مَیں کاہن بن گیا ہُوں یا دیوانہ ہو گیا ہُوں۔" لیکن خدیجہ جو ایسی کوئی بات ماننے کو تیار نہ تھی بولی۔ "نہیں تم سچے اور نیک ہو۔" اور اُس نے ورقہ سے اس کا تذکرہ کیا۔ کہتے ہیں کہ وہ محمدؐ صاحب کے اِس واقعہ کا ذکر سُن کر بولا کہ یہ ناموس (پیغام) ہے جو موسیٰ اور عیسیٰ کے پاس آیا تھا اور کہا کہ "محمدؐ صاحب اپنی قوم کے پیغمبر ہوں گے اُن سے کہو کہ ہمّت نہ ہاریں۔"

یہ تجربہ اور اسکے بعد کے تجربے محمدؐ صاحب کے ساتھیوں کے لِئے اس بات کا ثبوت تھا کہ اُن کی قوتِ ادراک اعلےٰ درجہ کی تھی اور خود محمدؐ صاحب کا ڈر جب کم ہو گیا تو ان تجربوں کی بنا پر اُن کو پختہ یقین ہو گیا کہ خدا کا مکاشفہ اُن پر ہوتا ہے اور کہ وہ درحقیقت خدا کے رسُول ہیں۔

اُس وقت سے لے کر سوائے ایک اہم وقفہ کے بیس[2] سال کے عرصہ تک محمدؐ صاحب مذہبی۔ جماعتی اور سیاسی معاملات پر ایسے پیغام سناتے رہے کہ جنہیں وہ کہتے تھے کہ خدا نے جبرئیل فرشتہ کی معرفت اُن کے پاس بھیجا ہے۔

خدیجہ کے پاس محمدؐ صاحب کا یہ اقرار کہ مَیں کاہن بن گیا ہوں اس اعتبار سے قابلِ غور ہے کہ اُن کے وہ کلمات جو اپنے دعوےٰ کے ابتدائی ایام میں اُنہوں نے کہے اپنی طرز اور نفسِ مفہوم میں عرب کے کاہنوں کے سے ہیں کہ جو ایک قسم کی مقفّٰی عبارت ہوتی ہے کہ کاہن کی زبان سے وجد کی حالت میں نکلا کرتی تھی

محمدؐ صاحب کے مخالفین نے بھی اُن کو طعن میں اسی نام سے پکارا ہے۔
خود محمدؐ صاحب ابتداءً سخت شک کی حالت میں رہ چکے ہیں خاص کر اس لئے کہ کافی عرصہ تک اُن پہ کوئی وحی نہیں آئی۔ مسلمان اس وقفہ کی میعاد کو فترہ کہتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ یہ حالت تین سال تک رہی۔ اس دوران میں بعض اوقات اس قدر دلگیر ہو جاتے کہ خودکشی کا ارادہ کرتے۔

ایسی حالت میں اُن کی وفادار بیوی خدیجہ بار بار اُن کو اپنے فرض کے پورا کرنے پر آمادہ کرتی اور اس بات کے عملی ثبوت میں کہ اُن کا ایمان اُن پر ہے وہ خود سب سے پہلے اُن کی پیرو بن گئی۔ یوں محمدؐ صاحب ہمّت پا کر پیغام سُنانے کے حکم پر عمل کرنے لگے اور خفیہ طور پہ ہی وحدانیت کا اعلان کرنا شروع کر دیا۔ اُن کے قریبی رشتہ داروں اور دوستوں نے بھی خدیجہ کے نمونے کی پیروی کی۔ محمدؐ صاحب کے سب سے پہلے اور سب سے مشہور ماننے والوں میں علی تھا جو اُن کے چچا ابو طالب کا بیٹا تھا۔ اس نوجوان کو محمدؐ صاحب سے بڑی اُنسیت تھی۔ دوسرا شخص زید ابن حارث ایک غلام تھا جسے خدیجہ نے محمدؐ صاحب کو دیا تھا مگر جسے اُنہوں نے آزاد کر دیا تھا۔ اور پھر تیسرا شخص ابوبکر تھا جو خاندان قریش کا ایک سربرآوردہ شخص تھا۔ محمدؐ صاحب اور اسلام دونوں کو ابوبکر کے مسلمان ہونے سے بہت فائدہ پہنچا۔ کیونکہ وہ عقلمند صاحبِ مال اور بارسوخ تھا۔ محمدؐ صاحب کا اُس پر اعتبار شروع سے جم گیا اور آخر تک قائم رہا یہاں تک کہ آخرکار یہی خلیفہ ہُوا۔

محمدؐ صاحب کی تعلیم برابر پھل لاتی رہی یہاں تک کہ تین سال بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ مکہ کے پچاس اشخاص مرد و عورت کہ جن میں عثمان بھی شامل ہے کہ جو تیسرا خلیفہ ہُوا اس نئے دین میں داخل ہو گئے۔ اب تک محمدؐ صاحب خفیہ طور پر اپنا کام کرتے رہے۔ لیکن اپنی تبلیغ کی اس کامیابی پہ باوجود قریش کے

بااثر لوگوں کی مخالفت کے اب کھُلم کھُلا اپنے پیغام کی منادی کرنے لگے۔ اُس ایمان پر کہ اُن کو حکم ہُوا ہے کہ "اُٹھ اور ڈرا۔" وہ لوگوں کو بُت پرستی ترک کر دینے کی تعلیم دینے لگے اور اُن لوگوں کے انجام سے اُنہیں آگاہ کیا کہ جنہوں نے پہلے پیغمبروں کی نہ سُنی۔ لیکن اہلِ مکّہ محمدؐ صاحب کا تمسخر ہی اُڑاتے رہے۔

تب محمدؐ صاحب نے ایک نیا طریق اختیار کیا وہ اُن کو جہنم کی آگ سے ڈرانے لگے اور اُن کے دیوتاؤں کی مذمت اور توہین کرنے لگے۔ اس سے اہلِ مکّہ کا غصّہ اَور بھی بھڑک اُٹھا۔ خصوصاً اس لِئے کہ یہ نیا فرقہ اُن کے خیال میں اُن کے قدیم خیالاتِ باطلہ کا ہی دشمن نہ تھا بلکہ اُن کے مالی منفعت کے ذرائع کو گزند پہنچانے کا بھی باعث تھا۔ اِس لِئے محمدؐ صاحب کی مخالفت کے لِئے انہوں نے اپنے آپ کو منظم کیا اور اُن کے پیروؤں کو ستانے لگے۔

ابولہب محمدؐ صاحب کا چچا اور مخالف تھا۔ اُس کی بیوی مسلمانوں کے ساتھ سخت معاندانہ برتاؤ کرنے لگی۔ جسکے سبب سے محمدؐ صاحب کے قہر کو اپنے اُوپر بھڑکایا۔ لکھا ہے کہ مسلمانوں کے نماز کے راستہ میں وہ کانٹے بچھا دیتی تھی۔ ابولہب اور اُس کی بیوی دونو قرآن کی ایک سو گیارھویں سورۃ "تبّت یدا" میں ہمیشہ کے لِئے ملعون کئے گئے۔

اِس ظلم، بے عزتی اور توہین کے باوجود محمدؐ صاحب اپنی راہ پر قائم رہے اور اپنے چچا ابو طالب کی پُوری حمایت کے سبب اُن کو بڑی تسلّی رہی۔ ابو طالب اگرچہ مسلمان نہیں تھے تاہم محمدؐ صاحب کو اُن کے دشمنوں سے بچاتے رہے اب مکّہ کے بہت سے لوگ مسلمانوں کے شریک ہو گئے۔ اِس پر قریش گھبرا اُٹھے اور اُن پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ اگر یہ تحریک نہ روکی گئی تو آگے بڑھ کر یہ ایک عظیم انقلاب کی صورت اختیار کر لے گی اور یُوں اُن کی اِتی

جماعت کی شہرت خطرے میں تھی۔

اہل قریش کی جماعت نے جو معاندانہ تدبیر اختیار کی اُس سے اس جماعت کی قوّت کا اظہار ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی ایذا رسانی کے لِئے اپنے تمام لوگوں کی قوتوں کو ایک باقاعدہ تنظیم میں منسلک کر دیا۔ محمدؐ صاحب اور اُن کے قریبی اصحاب کے سوا اہل مکّہ باقی تمام مسلمانوں پر اپنے غصّہ میں ٹوٹ پڑے۔ ہر خاندان اپنے تمام ایسے شرکا ریا ماتحت یا غلاموں کو ستاتا کہ جن کے مسلمان ہونے کا شبہ ہوتا۔ ایسے لوگ قید کر دیئے جاتے۔ بھُوکے رکھے جانے اور لاٹھیوں سے پیٹے جاتے تھے۔ کچھ لوگ اسلام سے منحرف ہو گئے۔ بعضوں نے ارتداد کا بہانہ کیا۔ محمدؐ صاحب نے انہیں معاف کر دیا۔ (دیکھو سورۃ النحل آیت ۱۰۸)

لیکن زیادہ تر مسلمان ثابت قدم رہے۔ مکّہ کے ممتاز لوگوں نے محمدؐ صاحب کو مرتبہ و دولت دے کر پھُسلانا چاہا۔ خیال ہے کہ جو کچھ محمدؐ صاحب نے اس قسم کی درخواست کے جواب میں بڑے وقار کے ساتھ کہا تھا وہ سورہ حٰم سجدہ میں موجود ہے۔

مسلمانوں کے مصائب سے محمدؐ صاحب کا دل بھر آیا اور اُن کی حفاظت سے قاصر ہونے کے سبب اُن کو عام اجازت دی کہ جو چاہیں ملک ابی سینیا کو ہجرت کر جائیں۔ یہاں یہ مہاجرین مسیحی بادشاہ کی دوستانہ پناہ میں رہے ان مہاجرین کی تعداد پہلے پندرہ تھی پھر اَور اُن کے شریک ہوئے غرض کہ یوں قریب اسّی مرد اور بیس عورتوں پر مشتمل مہاجرین جلاوطنی میں رہنے پر مجبور ہوئے۔

قرآن کی ابتدائی سورتوں کے مطالعہ سے معلوم پڑتا ہے کہ سخت حالات کے ماتحت محمدؐ صاحب نے اپنا لہجہ بدلا۔ اُن کے پیروؤں کے ساتھ جو بُرا سلوک کیا گیا۔ اس سے اُن کے دل کو بڑا صدمہ پہنچا اب اَور زیادہ وضاحت

کے ساتھ مکہ کے بُت پرستوں پر ہونے والے جہنم کے عذاب کا ذکر بیان کرنے لگے۔ اِن بُت پرستوں میں بعض کا ذکر اُن کے نام کے ساتھ آیا ہے مثلاً ابولہب اور اپنی تعلیم میں خدا کی توحید کے ساتھ اپنے رسول اللہ ہونے کا دعوےٰ بھی شامل کر دیا۔ (دیکھو سورۃ الجن آیت ۲۴)

لیکن جب یہودیوں اور مسیحیوں کی کتابوں کی کہانیاں سُنانے لگے تو اہلِ مکہ نے کہا کہ "ہو نہ ہو اس شخص کو آدمی سکھایا کرتا ہے (سورۃ النحل آیت ۱۰۵ مقابلہ کرو سورہ فاطر ۶ آیت)۔

اس موقع پر محمدؐ صاحب ظلم کا مقابلہ کرتے ہوئے جس ہمت صبر اور استقلال کے ساتھ اپنے مقصد کی تکمیل میں مصروف رہے اِس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اُن کو الٰہی تقرر اور اپنے مقصد کی سچائی پر ایمان تھا۔

قریش پھر محمدؐ صاحب کے چچا ابو طالب کے پاس آئے اور پہلے تو درخواست کی کہ وہ اپنے بھتیجے کو اُن کے معبودوں کی توہین کرنے سے روکے اور پھر دھمکی دی کہ ورنہ وہ محمدؐ کو قتل کر ڈالیں گے۔

اس معاملہ پر ابو طالب اور محمدؐ صاحب کے درمیان وہ گفتگو ہوئی جو اُن کی زندگی کا مشہور واقعہ ہے اور جس کے خاتمہ پر محمدؐ صاحب کا استقلال دیکھ کر اُن کے آنسو دیکھ کر ابو طالب نے پُرزور لہجہ میں کہا "جو کچھ تو چاہے ہے کہہ۔ خدا کی قسم میں ہرگز تیرا ساتھ نہ چھوڑوں گا"۔ (ابن ہشام)

اِنہیں ایام میں جب کشمکش غیر مختتم اور انجام مایوس کُن نظر آتا تھا ایک ایسا واقعہ محمدؐ صاحب سے سرزد ہوا کہ جس کے سبب سمجھدار مسلمان اکثر پس و پیش میں پڑ جاتے ہیں۔ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ محمدؐ صاحب اِن بُت پرستوں کے ساتھ مصالحت پر اُتر آتے ہیں کہ جن کو اب تک وہ برابر ملزم ٹھہراتے رہے ہے بہرحال یہ

مصالحت نہایت ہی قلیل عرصہ کے لئے رہی۔

یہ واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ محمدؐ صاحب کعبہ میں سورۃ النجم کا ایک حصہ پڑھ رہے تھے کہ جب وہ ان الفاظ پر پہنچے کہ "کیا تم نہیں دیکھتے ہولات عُزّیٰ اور مُنات اِن میں تیسرا؟ تو کہتے ہیں کہ کسی نے بلند آواز کے ساتھ یہ اضافہ کر دیا کہ "یہ ممتاز کنواریاں ہیں خُدا کے پاس اُن کی شفاعت کی اُمید کی جاسکتی ہے۔"

اہلِ قریش کو بڑا تعجب ہُوا اور خوش ہو گئے اور جب محمدؐ صاحب نے بائیسویں آیت پڑھی کہ "خدا کے سامنے سجدہ کرو۔" تو سب کے سب محمدؐ صاحب کے ساتھ سجدہ میں گر پڑے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس جُملہ معترضہ کا ادا کرنے والا کون تھا۔ مرحوم سیّد امیر علی کسی قدیم مصنّف کے بیان کی تائید کرتے ہُوئے کہتے ہیں کہ یہ کوئی بُت پرست تھا جو اُس وقت حاضر تھا جسے اور روایتوں نے شیطان مشہور کر دیا ہے۔ بعض کتابوں میں اس واقعہ کا سرے سے انکار ہے مگر مرحوم امیر علی کا خیال ہے کہ مسلسل دباؤ کے زیرِ اثر محمدؐ صاحب نے مصالحت سچ مچ کر لی تھی لیکن وہ اِس پہ زور دیتے ہیں کہ یہ واقعہ صرف ایک ہی مرتبہ پیش آیا اور کہ اس مصالحت سے آپ کے عظیم الشان "انحراف" نے اس سہو کی ضرورت سے زیادہ تلافی کر دی دیکھو اسپرٹ آف اسلام صفحہ ۲۵۔ سورۃ الحج کی ۵۱ آیت جہاں لکھا ہے "پھر خُدا نے وسوسہ شیطانی کو دُور اور اپنی آیتوں کو مضبوط کر دیا"، بعض کے خیال میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جس میں محمدؐ صاحب کی بریت کا اعلان ہے۔

اب محمدؐ صاحب کے دعویٰ نبوت کا یہ چھٹا سال ہے۔ یہ سال اس

لئے قابلِ ذکر ہے کہ اہلِ قریش کے دو ناموراشخاص کا مسلمانوں میں اس سال اضافہ ہُوا۔ اُن میں سے ایک آتش مزاج جنگ جُو حمزہ ہے کہ جس نے ابوجہل کو اِس لئے مارا تھا کہ اُس نے محمدؐ صاحب کو گالی دی تھی اور اُس گھڑی کی برانگیختگی میں بے ساختہ بول پڑا تھا کہ "میں اُس کے دین کا پیرو ہُوں"۔ دوسرا شخص عمر بن الخطاب ہے جو محمدؐ صاحب کے بعد دُوسرا خلیفہ ہُوا۔ یہ خود اسلام کا سخت مخالف تھا اور اپنی بہن کے اسلام قبول کرنے پر سخت برافروختہ ہُوا تھا۔ ایک مرتبہ جب اُس کی بہن اپنے شوہر کے ساتھ قرآن کی ایک سورۃ پڑھ رہی تھی کہ اچانک عمر آنکلا اور غصہ میں اپنی بہن کو اسقدر زدوکوب کیا کہ اُس کا چہرہ خُون سے سُرخ ہو گیا اور پھر اپنی سنگدلی پر نادم ہو کر اپنی بہن سے جو کچھ وہ پڑھ رہی تھی دیکھنے کی درخواست کی۔ اُس کی بہن نے جواب میں کہا لَا یَمَسُّہٗ اِلَّا الْمُطَہَّرُوْنَ سوائے اُن کے جو پاک ہیں اور کوئی نہیں چھُوتے۔ غرض کہ عمر نے بعد اس شرط کے پُورا کرنے کے قرآن اس سورۃ کو پڑھا کہ جس سے اُس کے دل پر ایسا اثر ہُوا کہ وہ مُسلمان ہو گیا۔ عمر کے اسلام لانے پر محمدؐ صاحب اور اُن کے اصحاب نہایت خوش ہوئے کیونکہ اِس واقعہ نے مسلمانوں کی بیش بینی میں تبدیلی پیدا کر دی اور مُسلمانوں کی جماعت اس حیثیت سے کعبہ کو گئی کہ علیؓ جماعت کے آگے آگے ننگی تلوار کھینچے جا رہا تھا۔ مکہ کے بُت پرست یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے اور بول پڑے۔ "ہم نے عمر کو محمدؐ کے قتل کرنے کو بھیجا تھا لیکن وہ خود اُس کا پیرو ہو گیا!"

محمدؐ صاحب کی دلیرانہ تبلیغ کے مقابلہ پر جواب ترقی پر تھی مکہ کے لوگوں نے بھی اُن کے خلاف اپنی حکمتِ عملی کو بدلا۔ اُنہوں نے مسلمانوں

کا مقاطعہ کرنے کی ٹھان لی کہ وہ تنگ آکر مکہّ چھوڑ دیں۔ اب تک جن لوگوں نے محمدؐ صاحب کا ساتھ دیا تھا وہ قریباً سب کے سب محمدؐ صاحب کے اپنے خاندان بنو ہاشم کے لوگ تھے۔ اس لئے یہ کشمکش بنو ہاشم اور قریش کے باقی لوگوں میں تھی۔ پس قریشیوں کی بڑی جماعت نے اتحاد کر کے یہ معاہدہ کر لیا کہ وہ بنو ہاشم سے کوئی سروکار نہ رکھیں گے اور یوں بنو ہاشم کو مجبور ہو کر مکہّ کے ایک علیحدہ مقام میں بند ہو جانا پڑا اور دو یا تین سال کے عرصہ تک اس مقاطعہ کا خاتمہ نہیں ہوا یہ وہیں رہے۔ بعض قریشیوں کے بیچ بچاؤ کے ذریعہ آخر کار یہ مزاحمت بنو ہاشم پر سے دُور کی گئی اور محمدؐ صاحب کو پھر آزادی کا ایک دَور میسّر ہوا۔ محمدؐ صاحب کی عمر اب اکیاون سال کی تھی اور اُن کی تبلیغ کا یہ دسواں برس تھا۔ اس سال کے خاتمہ سے پیشتر اُن کو اپنی بیوی خدیجہ کے انتقال کا سخت صدمہ اُٹھانا پڑا۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ خدیجہ کی زندگی محمدؐ صاحب کے لئے بڑی مفید تھی اب خدیجہ کا انتقال اُن کیلئے اُتنا ہی بڑا نقصان بھی تھا۔

محمدؐ صاحب اس واقعہ کے کچھ ہی عرصہ بعد دوبارہ شادی کرنے پر مائل ہوئے اور انہوں نے دو شادیاں کیں۔ ایک تو عائشہ کے ساتھ جو اُن کے صدیق اکبر ابو بکر کی بیٹی تھی مگر عمر میں چھوٹی تھی اور دوسری سودہ کے ساتھ جو ایک مسلمان کی بیوی تھی کہ جو ابی سینیا میں انتقال کر گیا تھا۔ بعد میں انہوں نے اَور بھی بیویاں کیں کہ جن کا شمار ایک وقت میں نو ۹ تک پہنچ گیا تھا۔ یہ بیویاں باندیوں کے علاوہ تھیں۔ سورۃ الاحزاب کا بڑا حصہ محمدؐ صاحب کے اپنے گھر کے معاملات سے متعلق ہے۔

اسی سال اُن کے چچا ابو طالب کا بھی انتقال ہو گیا کہ جن کا مکہّ میں بڑا رسُوخ تھا اور اب محمدؐ صاحب کی زندگی پھر خطرہ میں تھی اور اسلئے انہوں نے

ہجرت کر کے طائف چلے جانے کی ٹھان لی کہ جو مکّہ سے ستّر میل کے فاصلہ پر ہے۔ لیکن وہاں کے بُت پرست باشندوں نے نہ اُن کو وہاں ٹھہرنے دیا اور نہ مُنادی کرنے دی۔ بلکہ پتھراؤ کر کے وہاں سے نکال دیا طائف سے نکالے جانے پر محمدؐ صاحب نے مکّہ کے ایک ممتاز شخص سے اُن کو اپنی پناہ میں لینے کا وعدہ لیا اور یوں وہ مکّہ کو واپس لوٹے۔

اگرچہ محمدؐ صاحب کو مکہ میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تاہم اُن کا ایمان اپنے تبلیغ کے کام سے نہیں ڈگمگایا بلکہ اُس نازک وقت میں امید کا ایک نیا منظر انہیں دکھائی دینے لگا۔

مکّہ میں حج کے موقعہ پر آنے والوں میں قبیلہ خزاج کے لوگ بھی تھے جو یثرب سے آئے تھے کہ جس کا نام بعد میں مدینہ پڑا۔ انہوں نے محمدؐ صاحب کے پیغام کو بڑی دلچسپی سے سُنا۔ اُن کے اپنے شہر میں یہودیوں اور عربوں کے درمیان برابر جھگڑا رہتا تھا اور اُنہیں خیال آیا کہ شاید محمدؐ اُن کو آپس کے باہمی تنازعے سے چھٹکارا دینے کے لئے ایک زبردست وسیلہ ثابت ہوں۔ غرض کہ حج کے دوسرے سال ان لوگوں نے محمدؐ صاحب کا ساتھ دینے کا اور اُن کی اطاعت کرنے کا عہد و پیمان خفیہ طور پر کیا اور محمدؐ صاحب نے اپنے ایک سرگرم شاگرد مصعب کو اُن کا اُستاد مقرر کر کے اُن کے ساتھ بھیجدیا۔ مصعب کو اپنے کام میں ایسی کامیابی ہوئی کہ ایک سال کے عرصہ میں پچھتر۷۵ اشخاص کہ جن میں دو عورتیں بھی شامل تھیں خفیہ طور پر محمدؐ صاحب کی جماعت کے شریک ہوئے۔ انہوں نے محمدؐ صاحب کی راہ میں جان تک قربان کر دینے کا عہد کیا۔

لیکن مکہ کے ایک جاسوس نے اِس عہد و پیمان کی خبر فوراً قریش

کے لوگوں میں پھیلا دی اور محمدؐ صاحب کی زندگی خطرہ میں پڑ گئی۔ قریش نے مل کر اُن کے خلاف سازش کی اور محمدؐ صاحب کے جانی دشمن ابوجہل نے یہ تجویز پیش کی کہ قریش کے مختلف سردار ایک ساتھ محمدؐ صاحب پر قاتلانہ حملہ کریں تاکہ بنو ہاشم محمدؐ صاحب کے خون کا بدلہ لینے کی تاب نہ لا سکیں۔ محمدؐ صاحب ابوبکر کے ساتھ ایک غار میں چھُپے رہے اور مکّہ کے لوگوں نے اُن کی تلاش میں سارا شہر چھان مارا۔ روایت ہے کہ محمدؐ صاحب کے تعاقب کرنے والے اُن کو تلاش کرتے کرتے ایک مرتبہ بالکل غار کے قریب پہنچ گئے جہاں وہ چھُپے تھے۔ ابوبکر نے گھبرا کر کہا "ہم صرف دو ہی ہیں۔"
محمدؐ صاحب نے فوراً کہا۔ "نہیں ہم تین ہیں کیونکہ خدا ہمارے ساتھ ہے۔ غرض کہ اور صعوبتیں جھیلنے کے بعد محمدؐ صاحب صحیح وسالم مدینہ پہنچ گئے۔ مدینہ پہنچتے ہی محمدؐ صاحب نے وہاں کی پہلی مسجد کا انتخاب نہایت موثر طریقہ پر اس طرح کیا کہ جب بہتوں نے اُن کو اپنے یہاں اُترنے کی دعوت دی اور مہمانی قبول کرنے کی درخواست کی تو بڑی ہوشیاری سے محمدؐ صاحب نے جواب دیا کہ اِس کا فیصلہ اونٹنی پر ہے اِسے جانے دو۔ اور جس جگہ محمدؐ صاحب کی اونٹنی بیٹھی وہاں بعد میں مسجد بنائی گئی۔ علی ایسے خوش قسمت نہ تھے کہ اِس آسانی کے ساتھ محمدؐ صاحب کی طرح بچ نکلتے۔ مکّہ سے روانگی کی پہلی رات محمدؐ صاحب کی تجویز کے مطابق علی اُن کا سبز کمبل اوڑھ کر سو رہے تھے کہ جسے ہر ایک پہچانتا تھا۔ یہ بڑی ہمّت کا کام تھا مگر وہ کھڑکی کی راہ جان بچا کر نکل گئے اور اگرچہ راستے میں مکّہ کے لوگوں نے اُن کو مارا پیٹا لیکن صرف رات ہی کو سفر کرتے ہوئے مدینہ میں اوروں کے ساتھ مل گئے۔
مکّہ چھوڑ کر مدینہ جانے کا یہ واقعہ کہ جسے ہجرت کہتے ہیں اسلامی

سال کا آغاز ہے۔ بعضوں کی رائے میں یہ دن ۱۶ جولائی ۶۲۲ء کے مطابق ہے۔

(۲) مدنی زندگی

ہجرت کے اس واقعہ سے محمدؐ صاحب کے تبلیغی کام میں ایک بڑا تغیر واقع ہوا۔ یہاں یہ دلچسپ سوال بار بار اٹھتا ہے کہ کیا محمدؐ صاحب کے نقطۂ نگاہ کی تبدیلی کے ساتھ اُن کے تصوّرات بھی بدل گئے۔ کیا آخرکار فتحمندیوں کی شاہراہ کہ جس کے وہ آرزومند تھے اُن کو اپنے سامنے کھلی ہوئی دکھائی دی؟ ہاں یہ ممکن ہے کیونکہ جو عہد محمدؐ صاحب نے حال میں اہلِ مدینہ سے لیا تھا اُس میں سیاسی عنصر کا داخل ہونا ہم دیکھ چکے ہیں۔ بہرحال بعضوں کا یہ قیاس ہے کہ مکہ میں محمدؐ صاحب محض سیدھے سادے ایک نبی یا مذہبی مصلح تھے لیکن مدینہ میں ایک ملکی حکمران کا منصب اختیار کر لیا یا دوسرے لفظوں میں نبی بادشاہ بن گئے۔ زیادہ قرینِ قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ حب الوطنی کا احساس پہلے سے اُن کے دماغ میں موجود تھا اور اس سے پہلے آپ جو مکہ میں ایک جوشیلے مناد اور سرگرم مصلح تھے مدینہ کے زیادہ موافق حالات کے تحت ایک فوجی سردار یا حکمران ظاہر ہوئے۔

یہ حقیقت ہے کہ مدینہ کے حالات نے محمدؐ صاحب کو بہت کچھ کامیابی کی اُمید دلائی۔ اس شہر کے یہودیوں کی مضبوط جماعت سے محمدؐ صاحب کو اطمینان ہو گیا تھا کہ یہاں کے لوگ مذہبی معاملات میں اہلِ مکہ سے زیادہ دلچسپی لیں گے۔ علاوہ اس کے وہاں کی خانہ جنگی ایک قومی حکمران کی ضرورت صفائی سے ظاہر کر رہی تھی اور پھر مدینہ اور مکہ کے مابین جو لاگ ڈانٹ پہلے سے چل رہی تھی اُس سے فائدہ اُٹھانا بھی اُن کے ہاتھ میں تھا۔

فی الحقیقت اسلام کی ابتدائی کامیابی کے اسباب معلوم کرنے کے لئے اُن واقعات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کیونکہ یہی وہ شہر ہے کہ جہاں پہلے اسلام کی نشوونما شروع ہوئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مدینہ اس نئے اعتقاد کی حقیقی جائے پیدائش ہے۔

مدینہ کی مختلف جماعتیں

محمدؐ صاحب نے مدینہ کی حالت پر جلد عبور حاصل کر لیا۔ اور وہاں کے مختلف گروہوں میں سے جو جس گروہ کا ہوتا اپنی گفتگو اور خیال میں اُسی کے مطابق اُس کو سمجھنے کے عادی ہو گئے۔

(۱) سب سے پہلے اہمیت کے اعتبار سے محمدؐ صاحب کے خیال میں مہاجرین تھے یعنی وہ مسلمان جو مکہ سے یا تو محمدؐ صاحب سے قبل یا اُن کے ساتھ یا اُن کے آنے کے کچھ ہی عرصہ بعد مدینہ آئے تھے۔

(۲) انصار یا مددگار۔ یہ مدینہ کے وہ لوگ تھے کہ جنھوں نے ہجرت سے قبل یا بعد اسلام اختیار کر لیا تھا۔ محمدؐ صاحب کے خیال میں ان کا مرتبہ اس قدر بلند نہیں تھا جتنا کہ مہاجرین کا کیونکہ اسلام کی خاطر اُنھوں نے اُن کے برابر سختیاں نہیں جھیلی تھیں۔ تاہم اِنہیں دو جماعتوں پر اسلام کی خاص قوت کا انحصار تھا اور محمدؐ صاحب نے اُن دونوں فریقین کو برادرانہ عہد و پیمان کے ذریعہ متحد کر دیا تھا۔ جس کے باعث انصار کی فیاضی نے مہاجرین کی مفلسی اور تنہائی کو دُور کر دیا تھا۔

(۳) منافقین یا ریاکار۔ یہ مدینہ کے باشندوں کی ایک بارسوخ جماعت تھی کہ جنھوں نے اسلام ظاہرا قبول کر لیا تھا مگر جو اپنی جگہ مکہ کے

اجنبیوں کو دینا نہیں چاہتے تھے اور اِس وجہ سے محمدؐ صاحب اُن کو منافق کہتے تھے۔

(۴) اِن سب کے علاوہ مدینہ کے یہودی تھے کہ جن کی جیساکہ بیان ہوچکا ہے ایک بڑی اور بارسوخ جماعت تھی۔ محمدؐ صاحب اُن کی طاقت اور اہمیت سمجھتے تھے اور اِس لئے اُن کو اپنی طرف کرلینے کی کوشش کی۔ اُن کے ساتھ شرائط معاہدہ میں جس طریقہ سے اُن کو پہلی دو جماعتوں کے ساتھ باندھ دیا تھا اُس سے تنظیمی معاملات میں محمدؐ صاحب کی دُوراندیشی اور خداداد ذکاوت کا پتہ چلتا ہے۔ اُس معاہدہ میں (۱) انسداد لغاوت کے لئے شرائط تھیں۔ (۲) قریش قانونی پناہ سے خارج قرار دیئے گئے تھے اور (۳) یہودیوں کو مذہبی آزادی تھی مگر جب کبھی ضرورت ہو مسلمانوں کی امداد کا اِس میں اُن سے مطالبہ تھا۔ مرحوم سید امیر علی اُس عہد وپیمان کی شرائط پر رائے زنی کرتے ہوئے کہتے ہیں۔" اُس معاہدے نے محمدؐ صاحب کو قوم کا صدر مجسٹریٹ بنادیا تھا۔" (اسپرٹ اوف اسلام مطبوعہ سنہ ۱۹۲۳ء صفحہ ۵۹)

پھر کسی اَور موقعہ پر کارلائل کے مضمون ہیرو اینڈ ہیرو ورشپ " کا یہ اقتباس کرتے ہیں۔ کسی شہنشاہ کی جو طرّہ دار تاج پہنے ہو اُس قدر اطاعت نہیں کی گئی ہے کہ جس قدر اُس آدمی کی جو اپنے ہاتھ سے پیوند لگائے ہوئے چوغہ پہنتا تھا۔" (اسپرٹ اوف اسلام صفحہ ۵۲)

یہودی

مدینہ میں قیام انتظام کے آغاز کرنے کا کام بے شک محمدؐ صاحب ہی کی طرف منسوب ہونا چاہئے لیکن اُن کو جلد معلوم ہوگیا کہ یہودی

ضدی تھے اور درحقیقت کانٹے کی طرح یہ اُن کو کھٹکتے رہے۔ امیر علی کی رائے میں اُن یہودیوں کو اہلِ قریش کے ساتھ جو قانونی پناہ سے خارج قرار دیئے گئے تھے تجارتی سروکار تھا اور محمد صاحب کی اطاعت اوپرے دل سے منظور کر لی تھی اور ایک ہی ماہ کے اندر یہ بغاوت کر بیٹھے تو پھر محمدؐ صاحب نے معاہدہ کے ذریعہ اُن کو اپنے ساتھ کیوں کر لیا تھا اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ یا محمدؐ صاحب کو اُن کی مدد حاصل کرنے کا لالچ تھا یا اُن پر اُن کو شبہ تھا۔ یا اس معاہدہ میں دو نو وجوہ موجود تھیں امیر علی یہ حیرت انگیز خیال پیش کرتے ہیں کہ محمدؐ صاحب نہیں بلکہ یہودی آپ سے اتحاد کرنے کے آرزومند تھے اور اُن کا یہ خیال تھا کہ محمدؐ صاحب کے ذریعہ وہ عرب کو یہودی کر ڈالیں گے (اسپرٹ اوف اسلام صفحہ ۵۹)

یہودیوں کو خوش کرنے کے لئے محمدؐ صاحب نے بہت کچھ کیا اسلام کو اُنھوں نے ابراہیم کی طرف منسوب کیا اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس بزرگ اور اُس کے بیٹے اسماعیل کا نام کعبہ کے ساتھ ملا دیا۔ اگرچہ بہت ہی تھوڑوں نے اسلام قبول کیا۔ مگر یہودی بحیثیت جماعت بڑے فخر کے ساتھ الگ ہی رہے۔ رفتہ رفتہ محمدؐ صاحب اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ یہود اُن کے سخت مخالف ہیں اور یہ صاف ظاہر تھا کہ اُنہیں محمدؐ صاحب کی نسبت اس خیال سے سخت نفرت تھی کہ وہ اُمّی یعنی اَن پڑھ ہو کر انبیاء کے سلسلہ میں ہوں اور یوں محمدؐ صاحب محسوس کرنے لگے کہ مکّہ میں جو بحث درپیش تھی اُس سے بچ کر بھاگنا مدینہ میں صرف دوسری بحث کی مصیبت میں پھنسنا تھا۔ بہرحال مکہ میں بحث رذیل بُت پرستوں سے تھی لیکن یہاں نہایت سمجھدار لوگوں سے مقابلہ تھا کہ جو ساتھ ہی

مقدس کتاب والے صاحب کتاب بھی تھے۔ غرض کہ یوں ایک سخت جھگڑا اُٹھ کھڑا ہُوا۔ یہودی محمدؐ صاحب کے دعوے کی تردید کرنے اور اُس کا مضحکہ اُڑاتے تھے اور محمدؐ صاحب اُن کو ذلیل کرنے کے درپے تھے۔ مثلاً محمدؐ صاحب نے یہودیوں پہ الزام لگایا کہ وہ اپنی پاک کتاب کی باتوں کو چھپاتے اور دھوکا دیتے ہیں اور پھر ہولناک دھمکیاں دے کر انہیں ڈرایا۔ (سورۃ النساء آیت ۵۰)

اب یہودیوں کے ساتھ اُن کی پُوری نااتفاقی تھی۔ اور محمدؐ صاحب نے مسلمانوں کی مذہبی رُسوم میں ایسی تبدیلیاں کیں کہ جس سے اُن کی کشیدگی اور بھی نمایاں ہوگئی۔ مثلاً پہلے یروشلم قبلہ تھا (یعنی جس رُخ ہو کر نماز پڑھی جاتی ہے) لیکن اب اُس کے بجائے مکہ ہو گیا (سورۃ البقر آیات ۱۳۶-۱۳۹)

مسلمانوں کی مالی مصیبت

اس عرصہ میں محمدؐ صاحب اور اُن کے ساتھیوں کی مالی حالت لوگوں میں گلہ اور ناراضگی کا باعث ہو رہی تھی۔ مہاجرین انصار سے شمار میں بڑھے ہوئے تھے اور اسی سبب سے مہاجرین کے پاس کھانے اور کپڑے کی قلت تھی۔ اب یہودیوں سے بے پروائی اور بخیلی کا سلوک ظاہر ہُوا اس لئے مسلمانوں کا غصہ اُن پہ بھڑکا۔ حالت مایوس کُن ہوتی جا رہی تھی اور کچھ نہ کچھ کرنا ضرور تھا۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ایسی حالت میں عرب کے ایک قبیلہ کا دوسرے قبیلہ کا قافلہ لوٹ لینا ایک عام بات سمجھی جاتی تھی۔ درحقیقت یہی روش محمدؐ صاحب نے اہل مکہ کے خلاف اختیار کی۔ اور ایسا کرنے سے انہوں نے عملاً جنگ چھیڑ دی تھی۔

آجکل کے حامیان اسلام محمدؐ صاحب کو اس الزام سے بری کرنے کی کوشش میں دو وجوہات اُن کی اس روش کی بے ضابطگی کو کم کرنے کے لئے پیش کرتے ہیں۔ ایک طرف تو بہت کچھ الزام اُن غداروں پر لگایا جاتا ہے جو مسلمانوں ہی کے درمیان موجود تھے۔ خاص کر یہودیوں پر کہ جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اہل مکہّ کے ساتھ اُن کی سازش تھی۔ دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ محمدؐ صاحب کی جنگی تیاری سے پیشتر قریش کی فوج میدان میں موجود تھی محمدؐ صاحب" اسلام کے مبلغ ہی نہیں تھے بلکہ آپ اپنے لوگوں کی آزادی اور اُن کی جانوں کے محافظ بھی تھے بحیثیت رسول ہونے کے آپ اپنے دشمنوں کی مذمت اور طعن سے درگزر کر سکتے تھے لیکن ملک کے سردار اور ایسی جنگ کے ایام میں سپہ سالار ہونے کی حیثیت سے جو قریباً مسلسل تھی آپ فوجی حکمتِ عملی سے اجتناب نہیں کرسکتے تھے" (اسپرٹ آف اسلام صفحہ

بہرحال اصل واقعہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ قریش اپنا تجارتی قافلہ لے کر ملک شام سے مکہ کو لوٹ رہے تھے اور صرف اسی معنے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ میدان میں پہلے سے موجود تھے۔ لیکن اُنہیں کیا غرض پڑی تھی کہ خواہ مخواہ بغیر اشتعال مسلمانوں پر حملہ کرکے اپنے تئیں خطرہ میں ڈالیں۔ ابن ہشام کا بیان ہے کہ پہلی بڑی لڑائی یعنی جنگ بدر سے پیشتر محمدؐ صاحب نے ایک دستہ مکہ کے قافلہ پر قبضہ کرنے کو بھیجا تھا لیکن اہل مکہ نے ایک فوج اپنے قافلہ کی حفاظت کے لئے بھیج دی۔ دیکھو ابن ہشام غزوئ بدر الکبریٰ

دوسرا حملہ کرنے کا حکم اہلِ عرب کے پاک مہینہ کے ایام میں محمدؐ صاحب نے دیا کہ جس سے مسلمانوں کو تعجب ہُوا اور اہل مکہّ واقعی گھبرا گئے یہ ایسا مہینہ تھا کہ اہل عرب کے قدیم دستور کے مطابق مختلف قبیلوں میں لڑائی

بند ہو جاتی تھی۔ غرض کہ محمدؐ صاحب کا یہ حملہ چونکہ خلافِ توقع تھا اِس لیے اس میں بڑی کامیابی ہوئی اور بڑا مالِ غنیمت ہاتھ لگا۔ لیکن اپنے ساتھیوں کے اعتراضات رفع کرنے کے لِئے اُن کو ایک خاص اعلان کی ضرورت پڑی۔ (ملاحظہ ہو سورۃ البقر آیت ۲۱۴)

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد ایک قافلہ ملک شام سے مکّہ کو ابوسفیان کی ماتحتی میں لوٹ رہا تھا جو محمدؐ صاحب کے جانی دشمنوں میں سے تھا۔ محمدؐ صاحب نے اُس کو روکنے کی ٹھان لی۔ لیکن ابوسفیان نے اہلِ مکہ کو خطرے سے آگاہ کر دیا۔ اس کے بعد ابوسفیان مسلمانوں سے دُور رہ کر اپنا قافلہ بچا لے گیا مگر مکّہ سے لوگوں کی جو بے قاعدہ بھیڑ بدر کے موقعہ پر مسلمانوں سے لڑنے کو نکل پڑی تھی اُسے وہ نہ روک سکا (۶۲۴ء) اگرچہ اہلِ مکّہ کا شمار کہیں بڑھا ہُوا تھا۔ مگر اُنہوں نے بُری طرح شکست کھائی۔ اس فتح سے محمدؐ صاحب کے کام میں ایک اَور تبدیلی ہُوئی۔ اُن کے ساتھیوں کے ذہن پر اس کا بڑا اثر پڑا (دیکھو سورہ آلِ عمران آیت ۱۱۹) لیکن یہودیوں کے دماغ میں یہ فتح کھٹکنے لگی اور اُن کے شاعر محمدؐ صاحب کی ہجو کرنے لگے۔ لکھا ہے کہ ایک ایسی شاعرہ کو اس طرح قتل کر ڈالا کہ جب وہ سو رہی تھی تو ایک اندھے یہودی نے اُسے خنجر سے مار ڈالا (واقدی)

اُس وقت سے محمدؐ صاحب اپنی نامرغوب توجہ کے ساتھ اُن کی طرف مائل ہو گئے۔ سب سے پہلے اُنہوں نے بنو قینقاع کو کسی وجہ سے اُن کے گھروں سے نکالا اور اُن کی جائداد ضبط کر لی۔ یہ ایک انوکھی بات ہے کہ یہودیوں کے مختلف قبیلے اپنے انجام سے ناآشنا دکھائی پڑتے ہیں۔ جیسا کہ بنو قینقاع کے واقعہ سے ظاہر ہے اور یوں وہ ایک دوسرے

کی مدد کو نہ آئے جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ یہودی جماعت کا تدارک علیحدہ علیحدہ کر کے آخر کار سب کے سب کو محمدؐ صاحب نے ٹھکانے لگا دیا۔ دوسرا قبیلہ جسے مصیبت اُٹھانی پڑی بنو نضیر کا تھا جو مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر رہتے تھے۔ انہوں نے محمدؐ صاحب کے ساتھ نقض عہد کیا تھا۔ یہ اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے اور اُن کی جگہ مسلمانوں کو دے دی گئی۔ سورہ الحشر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

اس عرصہ میں اہل مکہ بدر کی شکست کو خاموشی سے برداشت کرنے کے بجائے اس کا بدلہ لینے کی بڑی تیاری میں مصروف تھے اور قافلہ کا سارا منافع جسے ابوسفیان کی ہوشیاری نے مسلمانوں کے ہاتھ سے بچا لیا تھا اس مقصد پر اُنہوں نے لگا دیا اور یوں جنگ بدر کے تیسرے سال تین ہزار قریشیوں نے ابوسفیان کی ماتحتی میں مسلمانوں کو اُحد کے میدان میں پوری شکست دی۔ محمدؐ صاحب خود زخمی ہو گئے تھے لیکن افواہ یہ اُڑ گئی تھی کہ وہ قتل ہو گئے۔ بیضاوی کا بیان ہے کہ اس موقعہ پر محمدؐ صاحب نے قرآن کی یہ آیت لوگوں کو سُنائی کہ "محمدؐ اس سے بڑھ کر اور کیا کہ ایک رسول ہیں اور بس اُن سے پہلے اور بھی رسول گزر رہے ہیں پس اگر مر جائیں یا مارے جائیں تو کیا تم اپنے اُلٹے پیروں پھر لوٹ جاؤ گے" (سورہ آل عمران ۱۳۸ آیت)

لیکن اس ابتدائی کامیابی سے اہل مکہ کا فائدہ نہ اُٹھانا اُن کے لئے یہ ایک برائے نام فتح ثابت ہُوئی۔ بدر کی فتح کو محمدؐ صاحب نے خدا کی حمایت کا ایک نشان بنایا تھا اور اب اپنی اس شکست کا سبب یہ بنایا کہ یہ شکست ان کے پیروؤں کے استقلال کی آزمائش کے لئے

اور جنہوں نے اُن کی نافرمانی کی تھی اُن کی ملامت کے لئے تھی۔ بہرحال محمدؐ صاحب اس شکست سے ہمت نہیں ہارے اور جلد مسلمانوں میں اپنا اعتبار پھر پیدا کر لیا۔

محمدؐ صاحب نے اپنے حق میں یہ اچھا ہی کیا کیونکہ اہلِ مکہ نے اپنے اُوپر سے اس شخص کو دُور کرنے کی ایک آخری اور سر توڑ کوشش کرنے کا قصد کیا کہ جس سے اِن کی ہستی خطرہ میں تھی۔ انہوں نے اپنے بدوی اتحادیوں اور بھاڑے کے سپاہیوں کی ایک بڑی جماعت فراہم کی اور اس بات کے ماننے کی وجہ موجود ہے کہ مدینہ کے یہودی قبیلہ بنو قریظہ سے ان کا منصوبہ تھا کہ وہ بھی اُن کی مدد کریں گے ۶۲۷ء میں مکہ کی یہ نئی فوج جس میں قریب دس ہزار سپاہی تھے مدینہ کے سامنے دکھائی دی۔ محمدؐ صاحب نے شہر کے غیر محفوظ حصہ دشمن کو اور شمار میں قلیل فوج کا بچاؤ ایک خندق کے ذریعہ سے کیا کہ جس نے محمدؐ صاحب کے فوجی مقام پر حملہ کرنے سے پورے طور پر باز رکھا۔ جارنج کے وقت بدو غیر معتبر ثابت ہوئے۔ غرض کہ دشمنوں کی فوج میں محمدؐ صاحب پھوٹ ڈالنے میں کامیاب ہوئے اور یوں اہلِ مکہ نے محاصرہ اُٹھا لیا کہ جس میں طرفین کا نقصان بہت کم ہوا۔

بنو قریظہ نے جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیا مگر محمدؐ صاحب نے اُن پر غداری کا شبہ کیا۔ اُنہوں نے حسبِ عادت محمدؐ صاحب کا مضحکہ اور توہین کر کے اب اُنہیں برانگیختہ کر دیا۔ چنانچہ محمدؐ صاحب خود اپنا یہ خیال تحریر میں چھوڑ گئے ہیں کہ اُن کی رائے میں تمام لوگوں میں یہودی مسلمانوں کے دشمن ہیں (سورۃ المائدہ آیت ۸۵) محمدؐ صاحب نے اس قصوروار قبیلہ کے خلاف انتہائی کارروائی اختیار کی۔ علی تین ہزار کی جمعیت لے کر اُن

کی سرکوبی کو روانہ ہُوا۔ پندرہ دن کے محاصرہ کے بعد اُنہوں نے درخواست کی کہ بنو نضیر کی طرح اُن کو بھی چلے جانے کی اجازت دے دی جائے مگر اُن کی یہ درخواست نامنظور ہوئی۔ آخرکار پورے قبیلہ نے ہتھیار ڈال دیئے محمدؐ صاحب نے یہ منظور کر لیا کہ ایک تیسرا فریق اُن کا فیصلہ کرے۔ اس تیسرے شخص نے جو بنو قریظہ سے کسی وجہ سے ہمدردی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ فیصلہ کیا کہ سارے مرد قتل کر دیئے جائیں اور عورتیں اور بچے غلامی میں بیچ ڈالے جائیں۔ اس فیصلہ کے مطابق کُل مرد جن کا شمار بعض کے بیان میں چھ سو بتایا گیا ہے قتل کر ڈالے گئے اور محمدؐ صاحب اُس وقت کھڑے ہُوئے اُن کی موت پر راضی تھے۔ یہاں اس قدر اور اضافہ کر دینا مناسب ہے کہ امیر علی کے بیان کے مطابق "اُن مردوں کا شمار جو قتل کیئے گئے دو سو یا دو سو پچاس سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔" (اسپرٹ اوف اسلام صفحہ ۸۲)

فتح مکّہ محمدؐ صاحب اپنے صدر مقام میں مامون تھے اور اہل مکّہ اپنی ناکامی اور شکست سے ہمت ہار بیٹھے تھے اور یوں اُن کے سامنے اب مکّہ کا راستہ کُھلا پڑا تھا اور اب اسلام کے لئے کعبہ کا مطالبہ کر کے اُنہوں نے اپنی اعلےٰ بصیرت اور صحیح قوتِ امتیازی کا اظہار کیا۔ اُنہوں نے حج کی رسُوم کا خُدا کی طرف سے مقرر کیئے جانے کا اعلان کیا (سورۃ الحج آیت ۳۱) اس موقعہ پر رسُوخ حاصل کرنے میں اُن کی یہ حکمت عملی ایک نہایت ہی دانشمندانہ فعل تھا۔ عرب کے اُن تمام قبیلوں کو جو تتر بتر تھے اور ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے تھے باہم متحد کرنے کا یہ ایک وسیلہ تھا مگر عرب کی سرداری اب تک قریشیوں کے ہاتھ میں تھی اور جب تک یہ سرداری سے معزول نہ کر دیئے جاتے یا اُن کو اپنی طرف نہ

ملالیا جاتا محمدؐ صاحب اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔
کچھ عرصہ بعد محمدؐ صاحب چودہ سو مسلمانوں کو ہمراہ لے کر عمرہ کی غرض سے چلے تو قریشیوں نے اُن کو روک لیا اور شہر میں داخل ہونے نہ دیا۔ مختلف جماعتیں اس معاملہ میں بحث کرنے لگیں اور اس موقعہ پر محمدؐ صاحب نے اہل مکہ سے عہد و پیمان لیا کہ جو صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے یہ سنہ ۶۲۸ء کا واقعہ ہے۔ اس معاہدہ سے اسلام کی شہرت اور بھی بڑھ گئی کیونکہ محمدؐ صاحب نے بحیثیت ملکی سردار کے مغرور قریشیوں کے ساتھ برابری کا سلوک کیا تھا۔ اس صلح کے سبب بعض قریشی محمدؐ صاحب کے ساتھ ہو گئے۔ قرآن کی سورۃ الفتح کی پہلی آیت میں اسی "فتح" کی طرف اشارہ ہے۔ اس صلح کی رُو سے عرصہ دس سال تک جنگ موقوف کر دی گئی اور اگرچہ اس موقعہ پر محمدؐ صاحب اور اُن کے ساتھیوں کو مکہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن یہ قرار پایا تھا کہ اگلے سال ان کو آنے کی اجازت ہوگی۔
محمدؐ صاحب کی مدینہ کو واپسی اس لحاظ سے قابل یادگار ہے کہ انہوں نے آس پاس کے ملکوں کے حاکموں کو اسلام کی دعوت کا خط بھیجا۔
مثلاً ہرقل رومی شہنشاہ بیزنطین۔ شاہ ایران۔ مقوقس مصر۔ ہر خط پر اُن کی مُہر لگی تھی کہ جس کے یہ الفاظ تھے "محمدؐ الرسول اللہ۔" لیکن کسی نے تو ان کے مطالبہ کا مضحکہ اڑایا اور کسی نے ٹال دیا۔
سنہ ۶۲۹ء میں عمرہ کے وقت محمدؐ صاحب اور اُن کے ساتھیوں کو مکہ میں داخل ہونے کی اجازت ملی۔ یہ موقعہ بڑی سرگرمی کا تھا کیونکہ ان میں بعض عرصہ سات سال سے شہر میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ حج کی رسُوم ادا کرنے میں محمدؐ صاحب ہادی تھے۔ مسلمانوں کے جوش نے

وہاں کے لوگوں پر بڑا گہرا اثر کیا اور قریش کے بہت سے لوگ مسلمانوں سے جا ملے۔ جن میں سب سے مشہور خالد بن ولید تھے کہ جو بعد میں اپنی جنگی قوت کے سبب سیف اللہ یعنی اللہ کی تلوار کہلائے۔

اگرچہ محمدؐ صاحب اس کے بعد کہیں زیادہ طاقت ور ہو کر مدینہ لوٹے تاہم اُن کو ابھی وہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی کہ جس کے ذریعہ اسلام سارے عرب کی سیاسی مذہبی طاقت بن جاتا۔ ضرور تھا کہ مکّہ اسلام کا مرکز بن جائے ٹھیک جس طرح کہ یہ عربوں کے جذبات کا بھی مرکز تھا۔

صلح حدیبیہ کی میعاد اس قدر لمبی تھی کہ اس کے پورے ہونے سے کہیں پیشتر لوگ اس کی شرائط کے پورا کرنے سے اُکتا جاتے اور ہُوا بھی یہی۔ صلح حدیبیہ کو دو ہی سال کا عرصہ گزرا تھا کہ ایک گمنام قبیلۂ عرب کی شرابی پر محمدؐ صاحب کو مکّہ پر چڑھائی کرنے کا موقعہ مل گیا۔ دس ہزار کی جمعیت اکٹھی کر کے شہر کے سامنے آموجود ہوئے۔ محمدؐ صاحب کا پُرانا دشمن ابوسفیان یہ دیکھ کر کہ اب مزاحمت کرنا حماقت ہے محمدؐ صاحب کے سامنے آیا اور کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔ اہل مکّہ اس کے نکل جانے سے ہمت ہار بیٹھے اور خاموشی سے اٹل حقیقت کے سامنے انہوں نے سر جھکا دیا

یوں محمدؐ صاحب آخر کار مکّہ میں بحیثیت فاتح داخل ہوئے بلکہ اس سے بڑھ کر ایک سرگرم مصلح بن کر وہاں آئے۔ کعبہ میں پہنچ کر حجر اسود کو بوسہ دیا اور حکم دیا کہ عبادت گاہ کے اندر کے تمام بُت توڑ ڈالے جائیں علاوہ اس کے اپنے غلبہ کے وقت اپنے پُرانے دشمنوں کے ساتھ رحم کا سلوک کیا۔ شہر میں سب کے لئے معافی کا اعلان کرا دیا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ بعض اس معافی سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے۔ لیکن غالباً وہ جزا

کے مستوجب بھی تھے۔

یہ کیسی باا ثر تبدیلی محمدؐ صاحب کے نصیب میں تھی۔ آٹھ سال پیشتر اُن کو حقارت اور پستی کی حالت میں مکہ سے جان بچاکر فرار ہونا پڑا تھا۔ اب وہ صاحب اختیار ہیں جو وہ کہتے ہیں قانون بن جاتا ہے۔ دیکھئے کس طریقہ سے بُت پرستی فوراً وہاں سے دور کی گئی۔

ہر طرف سے عرب فوراً اطاعت قبول کرنے لگے۔ قبیلہ کے بعد قبیلہ آتا اور محمدؐ صاحب کی فرمانبرداری کا وعدہ کرتا۔ یوں محمدؐ صاحب کا نصب العین پورا ہو رہا تھا۔ اب عرب ایک متحد اور آزاد ملک ہو کر تمام حملہ آوروں کا مقابلہ کر سکے گا لیکن تمام لوگ جو اسلام قبول کرتے تھے ان کو اس کی تعلیم ماننی پڑتی تھی اس کے ضروری رسوم کو پورا کرنا پڑتا تھا اور زکوٰۃ دینی ہوتی تھی۔ اور ہر بات میں "خدا اور اس کے رسولؐ کی تابعداری بڑی محنت کرنی پڑتی تھی۔

محمدؐ صاحب کو یہ افواہ ملی کہ ہرقل شہنشاہ بیزنطین مدینہ پر چڑھائی کرنے کی غرض سے ملک شام کی سرحد پر فوج اکٹھی کر رہا ہے اور اگرچہ محمدؐ صاحب خود ایک بڑی فوج لے کر نکلے لیکن اُن کو کوئی دشمن نہ ملا اور یوں سرحد کے مسیحیوں اور یہودیوں کے خلاف چھیڑ چھاڑ کرنے پر ہی اکتفا کیا۔ اُس وقت سے اکثر مسیحی ذمی ہو گئے جس سے مراد اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا ہیں اُن کو جزیہ یا مذہبی محصول دینا پڑتا۔

سورۃ التوبہ کی ۲۹ آیت جو محمدؐ صاحب کا نہایت ہی پچھلا اعلان ہے ظاہر کرتا ہے کہ محمدؐ صاحب کے آخری دنوں میں یہودیوں اور مسیحیوں کے ساتھ ناہمدردی بلکہ کچھ نہ کچھ زبردستی کی تحریک کی گئی چنانچہ

آیت مذکورہ کے الفاظ یہ ہیں :۔ "اہل کتاب جو نہ خدا کو مانتے ہیں اور نہ آخرت کو اور نہ اللہ اور اُس کے رسول کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں اور نہ دین حق کو تسلیم کرتے ہیں۔ اُن لوگوں سے بھی لڑو۔"

اب محمدؐ صاحب کے پاس عرب کے مختلف حصوں سے سفیر آنے لگے اور اُس وقت جو اُن کی زندگی کا آخری سال تھا ملک شام کی سلطنت بزنطین کی رعایا پر چڑھائی کرنے کی تیاری شروع کی۔ انہی دنوں میں زندگی کی آخری بیماری نے اُن پر حملہ کیا۔

یہ ممکن ہے کہ ان کے جسم میں اُس زہر کا اثر باقی رہ گیا تھا جو چند ماہ پیشتر انہوں نے گوشت میں کھایا تھا۔ آخر کو بخار آگیا اور سخت تکلیف میں رہے یہاں تک کہ تریسٹھ ۶۳ سال کی عمر میں ۸ جولائی ۶۳۲ء کو انتقال کیا۔ اُن کے ساتھیوں کے لئے یہ صدمہ بالکل ناگہانی تھا۔

تیسری فصل

پہلے چار خلفاء

ابوبکر	سنہ ۶۳۲ء	سے	سنہ ۶۳۴ء	تک
عمر	سنہ ۶۳۴ء	سے	سنہ ۶۴۴ء	تک
عثمان	سنہ ۶۴۴ء	سے	سنہ ۶۵۶ء	تک
علی	سنہ ۶۵۶ء	سے	سنہ ۶۶۱ء	تک

محمدؐ صاحب کی موت سنہ ۶۳۲ء میں ہوئی اور یہ واقعہ اُن کے ساتھیوں

کے لیے ناگہانی تھا اور نہ تو خود محمدؐ صاحب نے اور نہ اُن کے پیروؤں نے
یہ سوچا تھا کہ اُن کی موت کے بعد تحریکِ اسلام کو ترقی کیونکر دی جائے۔
اور البتہ اہلِ مدینہ نے اپنے لوگوں میں سے کسی کو سردار مقرر کرنا چاہا کیونکہ
تقریباً ساری ترقی اسلام کی انہی لوگوں کے سبب سے ہوئی تھی لیکن اگر
اُن کا کوئی آدمی سردار مقرر ہو جاتا تو قریش کا قبیلہ اُن سے کوئی واسطہ نہ
رکھتا کیونکہ اگرچہ محمدؐ صاحب نے قبائل عرب کی قدیم حدبندیوں کو توڑ ڈالنے
کی حتی المقدور کوشش کی تھی تاہم ان کے اندر اِس کا قومی احساس اب
تک موجود تھا اور اُس وقت قریش کسی اَور قبیلہ کے سردار کی اطاعت
ہرگز منظور نہ کرتے۔ محمدؐ صاحب کے قریبی ساتھیوں نے جو صحابہ
کہلاتے تھے ابوبکر کو سردار منتخب کیا اور بڑی قیل قال کے بعد مدینہ کے
لوگوں نے بھی اس انتخاب کو منظور کر لیا اور یوں ابوبکر پہلے خلیفہ ہو گئے۔

محمدؐ صاحب نے اپنی آخری بیماری سے پیشتر ملک شام پر چڑھائی
کرنے کو ایک فوج کی تیاری کا حکم دیا تھا اُسے ان کی زندگی کے آخری
کاموں میں سے سمجھنا چاہیئے۔ یہ مہم روانہ ہونے کو بالکل تیار تھی کہ محمدؐ
صاحب کی بیماری کے سبب روک لی گئی۔ ابوبکر جونہی خلیفہ ہوئے
اُن کو اس مشکل سوال کا فیصلہ کرنا پڑا کہ یہ مہم بھیجی جائے یا روک لی جائے
تمام عرب میں اسلام کے خلاف بغاوت کے فوری آثار دکھائی دے رہے
تھے اور ملک شام کی مہم کی غرض سے جو فوج تیار کی گئی تھی اس میں تمام
ایسے لوگ شامل تھے کہ جن کی وفاداری پر ابوبکر کو بھروسہ تھا بہرحال انہوں
نے دلیری سے کام لیتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ چونکہ اس مہم کا حکم محمدؐ صاحب
نے دیا تھا اِس لئے یہ ضرور روانہ ہو۔ یہ ایک طاقت ور اور بے باک

انسان کا فیصلہ تھا۔ اب چونکہ عرب کے باغیوں کے حملہ کو شہر پہ سے روکنے کے لئے ابوبکر کے ساتھ صرف مٹھی بھر جماعت رہ گئی تھی اِس لئے ملک شام کی مہم کے لوٹنے تک اُس کی حالت نہایت خطرناک تھی۔ ابوبکر کی بے باکی سے عرب متاثر ہو گئے اور جنوبی فلسطین میں کامیابی کے ساتھ چڑھائی کرنے کے بعد جُوں ہی مہم واپس آئی انہوں نے عرب کے تمام حصوں میں فوج روانہ کر دی اور ایک سال کے عرصہ میں عرب کے تمام قبیلے پھر اسلام قبول کرنے پر مجبور ہوئے۔ اگرچہ اس موقعہ پر ان کو اسلام کی طرف پھر لانے کے لئے اُن پر زبردستی کرنی پڑی لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں یہ لوگ دل و جان سے اس نئی تحریک کے شریک ہو گئے کیونکہ جب عربی افواج عرب سے نکلیں اور اپنے سے زیادہ مہذب قوموں سے مال غنیمت جیت کر واپس آئیں تو اہل عرب اس نئے مذہب کی سچائی کے قائل ہو گئے۔ کہ جس نے انہیں خلافِ اُمید ایسی کامیابی بخشی

بعض علماء کا خیال ہے کہ اس واقعہ کے کئی ہزار سال پیشتر بہت سے لوگ عرب سے نکل کر ملک شام اور عراق میں جا بسے تھے۔ خواہ یہ سچ ہو یا نہ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ سینکڑوں برس سے عرب اپنے وسیع بنجر ملک میں گھرے پڑے تھے اور اس کے باہر نکل کر کسی قسم کی ترقی انہوں نے نہیں کی تھی۔ یہ سچ ہے کہ محمدؐ صاحب کی زندگی کے چند ہی سال پیشتر بلکہ شاید اُن کی زندگی ہی میں عرب کے ایک قبیلہ نے کوفہ کے قریب جنگ ذوقار میں ایرانی فوج کو شکستِ فاش دی تھی لیکن قبائل عرب کی نا اتفاقیوں نے عربوں کو اُن کی اس فتح سے کوئی فائدہ اٹھانے نہیں دیا۔

اس کا کافی ثبوت موجود ہے کہ ملک عرب کی زمین کسی وقت بہت مادہ زرخیز تھی لیکن بارش کی کمی کے سبب وہاں کی زمین اپنی پیداوار سے اُن کی پرورش نہ کر سکی۔ اس بات کا پتہ عربوں کی روایتوں اور علم طبقات الارض کے مشاہدوں سے لگتا ہے۔ علاوہ اس کے ملک کے بعض حصّوں میں قدیمہ کے پُرانے راستے جو اب بالکل ویران پڑے ہیں اُن کے آثار سے بھی یہی معلوم پڑتا ہے۔ بعض علماء کی رائے ہے کہ عربوں کا نئی زمین کی تلاش میں نکلنے کا سبب وہاں کی زمین کا رفتہ رفتہ خشک ہو جانا ہے اور جب محمد صاحب نے عرب میں یگانگت پیدا کر دی تو اس یگانگت نے اس حد بندی کی قید کو توڑ کر نکل پڑنا اُن کیلئے ممکن کر دیا جس میں وہ صدیوں سے بند پڑے تھے۔

جُوں ہی ابوبکر عرب کے منتشر قبائل کو اسلام کی اطاعت پر واپس لائے سلطنت عرب کا وسیع پھیلاؤ شروع ہو گیا۔ ابوبکر کی سلطنت کی قلیل میعاد کے ختم ہونے سے پیشتر جو دو سال سے کچھ ہی اُدپر تھی عربوں نے ملک شام اور عراق میں اپنا قدم مضبوطی سے جما لیا تھا۔ عراق اس زمانہ میں سلطنت ایران کا ایک حصہ تھا۔ ابوبکر نے اس گڑبڑی کا خیال کر کے جو محمد صاحب کی مَوت پر واقع ہوئی تھی یہ احتیاط کی کہ اپنا ایک جانشین خود نامزد کر دیا اور یُوں ان کے مرتے ہی عمر نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور اسلامی فتوحات کو آگے بڑھایا۔

عرب کے شمال مغرب میں ایک مسیحی قبیلہ تھا جو بنو غسان کہلاتا تھا اور شمال مشرق میں ایک اَور قبیلہ تھا کہ جس کے کچھ لوگ مسیحی تھے یہ قبیلہ بنو حِرا کے نام سے کہلاتا تھا۔ بہت برسوں سے ان دو قبیلوں میں سے ایک

کو رومی سلطنت اور دوسری کو ایرانی سلطنت روپیہ دیتی رہی تاکہ عربی حملوں کو ان سے یہ روکے رہیں۔ رومی سلطنت کی بدحالی نے بنو غسان کا روپیہ بند کر دینے پر اُنہیں کو مجبور کر دیا۔ اس لئے اب اُن کی طبیعت سرحد کی چوکیداری کے کام کرنے کو راضی نہ ہوئی اور جہاں تک ایران کا تعلق تھا بنو حیرا کے کچھ لوگ سلطنت ایران کے وفادار رہے لیکن بعض نے باوجود مسیحی ہونے کے عراق پر حملہ کرنے والے مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ چنانچہ ایک نسطوری اسقف کے بارے میں بھی ہم پڑھتے ہیں کہ علی کے زمانہ میں جب مسلمانوں نے* استحقاق مسیحیوں کے لئے حاصل کیا۔ ایسی باتوں سے ظاہر ہے کہ ابتداءً مسلمان اوروں کو اسلام میں داخل کرنے کے لئے اتنے کوشاں نہیں تھے جتنا کہ فتوحات کے حاصل کرنے میں۔ بہتیرے مسیحیوں نے اسلام کو ایک مذہب تصوّر کرنے کے بجائے ضرور اُسے محض عربی فتوحات کی جنگ سمجھی ہوگی اور ایک معنی میں اُنکا خیال بیشک درست تھا

ایرانی اپنے وطن کی حمایت میں بہادری سے لڑے اور بڑی سخت لڑائیوں کے بعد مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایران اور رومی سلطنت کے مابین کی طویل اور مسلسل جنگ نے ایرانی سلطنت کو ضعف پہنچا دیا تھا اور علاوہ اس کے تخت سلطنت کے مسئلہ جانشینی نے خود ایرانیوں میں پھوٹ ڈال دی تھی اور ایسے وقت عربوں کی متحدہ طاقت دلیرانہ بہادری کے ساتھ اُن کے خلاف لڑ رہی تھی کہ جنہیں موت کی کوئی پرواہ نہیں تھی کیونکہ محمد صاحب نے ان کے دل میں یہ خیال گہرے طور پر جما دیا تھا کہ اگر وہ خدا کی راہ میں لڑتے ہوئے مر جائیں گے تو فوراً جنت الفردوس میں داخل ہوں گے اور پھر جنت بھی ایسی کہ جو ایران کی بے شمار دولت سے بڑھ کر اسبابِ عیش و عشرت سے آراستہ ہے۔ ایک مسیحی مصنف دو سو سال بعد عربوں کے لئے لکھتا

* موصل پر چڑھائی کی تو اُس نے غلہ سے اُن کی مدد کر کے خاص

ہے کہ "یہ ایک محتاج اور وحشی قوم تھی جو چھپکلی یا اس قسم کے اور جانوروں کو کھاتی تھی۔ موسم گرما کے جھونکوں سے بچنے کے لئے اُن کے پاس کوئی پناہ نہیں تھی اور جاڑے کے موسم میں سرد ہوا سے بچنے کے لئے اُن کے پاس کوئی اوڑھنا نہیں تھا۔ غرض کہ یہ بھوکی اور ننگی قوم تھی۔" ممکن ہے کہ ایسا بیان نفرت کی وجہ سے لکھا گیا ہو لیکن اس میں بہت کچھ سچائی بھی ہے اور یوں ہم اُن کی بے باکی کو جس کے ساتھ وہ ایران کے اسبابِ عیش کے لئے لڑتے تھے بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

ملک شام میں مسلمانوں کا کام زیادہ سہل تھا یہ ملک اُس زمانہ میں رومی سلطنت کا دُور کا صوبہ تھا اس سلطنت کا دارالحکومت اس وقت رومۃ الکبریٰ نہیں بلکہ قسطنطنیہ تھا اور اس کے لوگ زیادہ تر یونانی تھے لیکن تاہم یہ رومی سلطنت ہی کہلاتی تھی جسے عرب روم کہتے تھے۔ قسطنطنیہ کا دوسرا نام بیزنطین تھا اور اس لئے بعد کو جلد ہی رومی سلطنت سلطنت بیزنطین کے نام سے مشہور ہو گئی۔ جن دنوں میں مسلمان ملک شام فتح کر رہے تھے رومی سلطنت کے بادشاہ کا نام ہرقل تھا۔ جب یہ پہلے پہل بادشاہ ہوا تو نہایت سُست تھا اور سلطنت کو ایرانیوں کے ہاتھ سے بڑی زک پہنچی لیکن یکایک اُس نے پہلو بدلا اور ایرانیوں سے لڑکر اُن پر بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں اور پھر سُست پڑ گیا اور مسلمانوں کے ساتھ لڑائی میں ایک مرتبہ شکست کھانے کے بعد وہ قسطنطنیہ واپس گیا اور ہاتھ سے ملک شام کے نکل جانے کی کوئی فکر نہ کی اُدھر خود شامیوں کو بھی اُس کی پروا نہیں تھی۔ اُن پر یونانیوں کی حکومت رہے یا عربوں کی حکومت ہو مگر ان کو ہرقل سے نفرت تھی کیونکہ یہ زیادہ تر اُس کلیسیا کے شریک تھے جو یعقوبی کہلاتی ہے اور ہرقل کی یہ کوشش تھی کہ یہ اُس کی کلیسیا کے جو ملکانی

کہلاتی ہے شریک ہو جائیں اور اس غرض سے اُنہیں ستایا بھی تھا۔ غرض کہ نتیجہ یہ ہُوا کہ مسلمانوں کو ملک شام پر قبضہ کر لینے میں زیادہ دِقّت نہیں اُٹھانی پڑی تھی۔

مصر میں مسلمانوں کو سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ مصری اپنے وطن کی حمایت میں بہادری سے لڑے لیکن مصر بھی اُس وقت رومی سلطنت کا ایک صُوبہ تھا اور مصری فوج کے اعلیٰ افسران رومی تھے جو یا تو سُست تھے یا بے استعداد مگر پھر بھی مصری مسلمانوں پر فتحیاب ہو جاتے۔ ایک شخص جو مقوقس کہلاتا تھا اُس نے دغابازی یعنی .... یہ شرمناک معاہدہ مسلمانوں کے ساتھ کر کے مصر مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اگرچہ مؤرخین مقوقس کے بارے میں بہت کچھ بتاتے ہیں لیکن یہ نہیں سمجھاتے کہ وہ تھا کون۔ بعضوں کے خیال میں وہ مصر کا گورنر تھا اور بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ وہی سیرس تھا کہ جسے شہنشاہ نے پطریارک یا مصریوں کا اُسقفِ اعلےٰ مقرر کیا تھا۔ مصر کے مسیحی ایسی کلیسیا کے شریک تھے جو یعقوبی کلیسیا کی مانند تھی اور یہ قبطی کہلاتے تھے۔ ہرقل کے حکم سے سیرس نے انہیں بہت ستایا تھا تاکہ وہ ملکائی ہو جائیں اور اُن میں سے بہتیرے یا تو مارے گئے تھے یا وطن چھوڑ کر نکل گئے تھے۔ اسلامی فتوحات کے بعد بہت سے مصری مسیحی مسلمان ہو گئے تھے۔ ایک سبب اُن کے اسلام قبول کرنے کا یہ تھا کہ خود اُن کے اپنے مسیحیوں نے اُن کو اس قدر سختی سے ستایا تھا کہ وہ مسیحیت سے تنگ آ گئے تھے اور دوسرا سبب یقیناً یہ بھی تھا کہ اُن کے آباؤ اجداد ایسے وقت میں مسیحی ہوئے تھے کہ جب لوگ گروہ کے گروہ مسیحیت کو قبول کرتے تھے اور اُنہوں نے ٹھیک طور سے مسیحیت کی تعلیم نہیں پائی تھی۔

جب اسلام قائم ہو چلا تو یہ قانون بنا کہ سوائے مسلمانوں کے کوئی اور عرب میں نہ رہنے پائے اور یوں یہودی اور مسیحی جو اسلام قبول نہ کرتے اُن کو ملک

چھوڑنا پڑتا۔ سوائے صوبۂ یمن کے جہاں اسلام کے دو صدی بعد بھی مسیحی جماعت موجود تھی ملک عرب مسلمانوں کا وطن ہونے کو تھا۔ عمر کے زمانہ میں عرب شاید ہی ممالک مفتوحہ میں زمین کے مالک ہوتے اور جب وہ جنگ میں مشغول نہ ہوتے تو ملک عرب میں اپنے گھروں کو واپس آتے اور یوں فی الحقیقت اُن ابتدائی ایام میں مفتوحہ ممالک کی ساری زمین پر غیر مسلموں کا قبضہ تھا اور انہیں بھاری محصول مسلمانوں کو ادا کرنا پڑتا تھا۔

بعد میں جب مسلمانوں کو بھی زمین رکھنے کی اجازت مل گئی تو محاصل دو قسم کی کر دی گئیں۔ ایک خراج یا زمین کا لگان۔ دوسرا جزیہ جو صرف غیر مسلموں پر لگایا جاتا۔ چونکہ غیر مسلموں کو جنگ میں شریک ہونا نہیں پڑتا تھا اِس لئے جزیہ ایسا محصول سمجھا جاسکتا ہے جو بجائے فوجی خدمت کے لیا جاتا تھا یوں اصولاً یہ بالکل درست تھا کہ غیر مسلم یہ زائد محصول دیں لیکن عملاً جزیہ غیر مناسب اور واجبی محصول سے کہیں زیادہ رقم وصول کرنے کا بہانہ بنایا جاتا تھا۔ غرض کہ جب مسلمان بہت سا مالِ غنیمت لے کر اور قیدی عورتوں کو اپنی بیویاں بنا کر عرب کو لوٹے تو مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی اور اس سے سمجھ میں آ جاتا ہے کہ کیوں کر مسلمان میدان جنگ میں بڑی فوج اُتار سکے۔

ساڑھے دس سال کی حکومت کے بعد عمر کا انتقال ہو گیا۔ ایک ایرانی غلام کے ہاتھ وہ خنجر سے ہلاک ہوئے۔ اُن کے زمانہ میں ایرانی فوج کے سپہ سالار عمرو بن العاص نے مصر پر قبضہ کیا۔ اور شام اور ایران کی فتح پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ عمر نے اپنے جانشین کے انتخاب کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی تھی اور بڑے مباحثہ اور تکرار کے بعد عثمان تیسرے خلیفہ مقرر ہوئے۔

ابوبکر اور عمر کے عہدِ خلافت میں جب کہ عربی افواج بڑی فتوحات

حاصل کر رہی تھیں تو عرب کے مختلف قبائل متحد تھے لیکن جب ملک گیری مفتوحہ زمین کی سکونت پذیری سے بدلی تو پرانی رقابت پھر ظاہر ہو پڑی۔ قریش اپنے آپ کو باقی عربوں سے افضل سمجھتے تھے اور باقی عربوں کو قریش سے اُن کے اس دعوے کے سبب نفرت تھی۔ عثمان کمزور اور کم سمجھ تھے اور بجائے اس کے کہ قریش اور باقی عربوں میں موافقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے انہوں نے قریش کی حمایت کی۔ قبیلہ قریش دو بڑے خاندانوں پر منقسم تھا۔ ایک تو ہاشم کا خاندان تھا جس میں محمد صاحب اور علی تھے اور دوسرا بنو امیہ کا خاندان تھا جس کے شریک عثمان اور ملک شام کے حاکم معاویہ تھے۔ عثمان نے اپنے خاندان کے لوگوں کی طرفداری کی اور بنو امیہ کے لوگوں کو بڑے بڑے عہدوں پر مامور کر دیا۔

اگر عثمان زبردست ہوتے تو ممکن تھا کہ اپنے دشمنوں کو قابو میں لے آتے لیکن وہ اتنے کمزور تھے کہ اُن سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے اُن سے بنو ہاشم اور باقی قریش دونوں کو نفرت ہو گئی۔ انہیں عثمان سے اور خاندان امیہ کے حاکموں سے جنہیں عثمان نے مقرر کیا تھا دلوں سے عداوت تھی۔ آخر کار باغی لشکر عراق کے شہر کوفہ اور بصرہ سے اور مصر سے روانہ ہوا اور مدینہ میں عثمان پر حملہ آور ہو کر اُنہیں قتل کر دیا۔ اُن کے عہد خلافت میں اسلامی فوج نے ایشائے کوچک پر چڑھائی کی اور افریقہ کے شمالی ساحل کی طرف آگے کو بڑھی تھی۔

مدینہ کے لوگوں نے علی کو خلیفہ منتخب کیا۔ اُس وقت وہ مدینہ میں تھے اور اگرچہ باغیوں سے ملے نہیں تھے تاہم عثمان کو بچانے میں مدد بھی نہیں دی تھی۔ اب اگر وہ عقلمند ہوتے تو یا تو باغیوں کو قتل کرتے یا اُن کا ساتھ

یہ کہہ کر دیتے کہ بدانتظامی کے سبب عثمان واجبی طور پر قتل کیے گئے۔ لیکن اُنھوں نے باغیوں کو اُن کی حرکت پر ملزم ٹھہرایا اور پھر اُن کو سزا دینے سے ڈر بھی گئے۔ عثمان کی حکومت کے خلاف لوگوں میں ناراضگی خاص کر عراق اور مصر میں تھی۔ ملک شام میں ناراضگی کم تھی کیونکہ یہاں کا حاکم معاویہ بڑا زبردست شخص تھا۔ ناراضگی کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ عثمان نے گورنری کے تمام عہدوں پر بنو اُمیہ کے لوگوں کو مقرر کیا تھا۔ خلیفہ ہوتے ہی علی نے پہلا کام یہ کیا کہ تمام گورنروں کو اُن کی جگہوں سے واپس بلا کر اُن کے بجائے خاندان بنو ہاشم کے لوگوں کو مقرر کیا یعنی جس خاندان کے وہ خود شریک تھے۔ اُن کا یہ فعل بھی اُن عربوں کو جو قریش نہیں تھے اور اُن لوگوں کو جو عرب نہیں تھے ناگوار معلوم ہُوا۔ معاویہ نے ملک شام کی گورنری سے دست بردار ہونے سے انکار کر دیا اور اپنے بچاؤ کے لئے ایک فوج اکٹھی کر لی۔

عربوں اور غیر عربوں کے درمیان اور پھر قریشیوں اور باقی قبائل عرب کے مابین جو کشمکش تھی۔ اُس کے سمجھنے کے لئے محمد صاحب کے زمانہ کو لوٹنا ہے۔ محمد صاحب کو خود اپنے قبیلہ قریش سے لڑنا پڑا تھا۔ قدیم عرب کے دستور کے مطابق یہ بدترین قسم کی دغابازی تھی لیکن محمد صاحب نے ایک نئے اصول کا اعلان کیا کہ سب مسلمان آپس میں برابر ہیں اور قبیلہ کے امتیاز کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ سورت الحجرات کی تیرھویں آیت میں وہ کہتے ہیں کہ "لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری ذاتیں اور تمہاری برادریاں ٹھہرائیں تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو ورنہ اللہ کے نزدیک تم میں بڑا شریف وہی ہے جو تم میں بڑا پرہیزگار ہے۔"

مساوات کے اس نئے اصول کا اسلام میں جو اثر ہُوا اُس کی مثال

ایک روایت سے ملتی ہے جو خلیفہ عمر کے متعلق ہے۔ منقول ہے کہ عمر نے ایک مرتبہ دو شخصوں کو باہم تکرار کرتے ہوئے سُنا۔ ایک اُن میں سے کہہ رہا تھا کہ میں فلاں ابن فلاں ہوں جس نے ایسے بڑے بڑے کارنامے کئے تھے عمر نے کہا۔ اگر تم سمجھ دار ہو تو تم صاحب حسب و نسب بھی ہو۔ اگر تم میں اچھی خاصیتیں ہیں تو تم عزت دار بھی ہو۔ اگر تم میں خدا کا خوف ہے تو تم صاحب لیاقت بھی ہو۔ لیکن اگر تم میں ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے تو ایک گدھا تم سے زیادہ لائق ہے۔

اگر علی سارے مسلمانوں کے آپس میں برابر ہونے کے اصول کو سمجھتے تو تمام مسلمانوں کو متحد رکھتے۔ لیکن ان کا بہت زیادہ بھروسہ اس بات پر تھا کہ وہ قریش کے خاندان سے ہیں اور پیغمبر کے داماد ہیں۔ اُن سے پہلے بغاوت کرنے والوں میں عائشہ تھیں کہ جس نے علی کے خلاف فوج اکٹھی کی اور عثمان کے قتل کا الزام ان پر لگایا۔ علی نے بھی عراق سے ایک فوج جمع کی جس میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنہوں نے عثمان کو قتل کیا تھا۔ اور عائشہ اور اُن کی فوج کا جنگ جمل میں مقابلہ ہوا۔ علی اس لڑائی میں کامیاب ہوئے مگر باغیوں کی مدد قبول کر کے انہوں نے یہ ظاہر کر دیا کہ وہ عثمان کے قتل کو پسندیدہ نگاہ سے دیکھتے تھے۔

اب علی کوفہ سے جسے انہوں نے اپنا دارالسلطنت قرار دیا تھا ایک فوج لے کر معاویہ سے لڑنے کو روانہ ہوئے۔ ایک گھمسان کی لڑائی ہوئی اور طرفین کے بہتیرے لوگ مارے گئے۔ علی لڑائی جیت رہے تھے کہ معاویہ کے بعض لوگوں نے ایک بڑی انوکھی چال چلی۔ یعنی...... انہوں نے قرآن کے اوراق نیزوں پر ٹھونک کر کھڑے کئے اور چلائے کہ اُن کے اور

ہمارے درمیان قرآن کا فیصلہ کافی ہے۔ علی چاہتے تھے کہ فتح ہونے تک لڑائی ہوتی رہے لیکن فوج نے لڑنے سے انکار کر دیا۔ آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ چھ ماہ تک صلح رہے اور علی اور معاویہ کا فیصلہ دو ثالثوں کے ذریعہ کیا جائے۔ جب علی کی فوج واپس لوٹ رہی تھی تو ان میں سے بہتیروں نے اپنا ارادہ بدل ڈالا اور پچھتائے کہ آخر تک وہ کیوں نہیں لڑے۔ انہوں نے علی پر کمزوری کا الزام لگایا اور انہیں چھوڑ کر الگ اپنا ایک فرقہ قائم کیا جو خارجی کہلاتا ہے۔ اس عرصہ میں ثالثوں کا بھی فیصلہ ہو گیا اور کسی چال سے معاویہ خلیفہ بنا دیا گیا۔

علی نے پھر ایک فوج اکٹھی کر کے معاویہ سے لڑنے کی کوشش کی۔ اُدھر خارجی عراق پر حملہ کر کے نہایت تنگ کر رہے تھے اور اِدھر حضرت علی کی فوج کو معاویہ کے مقابلہ سے ہٹ کر اس طرف لڑنا تھا، اِس لئے اُن کی فوج نے ملک شام میں جا کر معاویہ کے خلاف جنگ کرنے سے انکار کر دیا اور یوں ملک شام معاویہ کے قبضہ میں رہ گیا اور ایران۔ عرب اور مصر پر علی کی حکومت رہی لیکن علی ان ملکوں پر بھی اپنا قبضہ نہیں رکھ سکے۔ معاویہ نے ایک فوج بھیج کر مصر فتح کر لیا اور عمرو بن العاص کو کہ جس نے رومیوں سے اُسے فتح کیا تھا اس کا گورنر مقرر کیا۔ معاویہ نے مکہ اور مدینہ کے لوگوں سے بھی بیعت لی یعنی وفاداری کا عہد اُن سے لیا۔ رفتہ رفتہ خارجیوں کی ناراضگی بڑھتی گئی اور کہنے لگے کہ ہم ہی سچے مسلمان ہیں اور باقی دوسرے مسلمان سب جہنمی ہیں۔ انہوں نے دیکھا کہ خلفاء صرف دنیاوی طاقت پر حکمران تھے اس لئے انہوں نے اپنا کوئی خلیفہ نہیں مقرر کیا۔ آخر کار انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایک ہی روز علی۔ معاویہ اور عمرو بن العاص تینوں قتل کر دیئے جائیں۔

ان تینوں میں سے عمرو بچ گئے۔ معاویہ سخت زخمی ہوئے اور علی مر گئے۔

محمد صاحب کے زمانہ میں علی بہادری سے لڑتے تھے لیکن بحیثیت خلیفہ وہ اپنے عہدے میں بالکل ناکامیاب رہے اور زیادہ سے زیادہ بدنام ہوتے گئے۔ شیعوں میں جو عزت علی کو ہے اس کا آغاز محمد صاحب کے بہت عرصہ بعد ہوا اور اس کا سبب اتنا اپنی نیک نامی نہیں ہے جتنا کہ محمد صاحب کے ساتھ ان کی رشتہ داری کا ہونا تھا۔ کچھ کچھ اسی طرح عثمان کی بدنامی جو اُن کی حینِ حیات میں تھی وہ بھی بعد کی نسل نے بھلا دی۔ تواریخی حقائق کا خیال نہ کر کے عثمان و علی کو کہ جن کی کمزوری اور طرف داری سے اسلام کو سخت نقصان پہنچا تھا۔ ابوبکر اور عمر کے ساتھ کہ جنہوں نے اسلام کی خدمت سچی اور اچھے طور پر کی تھی پہلو بہ پہلو رکھ کر ان چاروں کو خلفاء راشدین کے درجہ میں رکھا جاتا ہے۔

علی کے بیٹے حسن عراق میں خلیفہ ہوئے۔ لیکن اپنے اختیار کو عمل میں نہیں لائے اور چند مہینہ کے بعد اپنے اختیارات معاویہ کے سپرد کر کے مدینہ چلے گئے جہاں آٹھ برس قیام کرنے کے بعد انتقال کر گئے۔

چوتھی فصل

زمانہ بعد میں اسلام کا پھیلاؤ

(۱) خلفاء بنو امیہ

خاندان بنو امیہ کے خلفاء کا آغاز معاویہ سے ۶۶۱ء میں ہوا۔ اور

۷۵۰ء تک قائم رہا۔ جو تبدیلی اسلام پر آ رہی تھی اس لحاظ سے قابلِ غور ہے کہ معاویہ کے دو خاص گورنر قریشی نہیں تھے بلکہ عرب کے ایک اَور قبیلہ سے تھے جو ثقیف کہلاتا تھا۔ معاویہ کی عہدِ حکومت میں ہرات فتح ہُوا اور اسلامی سلطنت دریائے سندھ تک پہنچ گئی تھی۔ اسی خاندان کے دورانِ حکومت میں ۷۱۱ء کو ایک اسلامی فوج نے دریائے سندھ پار کیا اور ملتان فتح کر کے بہت سامانِ غنیمت حاصل کیا لیکن اس فتح کے بعد ملتان پر مستقل قبضہ نہیں کیا گیا۔

چونکہ معاویہ خلیفہ ہونے سے پیشتر ملک شام کا حاکم تھا اس لئے خلفاء بنو امیہ کا دارالخلافت دمشق رہا۔ دمشق سلطنت کے موزوں ہونے کو سب سے موزوں بھی تھا کیونکہ ملک شام میں امن تھا۔ مسلمان اور مسیحی ایک ساتھ امن سے رہتے تھے لیکن عراق کے دو خاص شہر کوفہ اور بصرہ اگرچہ دو فوجی مقام تھے تاہم یہاں کے لوگوں کا زیادہ حصہ مسلمانوں کے مخالف تھا۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اب عرب اسلام کا مرکز نہیں رہا تھا۔

معاویہ کی موت پر اُس کا جانشین اُس کا بیٹا یزید ہُوا۔ قریب سارے مسلمان سرداروں نے اُن کے مرنے سے پیشتر یزید کی بیعت کر لی تھی لیکن کچھ لوگوں نے بیعت سے انکار کیا یعنی کوفہ کے لوگوں نے علی کے بیٹے حسین کو بغاوت پر اُکسایا۔ حسین مکہ سے کوفہ کو روانہ ہُوئے لیکن جب وہ شہر کے قریب پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ کوفہ کے لوگوں نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے اور اب وہ لڑائی میں اُنکا ساتھ نہیں دیں گے تو حسین کے بہت سے ساتھی اُن کو چھوڑ کر بھاگ گئے اور وہ خود اپنے مٹھی بھر حمائتیوں کے ساتھ محصور کر لئے گئے اور کوفہ کے حاکم نے میدان کربلا میں اُن پر حملہ کر کے ۶۸۰ء میں محرم ماہ کی دس تاریخ کو انہیں قتل کر دیا۔ اُن کے قتل نے جو بے دردی سے کیا گیا

تھا لوگوں کے جوش کو اُبھار دیا۔ اوّل تو محمد صاحب کے دونوں اسوں کی ایسی موت پر اُنہیں شرم آئی۔ اسلام سے پیشتر اہلِ عرب قبیلہ کی سرداری کے موروثی ہونے سے ناواقف تھے لیکن آس پاس کی سلطنتوں میں تخت سلطنت کے موروثی ہونے کا عام دستور تھا۔ فرقۂ شیعہ نے اسلام میں یہی طریقہ قبول کیا۔ اس فرقہ کی امید علی کی نسل سے وابستہ تھی جس سے محمد صاحب کی اولاد مراد ہے جس کا سلسلہ اُن کی بیٹی فاطمہ سے چلا ہے۔

بنو اُمیہ کے عہد میں مسلمان رفتہ رفتہ افریقہ کے شمالی ساحل پر بڑھتے چلے گئے اور وہاں سے اسپین میں داخل ہوئے اور اسپین سے جنوبی فرانس میں پہنچے۔ ۷۳۲ء میں چارلس مارتول نے جنوبی فرانس میں مسلمانوں کو ٹورس کے میدان جنگ میں شکست دی۔ اس تاریخ سے مسلمانوں کا مغربی ممالک میں آگے بڑھنا رُک گیا۔ صرف شکست ہی اس رکاوٹ کی وجہ نہیں تھی بلکہ اس لئے کہ مسلمانوں کی طاقت اب صَرف ہو گئی تھی اور شمار گھٹ گیا تھا۔ مشرق میں وہ آرمینیا پر قابض رہے لیکن ایشائے کوچک فتح نہ کر سکے اگرچہ قسطنطنیہ پر کئی بار اُنہوں نے حملہ کیا۔ ان حملوں میں سب سے بڑا حملہ وُہ ہے کہ جب قسطنطنیہ کا محاصرہ ۷۱۷ء سے ۷۱۶ء تک وہ کئے رہے اور جس کا خاتمہ مسلمانوں کی پوری ناکامی پر ہوا۔ یونانیوں نے اس جنگ میں ایک خاص قسم کی بارود کا استعمال کیا تھا جو "یونانی آگ" کہلاتی تھی اُس نے مسلمانوں کی دوسری صعوبتوں میں جو اُنہیں بھوک پالے اور وبا سے اٹھانی پڑی تھیں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ مسلمانوں کی شکست نے جو قسطنطنیہ کے سامنے اُن کو اُٹھانی پڑی اور جو فرانس میں چارلس مارتول نے انہیں دی یورپ کو مسلمانوں کے تصرف سے بچا لیا۔ یہ کہنا کوئی مبالغہ کی بات نہیں ہے کہ اگر

مسلمان ان دو لڑائیوں میں کامیاب ہو جاتے تو مغربی تہذیب کی پوری
تواریخ بالکل مختلف ہوتی۔

اس کا ذکر ہو چکا ہے کہ مصر کے بہتیرے مسیحی بہت جلد مسلمان ہو
گئے تھے۔ عراق اور شام کے مسیحیوں میں بھی یہی ہوا۔ اگرچہ اس کے متعلق پورے
طور پر صحیح حالات کا پتہ نہیں لگتا ہے تاہم فتوحات کے ابتدائی دنوں میں مسیحیوں
کو آسانی سے مسلمان نہیں بنایا جاتا تھا کیونکہ مسلمان ہو جانے پر اُن کو جزیہ
دینا نہیں پڑتا تھا۔ واقعات سے معلوم پڑتا ہے کہ خلیفہ عمر مسیحیوں پر مہربان
تھے اور جب اُنہوں نے یروشلم فتح کیا تو وہاں کے مسیحیوں کے ساتھ اچھا
سلوک کیا۔ مفتوحہ ممالک کے اور باشندوں کے ساتھ مسیحیوں کو بھی سپاہیوں
کی لوٹ مار سے تکلیف ضرور اٹھانی پڑی ہوگی لیکن ایک سے زیادہ مسیحی مورخ
بتاتے ہیں کہ ملک شام میں مسیحیوں نے اسلامی حکومت کو رومیوں کی سلطنت
پر ترجیح دی تھی کیونکہ رومیوں کے ہاتھ مسیحی ایمان کو یعقوبی کلیسیا کے مطابق
ماننے کے سبب اُنہوں نے سخت تکلیف اُٹھائی تھی۔ بنو اُمیہ کے عہد میں
بے شک مسیحیوں کو کچھ ایذا سہنی پڑی لیکن ہمیں یہ ماننا پڑتا ہے کہ کم از کم بعض
ایذا رسانیوں کے موجب خود مسیحی ہادی تھے جو ایک دوسرے کے خلاف مسلمان
حکام سے شکایت کر کے اُن کو ایذا رسانی پر اُبھارتے تھے۔ ابتدا میں مسلمان
حکام مختلف مسیحی کلیسیاؤں میں امتیاز نہیں کر سکتے تھے اور اس لئے ایران
میں نسطوریوں کے علاوہ یعقوبی اور ملکانی بشپوں کے تقرر کا ذکر ہم سنتے ہیں۔ اس
سے قبل ساسانی بادشاہوں کے عہد میں صرف نسطوری مسیحیوں کو وہاں رہنے
کی اجازت تھی۔ جہاں تک واقعات کا علم ہے اس سے معلوم یہی ہوتا ہے
کہ مسیحیوں نے خود اپنی مرضی سے اسلام قبول کر لیا تھا اور غالباً بہتیرے نام

کے مسیحیوں نے جزیہ سے بچنے کے لئے اسلام قبول کر لیا ہوگا۔ زمانۂ بعد میں یعنی قریب نویں صدی مسیحی سے لے کر آگے کو مسیحیوں کی مالی حالت نے انہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا ہوگا لیکن بنو امیہ کے عہد میں اُن کی یہ حالت نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ سلطنت کے بہتیرے بڑے عہدے ان کی تعلیمی حالت کے بہتر ہونے کے سبب مستقل طور پر اُن کے ہی لئے تھے۔ یہ اغلب ہے کہ مسلمانوں کی پہلی فتح کے وقت سے بہتیرے مسیحیوں کو اسلامی فوج کی کامیابی نے یہ یقین دلا دیا تھا کہ مذہب اسلام سے خدا راضی ہے اور جیسے جیسے مسیحیوں کا اثر اور شمار کم ہوتا گیا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دلیل اور بھی تقویت پکڑتی گئی۔

بنو امیہ کے پورے دورِ حکومت میں جھگڑے رہے اور اکثر خانہ جنگی بھی ہوئی۔ خارجی اب تک تنگ کرتے رہے اور اس کے علاوہ ایک فرقہ شیعہ کا تھا جو علی کے خاندان کا طرف دار تھا اور دوسرا فریق خاندان عباسیہ کی حمایت میں تھا مگر جس بغاوت نے بنو امیہ کا ستیاناس کیا خراسان میں شروع ہوئی۔ ابو مسلم نامی ایک شخص اُن کا سرغنہ بن گیا اور اُس نے اعلان کیا کہ خاندان ہاشم کی حمایت میں وہ لڑ رہا ہے۔ علی اور عباس دونوں کا جدِ اعلیٰ ہاشم تھا اور اس لئے ابو مسلم کے ساتھ دونوں فریق کے لوگ ہو گئے۔ بہت سے لوگ اس بغاوت میں شریک ہوئے کیونکہ بنو امیہ سے وہ تنگ آ گئے تھے کہ جو اُن کے خیال میں محض ملکی فرماں روا تھے اور جنہیں اسلام کی کوئی پروا نہیں تھی۔ لیکن بغاوت کا جو کچھ نتیجہ ہوا اس سے شیعہ لوگوں کو یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی ہوگی کہ تخت سلطنت پر علی کی نسل کا کوئی فرد نہیں بٹھایا گیا۔ بلکہ خاندان عباس کا۔

(۲) خلفاءِ بنو عبّاسیہ
سنہ ۷۵۰ء سے سنہ ۱۲۵۰ء

عربوں کی طاقت کو درحقیقت بنو امیہ کی بربادی کے ساتھ زوال آنا شروع ہو گیا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح ایرانی عربوں کے دعاوی کے مقابلہ میں رفتہ رفتہ زور پکڑ رہے تھے۔ شیعہ تحریک ابتدا میں اس قدر مذہبی فرقہ نہیں تھا جس قدر کہ عراق کا یہ ایک سیاسی گروہ تھا۔ نئے دعاوی کا اظہار ایک حدیث سے ہوتا ہے جو بلاشبہ اسی زمانہ کی موضوع ہے جس میں لکھا ہے "کسی ایرانی کو حقیر نہ سمجھو کیونکہ کوئی ایرانی کی تحقیر نہیں کرتا مگر خدا اس سے انتقام لیتا ہے۔ اس جہان میں اور آنے والے جہان میں بھی"۔ ایرانیوں ہی کی مدد سے خاندانِ عباسیہ نے خلافت حاصل کی تھی اور اگرچہ خلفاء خود عرب تھے لیکن اصل طاقت ایرانیوں کے ہاتھ میں تھی۔ اس سبب سے دارالخلافت دمشق سے ہٹا کر عراق میں قائم کیا گیا۔ جہاں پہلے کوفہ دارالخلافت تھا۔ مگر وہاں سے جلد بغداد کو منتقل ہو گیا اور بنو عباسیہ کی خلافت کے خاتمے تک یہیں رہا۔

بہتیرے جن کے خیال میں بنو امیہ کی خلافت بے دینی کی حکومت تھی۔ عباسی دَور کے آغاز میں اُن کے دل اسلام کے لئے نئی امیدوں سے بھر گئے ہوں گے۔ چنانچہ ہم ایک حدیث میں پڑھتے ہیں کہ "خلافت میرے چچا (عباس) کی نسل اور میرے باپ کی قوم میں رہے گی۔ یہاں تک کہ وہ مسیح کے حوالہ کر دیں گے۔" عباسیوں کے ہاتھ میں خلافت اور اختیار کے آتے ہی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے شروع ہو گئے۔

سب سے پہلے اسپین نے خودمختاری کا اعلان کیا۔ اسپین نے

کبھی بھی عباسی خلفاء کو نہیں مانا۔ بنو امیہ کا ایک شخص عبدالرحمٰن اس خونریزی سے بچ کر جو اُس کے خاندان پر اُن کی تنزّلی کے بعد کی گئی تھی افریقہ کو بھاگ گیا اور وہاں اسپین کے حالات اُس نے معلوم کئے۔ آخرکار اسپین کے مسلمانوں نے اپنا امیر منظور کر کے اُسے قبول کیا۔ اسپین میں امیہ سلطنت کی جو بنیاد اُس نے ڈالی قریب ڈھائی سو سال تک قائم رہی چونکہ ہم پھر اسپین کا ذکر نہیں کرینگے اس لئے یہاں اس قدر ذکر اور کر دیا جاتا ہے کہ اسپین کے مسلمان اور یہودی مشرق سے یونانی فلسفہ لے کر آئے جسے یورپ فراموش کر چکا تھا لیکن جسے ایشیا میں پہلے سریانی بولنے والے مسیحیوں نے اور پھر مسلمانوں نے محفوظ کر رکھا تھا۔ اسپین میں فلسفہ کی درس گاہیں قائم کی گئیں جہاں سے علم کی شمع باقی تمام یورپ میں روشن کر کے پھیلائی گئی اور یوں یورپ میں وہ زمانہ آیا جو علمیت کے دور کے بحال ہونے کا زمانہ کہلاتا ہے۔

اسپین اور ملکوں کی نسبت بغداد سے زیادہ دُور تھا اس لئے خلیفہ کے علاقوں میں سب سے پہلے ہی علیحدہ ہُوا۔ اس کے بعد جلد ہی شمالی افریقہ الگ ہو گیا۔ اس کے انتہائی مغربی کنارے پر جو اب مراقش کہلاتا ہے۔ ۷۸۸ء میں پہلے خاندان ادریسیہ نے ایک خودمختار ریاست قائم کی۔ بارہ برس بعد ایک اور خاندان نے جو اغلبی کہلاتا تھا شمالی افریقہ کے سارے حصہ پر قبضہ کیا۔ برائے نام یہ خلیفۂ بغداد کے مقرر کئے ہوئے گورنر تھے مگر درحقیقت خودمختار بادشاہوں کی طرح یہ حکومت کرتے تھے اور بحیرہ میڈیٹرینین کے سمندری ڈاکو کے نام سے خاص طور مشہور تھے۔ انہوں نے کئی ایک جزیروں پر قبضہ کر لیا تھا کہ جن میں سسلی جیسا خاص جزیرہ بھی شامل تھا۔ اب جب ہم ایران کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو یہاں اس

اور اے پیغمبر اس میں مصلحت یہی ہے کہ ہم وقتاً فوقتاً اس کے ذریعے تمہارے دل کو تسکین دیتے ہیں۔" (سورۃ الفرقان رکوع ۳ آیت ۳۴۔ مقابلہ کرو سورہ بنی اسرائیل آیت ۱۰۷) بلاشبہ یہ حقیقت ہے کہ قرآن کی بہت سی آیتیں ہنگامی ہیں یعنی اُن کا تعلق خاص حادثہ یا کسی خاص ضرورت سے ہے۔ ڈیڑھ سو سال پیشتر سیل نے قرآن کے اپنے انگریزی ترجمے کے دیباچہ میں نہایت موزوں طور پر اس طرح وقتاً فوقتاً قرآن کے نازل ہونے کا بیان کیا ہے کہ "جب کوئی ایسی بات پیش آجاتی کہ جس سے محمدؐ صاحب کو گھبراہٹ اور حیرت کا سامنا کرنا پڑتا اور جس کا حل وہ کسی طرح نہ کر سکتے تو وہ کسی نئے الہام کی طرف رجوع کرتے جو ہر باریک مسئلہ کا اُن کے لئے بے خطا علاج تھا۔"

محمدؐ صاحب وہ تمام باتیں جو وحی سمجھی جاتی تھیں مختلف طور پر اُن کو لکھوا لیتے تھے۔ بعض اوقات کوئی کاتب اس کام کے لئے رکھ لیا جاتا تھا۔ خاص کر زید ابن ثابت۔ قرآن کے حصے "کھجور کی پتیوں۔ چمڑوں۔ پتھروں یا کسی جانور کے کندھے کی چوڑی ہڈی پر" لکھ لیتا تھا۔ لیکن زیادہ تر حصہ بجائے لکھے جانے کے صحابہ کے حافظہ میں محفوظ تھا۔ حفظ کر لینا زیادہ مفید تھا کیونکہ اسلام کے ابتدائی دنوں ہی میں قرآن کی کسی عبارت کا حفظ پڑھنا گویا عبادت کا ایک جزو بن گیا تھا لیکن اگرچہ عرب کا حافظہ نہایت تیز تھا تاہم غلطی سے بری نہیں تھا یہاں تک کہ بعض اوقات خود محمدؐ صاحب کے حافظہ نے اُن کو دھوکا دیا (دیکھو سورۃ بقر آیت ۱۰۰)

ہجرت کے گیارھویں سال یعنی محمدؐ کی موت کے دوسرے ہی برس ایسی صورت پیش آئی کہ جس سے ابوبکر اور عمر دونوں کو قرآن کی حفاظت کی فکر پڑ گئی۔ اس سال جنگ یمامہ میں بہت سے مسلمان سپاہی جو قاری بھی تھے مارے

گئے۔ اس خوف سے کہ خدا کی کتاب ضایع نہ ہو جائے محمدؐ صاحب کے ان دونوں صحابیوں نے زید ابن ثابت کو قرآن کے جمع کرنے کا حکم دیا۔ اس نے کیسا بڑا کام اپنے ذمہ لیا! حدیث میں ذکر ہے کہ اُس نے کھجور کے پتوں چمڑوں۔ ہڈیوں اور لوگوں کے دلوں سے اسے جمع کیا۔"

مگر یہ کون کہہ سکتا ہے کہ سب کا سب محمدؐ صاحب نے سُنایا تھا اور سب کا سب جو لوگوں نے حفظ کر لیا تھا زید جمع کر سکا اور کہ بعض قاری کی وفات سے کوئی جزء قرآن کا بالکل جاتا نہ رہا۔ بلکہ ایک حدیث جو عمر سے مروی ہے بتاتی ہے کہ آیت الرجم کہ جس میں زانیوں کو سنگسار کرنے کا حکم تھا محمدؐ صاحب کے زمانہ میں قرآن میں موجود تھی مگر موجودہ قرآن میں نہیں پائی جاتی۔ (دیکھو رسالہ آیت الرجم۔ مصنفہ ڈبلیو۔ ایچ۔ ٹی گیرڈنر۔ پی۔ آر۔ بی۔ ایس انارکلی، لاہور)

قرآن کی تدوین و تحفظ

محمدؐ صاحب کو جو پڑھنے کا حکم دیا گیا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ قرآن کے معنی ہیں پڑھنا۔ " پڑھ تو اپنے رب کے نام سے" (سورہ اقرا ۹۶:۱ پہلی آیت) اور اس لفظ کا اطلاق صرف پورے قرآن ہی نہیں بلکہ اس کے کسی حصہ پر بھی ہو سکتا ہے۔ (سورہ یوسف آیت ۲)

مسلمانوں میں اس کتاب کے لئے اور بھی نام مستعمل ہیں مثلاً فرقان الکتاب۔ یہ نام خود قرآن میں پائے جاتے ہیں لیکن یہ عام قاعدہ ہے کہ قرآن کا نام لیتے وقت کوئی اور صفت شریف یا مجید بھی نام کے ساتھ لگا دیتے ہیں جیسے قرآن شریف۔

نئے عہد نامہ سے قرآن ذرا ہی بڑا ہے اور اس میں ایسی یکسانیت

پائی جاتی ہے کہ جو نہ تو پُرانے عہد نامہ میں ہے اور نہ نئے میں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا منبع ایک ہی ہے اور ایک ہی دماغ کے غور و فکر کا نتیجہ معلوم پڑتا ہے

قرآن ایک سو چودہ مختلف چھوٹی بڑی سورتوں میں منقسم ہے۔ ان سُورتوں کے نام رکھے گئے ہیں اور شمار کے ذریعہ یہ نہیں معلوم کئے جاتے ہیں ہر سورۃ کا نام یا تو سورۃ کے ابتدائی الفاظ سے یا کسی مضمون سے یا کسی شخص کے نام پر جس کا ذکر اس میں آیا ہو رکھا گیا ہے۔ اُنتیس سورتوں کا آغاز چند حروف سے ہوتا ہے کہ جن کا مطلب پوشیدہ ہے۔ ہر سورۃ کے اوپر لکھا ہوتا ہے کہ یہ مکی ہے یا مدنی۔ پھر سورتوں کے شروع ہونے سے پیشتر یہ دعائیہ فقرہ لکھا ہوتا ہے بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ شروع ساتھ نام اللہ کے جو بڑا مہربان اور بخشش کرنے والا ہے۔ اور یہ فقرہ سوائے سورہ توبہ کے ہر سورت کے شروع میں آتا ہے۔ پھر ہر سورۃ آیتوں (نشانیوں) میں منقسم ہے

پُورے قرآن کو مہینہ کے تیس دنوں میں خصوصاً رمضان کے مہینہ میں ختم کرنے کی سہولت کی خاطر تیس برابر حصوں میں اس کی تقسیم کی گئی ہے۔ ان حصّوں کو عربی میں جز اور فارسی میں سیپارہ کہتے ہیں۔ پھر سیپارے رکوع میں منقسم ہیں کہ جس کے لفظی معنی جھکنے کے ہیں یہ قرآن کی اتنی آیتوں کا مجموعہ ہے کہ جتنی مسلمان نماز میں عموماً پڑھتے ہیں۔

عربی زبان ایسی واقع ہوئی ہے کہ اس میں قافیہ بندی کر لینا کچھ آسان ہے۔ عرب اکثر یہ طرز استعمال کرتے تھے اور قرآن میں کثرت سے اس کا استعمال ہوا ہے۔ اس کی آیتوں کا خاتمہ ایسے حروف اور حرکات پر ہوتا ہے کہ ان کے تلفظ ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں۔ قاری اس قافیہ بندی سے اپنی قرأت میں خوش الحانی پیدا کر لیتا ہے۔

بدقسمتی سے جس صورت میں قرآن عموماً پایا جاتا ہے اس کی سورتوں کی ترتیب باقاعدہ نہیں ہے۔ قرآن کی ابتدائی سورت کے بعد جو فاتحہ کہلاتی ہے سب سے بڑی سورۃ آتی ہے اور پھر آخر میں چھوٹی چھوٹی سورتیں ہیں کہ جن میں بارہ آیتوں سے بھی کم ہیں۔ اس قدر تو صاف ظاہر ہے کہ یہ ترتیب جان بُوجھ کر رکھی گئی ہے لیکن اس ترتیب میں نہ تو تواریخی تسلسل پایا جاتا ہے اور نہ ہی مضامین کا سلسلہ قائم ہے۔

حقیقتاً اب معلوم پڑتا ہے کہ زید کو قرآن کے جمع کرنے کا حکم ہُوا تو جیسے جیسے مصالحہ ملتا گیا مضمونوں کے سلسلہ کا خیال کئے بغیر اُس نے اُن کو اکٹھا کرنا شروع کیا اور یوں مدنی سُورتیں جو مکی سورتوں سے بعد کی ہیں اُن سے پہلے قرآن میں ملتی ہیں۔ فی الحقیقت آخری چھوٹی چھوٹی سُورتیں سب سے ابتدائی سُورتیں ہیں۔ اس کے علاوہ بعض آیتیں جو بلاشبہ مکی ہیں۔ مدنی سورتوں میں اور بعض مدنی آیتیں مکی سورتوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان ساری باتوں سے قرآن کو سمجھ کے ساتھ پڑھنا خاص طور سے مشکل ہو جاتا ہے۔

بہرحال اس کا دُوسرا رُخ بھی ہے۔ اگر ہمیں افسوس ہے کہ زید نے اپنے کام میں زیادہ آزادی اور فکر سے کام نہیں لیا تو ہمیں یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ اُس نے نہایت ہی دیانت داری سے کام کیا اور اس لئے بالجملہ موجودہ قرآن ایک بڑی حد تک معتبر کتاب ہے۔

لیکن جلد ہی زید کی خدمات کی پھر ضرورت پڑی۔ اُس کی تدوین سے قرآن کا متن تو مقرر ہو گیا تھا مگر اس کی قرائت مقرر نہیں ہوئی تھی۔ خلیفہ عثمان کے عہد میں مختلف لوگ قرآن کی خاص خاص عبارتوں کو مختلف طریقہ پر پڑھنے لگے اور ہر ایک اپنی ہی قرائت کو صحیح بتاتا تھا۔ خلیفہ کو اس بدنامی

کا علاج نہایت سختی سے کرنا پڑا۔ ان میں سے بعض اختلافات کا سبب یہ تھا کہ مختلف قبیلوں کے لوگ اپنی بولی میں بعض الفاظ خاص معنی میں ادا کرتے تھے کہ جس کے باعث تفسیر میں اختلافات پڑ گئے اور پھر جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ علاوہ اس کے یہ بھی معلوم پڑتا ہے کہ خود محمدؐ صاحب نے کبھی کبھی مختلف لوگوں کو ایک ہی عبارت مختلف قرأت کے ساتھ بتائی تھی۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ "قرآن سات قرأت پر نازل ہوا تھا۔" (مشکوٰۃ المصابیح۔ کتاب ۸، باب ۳، فصل ۱)

ان جھگڑوں سے لوگوں کی نااتفاقیوں کو دیکھ کر عثمان مضطرب ہوئے اور حذیفہ کے کہنے سے بیچ میں پڑ کر جھگڑا مٹانے پر راغب ہوئے۔ چنانچہ بیان ہے کہ حذیفہ نے آکر عثمان سے کہا۔ ان لوگوں کو سمجھاؤ قبل اس کے کہ اپنی پاک کتاب میں اس طرح اختلافات کرنے لگیں جس طرح یہودی اور مسیحی کرتے ہیں۔ اس لئے عثمان نے ایک مجلس مقرر کی جس میں زید اور تین اور قریش کے لوگ تھے۔ تاکہ متن قطعی طور پر مقرر کر کے اس کی قرأت کا قریش کے محاورہ میں ہونا ٹھہرائیں۔ جب یہ نسخہ تیار ہو گیا تو عثمان نے اس کی ایک ایک جلد سلطنت کے تمام خاص شہروں میں بھیج دی اور حکم دیا کہ اس سے پیشتر کے تمام نسخے جلا ڈالے جائیں۔ عثمان کا یہ ترمیم شدہ نسخہ ۶۶۰ء کا ہے اور اب تک یہی معتبر سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ کہنا صحیح ہے کہ بارہ سو برس سے کسی اور کتاب کا متن اپنی اصلی حالت پر نہیں رہا ہے تو غالباً یہ بھی صحیح ہے کہ کسی اور کتاب کی اس سختی سے ترمیم بھی نہیں ہوئی ہے۔

سورتوں کی دوبارہ ترتیب کی کوشش

قرآن کی تدوین میں چونکہ سورتوں کی ترتیب باقاعدہ نہیں رکھی گئی تھی اس لئے مسلمانوں اور مسیحیوں نے تواریخی سلسلہ کے لحاظ سے اس کی سورتوں کو دوبارہ ترتیب دینے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً جلال الدین سیوطی اور مسیحیوں میں مسٹر راڈویل۔ قرآن کے مضامین کی سب سے موافق تقسیم دو خاص حصوں میں ہوتی ہے۔ یعنی اوّل وہ حصے کہ جن کا مکہ میں نازل ہونا کہا جاتا ہے اور جو اس لئے مکی کہلاتے ہیں۔ دوم وہ حصے کہ جن کے لئے کہا جاتا ہے کہ مدینہ میں نازل ہوئے تھے اور جو اس اعتبار سے مدنی کہلاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ لوگ اب یہ اصول ماننے لگے ہیں کہ قرآن کی صحیح تفسیر صرف محمدؐ صاحب کی زندگی کے حالات کے ساتھ ساتھ مقابلہ کر کے کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ علماء متاخرین میں سے کسی نے کہا ہے کہ "اللہ کی کتاب محمدؐ صاحب کا روزنامچہ ہے۔"

قرآن کی یہ ترتیب نہ صرف اس کے مطالعہ میں سہولت پیدا کر دیتی ہے بلکہ محمدؐ صاحب کے کارنامے اور اسلام کی ترقی کا پتہ بھی اس سے لگ سکتا ہے ہمیں اس سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ سورتوں کا تھوڑا تھوڑا کر کے جو نازل ہونا کہا جاتا ہے اس سے سورتیں اسلام کی ابتدائی اور نئی حالات کے بالکل مطابق بیٹھ جاتی ہیں۔

جب قرآن کی سورتوں کا اس ترتیب سے مطالعہ کیا جاتا ہے تو ابتدائی سورتوں میں وہ بلند الفاظ پائے جاتے ہیں جو مدنی سورتوں میں شاذ و نادر ہیں اور ان میں خدا کی قدرت اور ہمہ جا حاضری اور توحید کا ذکر زیادہ

پایا جاتا ہے علاوہ اس کے ان ابتدائی حالات سے محمدؐ صاحب کے خیالات کی بلندی بھی پائی جاتی ہے اور اُن کے اس یقین کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے مامور کئے گئے ہیں (مقابلہ کرو سورۃ المدثر سورۃ الانشراح)

یہ ذیل کی ابتدائی آیتیں قابلِ غور ہیں۔

"آفتاب اور اُس کی دھوپ کی قسم اور آفتاب کے دغروب ہوئے پیچھے جب چاند نکلتا ہے اُس کی قسم اور دن کی قسم جب کہ وہ آفتاب کو نمایاں کرے اور رات کی قسم جب وہ آفتاب کو چھپالے اور آسمان کی اور اُس کی ذات کی قسم جس نے اُس کو بنایا ہے اور زمین کی اور اُس کی ذات کی قسم جس نے اُس کو بچھایا ہے اور انسان کی اور اُس کی ذات کی قسم جس نے پھر اُس کی بدکاری اور پرہیزگاری دونو باتیں اُس کو سمجھادیں۔ غرض ہم کو اُن چیزوں کی قسم جس نے اپنی رُوح کو شرک اور اخلاقِ بد کی گندگی سے پاک کیا وہ ضرور اپنی مُراد کو پہنچا اور جس نے اس کو دبادیا وہ ضرور گھاٹے میں رہا (سورۃ الشمس ۱۔ ۱۰ آیات)

اِن ابتدائی دنوں میں ہم محمدؐ صاحب کو اپنے ہم وطنوں کی بُت پرستی کی مذمت کرتے اور اُن کی نافرمانی پر اُن کو جہنم کے عذاب سے ڈراتے ہوئے پاتے ہیں (مقابلہ کرو سورۃ المرسلٰت آیت ۱۱۱ و سورۃ الہمزہ آیت ۹)

پھر قرآن میں اِن مضامین کے مقابل میں ایسے مقامات بھی ہیں کہ جہاں اُن کے مظلوم پیروؤں کی ہمت بڑھائی گئی ہے اور اُن سے اجر کا وعدہ کیا گیا ہے مثلاً بہشت کا واضح بیان کہ جو اُن کو ملے گی (سورۃ النبا و سورۃ واقعہ)

قرآن کی ان ابتدائی سورتوں میں محمدؐ صاحب نے اپنے فریبی ہونے کے الزام کی بھی تردید کی ہے۔ اور جو اس کے الہامی ہونے پر شک کرتے

ہیں اُن کو دھمکایا ہے (سورۃ المرسلٰت و سورۃ الفرقان آیات ۵ - ۶)
اس موقعہ پر گذرے انبیاء کا ذکر آتا ہے کہ جس سے یہ دکھانا مقصود ہے
کہ اُن کی بھی تحقیر کی گئی تھی اور ان پر بھی فریب کا الزام لگایا گیا تھا (سورۃ الشعراء)
محمدؐ صاحب کے مکی زمانہ کا آخری حصہ جب کہ قریشیوں نے اُن کا مقاطعہ
کر کے اُن کو سخت تکلیف دی تھی اس کا اشارہ اس قسم کی آیتوں میں پایا
جاتا ہے " اے پیغمبر! قرآن جو تمہارے پروردگار کے ہاں سے تمہاری طرف
وحی کے ذریعہ بھیجا گیا اسی کی ہدایت پر چلے جاؤ"۔ (سورۃ الانعام رکوع
۱۳ - آیت ۱۰۶)
مدنی سورتیں کہ جن کا مجموعہ پورے قرآن کی تہائی سے کچھ زیادہ
ہے ہماری توقع کے مطابق مکی سورتوں سے مختلف ہیں۔ ان میں عقائد پر
کم زور ہے اور احکام و شرائع کا زیادہ ذکر ہے کہ جن باتوں پر مسلمانوں کو
روزانہ اپنی زندگی میں عمل کرنا ہے۔ واعظ کی سرگرم اور فصیح تقریر کی جگہ ایسے
حکم نامے لے لیتے ہیں جو ایک نئی سلطنت کے معاملات کے مدبّر کے
جاری کئے ہوئے ہیں اب محمدؐ صاحب کو جماعتی زندگی۔ خاندانی باتیں صلح اور
جنگ کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ قرآن کے اس حصّہ کو کتاب کا شرعی حصّہ
کہنا بے محل نہ ہوگا۔
قرآن کے اس مدنی حصہ میں محمدؐ صاحب کی یہودیوں کے ساتھ کشمکش
کا ذکر اسی نمایاں حیثیت سے آیا ہے کہ جس طور سے ابتدائی سورتوں میں اہل
قریش کے ساتھ جھگڑوں کا ذکر ہے۔ مکہ میں محمدؐ صاحب کا لہجہ یہودیوں کے
ساتھ دوستانہ تھا جیسے کہ (سورۃ العنکبوت کی ۴۵ آیت رکوع ۵) میں لکھا
ہے کہ " مسلمانو۔ اہلِ کتاب کے ساتھ جھگڑا نہ کیا کرو مگر ایسی طرح پر کہ وہ نہایت

ہی عُمدہ اور شائستہ ہو۔" لیکن مدینہ میں اس بات سے تنگ آکر کہ یہودیوں کو اُن کی نبوّت اُن کے اپنے صحیفوں میں نہیں ملتی یا ایسی نبوّت کے موجود ہونے کا وُہ اقرار نہیں کرتے محمدؐ صاحب نے اُن پر غصّہ ہو کر یہ الزام لگایا کہ وہ سچائی کو چھُپاتے ہیں۔ چنانچہ دیکھو سورۃ البقر آیت ۲۷ سورۃ عمران آیت ۶۴ و ۲۴ سورہ اعراف آیت ۱۶۱ اور جب معاملہ حد سے بڑھ گیا۔ تو اُن پر آنے والی حالت کا نہایت ہولناک الفاظ میں یوں اظہار کیا گیا "اے اہل کتاب قرآن جو ہم نے نازل فرمایا ہے .... اس پر ایمان لے آؤ مگر اس سے پہلے کہ منہ بگاڑ کر ہم اُلٹے گدیوں میں لگا دیں۔" (سورۃ النسا آیت ۵۰ رکوع ۷، اور پھر اُسی سورہ کی ۵۹ آیت میں لکھا ہے "جن لوگوں نے ہماری آیتوں سے انکار کیا ہم اُن کو قیامت کے دن دوزخ میں لے جا داخل کریں گے۔ جب ان کی کھالیں گل جائیں گی تو ہم اس غرض سے کہ وہ عذاب کا مزہ اچھی طرح چکھیں گلی ہوئی کھالوں کی جگہ اُن کی دُوسری نئی کھالیں پیدا کر دیں گے۔"

قرآن کی ان مدنی سورتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ چونکہ قریشیوں کے ساتھ محمدؐ صاحب کے تعلقات بگڑے ہوئے تھے اور اہل عرب کے دیگر قبائل کا مُسلمانوں کے ساتھ دوستانہ تعلق رکھنا مشکوک تھا اس لئے ایسی حالتوں نے مسلمانوں کو جلد جنگ کی اجازت دے دی چنانچہ محمدؐ صاحب نے اب اعلان کر دیا کہ "مسلمانو! تم پر جہاد فرض کیا گیا اور وہ تم کو ناگوار بھی گزرے گا۔" سورۃ البقر آیت ۲۱۲ رکوع ۲۶) اور "مسلمانو خُدا کی راہ میں خُدا کے دشمنوں یعنی کافروں سے لڑو۔" (سورۃ البقر آیت ۲۴۵ رکوع ۳۲) سورۃ الاحزاب کا زیادہ تر حصہ محمدؐ صاحب کے خانگی واقعات سے

تعلق رکھتا ہے جس میں البتہ بہت زیادہ ذکر اُن کی بیویوں کا ہے۔ (دیکھو سورۃ الاحزاب آیت ۴۹) اسی سورۃ میں جملہ محمدؐ الرسول اللہ جو نہایت عام طور پر مستعمل ہے آیا ہے۔ مکہ میں انہوں نے اس بات پہ زور دیا تھا کہ وہ ایک صاف گو" ڈرانے والے ہیں (سورۃ الملک آیت ۲۶) لیکن مدینہ میں اُنہوں نے مطالبہ کیا کہ اُن کی خاص عزت کی جائے۔ چنانچہ آپ نے کہا "مت پکارو رسول کو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو" (سورۃ النور آیت ۶۳) نافرمانی صرف خدا ہی کے خلاف قصور کرنا نہیں ہے بلکہ" اُس کے رسول" کے خلاف بھی (سورۃ الاحزاب آیت ۳۶)

قرآن کے مضامین اور اُن کے مآخذ

قرآن کے مضامین کا عام مقصد ایسا معلوم پڑتا ہے کہ عرب کے تین مختلف مذاہب کے پیروؤں کو کہ جن میں زیادہ تر بُت پرست اور باقی یہودی اور مسیحی تھے ایک واحد زندہ خدا کے علم اور بندگی متحد کر دینے کا تھا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے خاص قوانین اور رسوم نافذ کئے گئے کہ جن میں کچھ نئے اور کچھ پُرانے تھے اور اس متحدہ جماعت کی سرداری پر محمدؐ صاحب فائز تھے کہ جن میں پوپ اور بادشاہ دونو کے منصب پائے جاتے ہیں۔ اور جن کی اطاعت ہر ایک پر کرنی فرض ہے کہ جنہیں خدا نے سچے مذہب کے قیام کے لئے کسی نئے مذہب کے جاری کرنے کے لئے نہیں بھیجا۔

مذکورہ بالا بیان کی قرآن کے مضامین سے پورے طور پر تائید ہوتی ہے۔ خصوصاً یہ دکھایا جا سکتا ہے کہ کس طرح محمدؐ صاحب نے اپنے دینی طریقہ میں نہ صرف ایسے ارکانِ ایمان بلکہ دستورات و رسوم بھی داخل کر

لئے ہیں کہ جو عرب کے اُن مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں کہ جن کا ذکر ہو چکا ہے بے شک قرآن اسی حقیقت پر گواہی دیتا ہے کہ محمدؐ صاحب کے معترضین نے اُن میں اس قسم کی عادت دیکھی اور اُن پر یہ الزام لگایا کہ وہ اَوروں سے نقل کرتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں لکھا ہے اور "کافر قرآن کی نسبت کہتے ہیں کہ یہ تو بڑا جھوٹ ہے۔ جس کو اس شخص یعنی پیغمبر نے اپنے دل سے گھڑ لیا ہے اور دوسرے لوگوں نے اس گھڑت میں اس کی مدد کی۔ ایسی بات کہنے سے یہ لوگ بڑے ہی ظلم اور سر تا سر جھوٹ کے مرتکب ہوئے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن اگلے لوگوں کے ڈھکوسلے ہیں جس کو اس شخص نے کسی سے لکھوا لیا ہے اور وہی صبح و شام اس کو پڑھ پڑھ کر سنائے اور یاد کرائے جاتے ہیں۔" (سورۃ الفرقان ۵ و ۶ آیات مقابلہ کرو سورۃ النحل آیات ۱۰۳ اور ۱۰۵ رکوع ۱۵۔ سورۃ الطور آیت ۳۳ رکوع ۲۔ سورۃ الانبیاء آیت ۵) بہر حال محمدؐ صاحب نے ان الزامات کی تردید کی ہے اور اُن کے جواب میں کہا کہ یہ تو جبرئیل کی وساطت سے "نازل کیا گیا" ہے۔

(۱) قرآن میں بہتیری باتیں بُت پرستوں سے ماخوذ ہیں:۔

(۱) عرب کے بُت پرستوں سے محمدؐ صاحب نے بہت سے رسوم لئے کہ جن کا تعلق اب حج سے ہے۔ (دیکھو سورۃ الحج آیت ۲۷) ایسے رسوم کے اسلام میں شامل کرنے سے بعضوں کو جو حیرانی ہوئی ہے اُس کی مثال عمر خلیفہ دوم کے اس قول میں ملتی ہے جو حجر اسود کے بوسہ دیتے وقت انہوں نے کہا تھا۔ "تحقیق کہ میں جانتا ہوں کہ تُو ایک پتھر ہے اور دنیا میں تُو نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتا! اگر میں پیغمبر کو بوسہ

دیتے ہوئے تجھے نہ دیکھتا تو میں تجھے بوسہ نہ دیتا" (مشکوٰۃ المصابیح۔ کتاب ۱۱ باب ۲ فصل ۲)

(ب) ایران کے زرتشتیوں سے محمدؐ صاحب نے کچھ تغیر و تبدل کر کے بہشت و دوزخ۔ جزا و سزا کا تصور لیا۔ اور انہی سے جنت کی حوروں اور جنات کے قصے بھی ماخوذ ہیں۔

(۲) بہت سی باتیں یہودیوں سے ماخوذ ہیں۔

قرآن کے بہتیرے مقامات میں عہد قدیم کے بیانات کے ساتھ ایک عجیب قسم کی مطابقت اور ساتھ ہی غیر مطابقت بھی پائی جاتی ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ محمدؐ صاحب کا تعلق ایسے یہودیوں کے ساتھ تھا جو خود عہد عتیق کے استعمال کرنے کے اس قدر عادی نہیں تھے کہ جس قدر تالمود اُن کے استعمال میں رہتی تھی جو محمدؐ صاحب سے سو برس پیشتر مکمل ہو چکی تھی اور اُن کے زمانہ میں یہودی مدرسوں کی تعلیم کی بنیاد تالمود کی غیر معتبر روایتوں پر تھی محمدؐ صاحب نے بائبل کے بیانات کے بجائے انہیں روایتوں کو سُنا ہو گا قرآن میں اس حقیقت کی ایک سے زیادہ مثال موجود ہے۔ مثلاً ہابل و قابل کا بیان (سورۃ المائدہ آیت ۳۰ - ۳۵) جہاں ذکر ہے کہ ایک کوا بھیجا گیا کہ جس نے پنجوں سے زمین کرید کر قابل کو دکھایا کہ اپنے بھائی کے جسم کو کس طرح دفن کرے۔ پیدائش کی کتاب میں ایسا کوئی بیان موجود نہیں ہے مگر تالمود کی کتاب "پیر کے ابی البعرز" کے اکیسویں باب میں ذکر ہے کہ قابل کو نہیں بلکہ آدم کو دفن کرنے کا طریقہ کوے نے سکھایا۔ سورۃ کی سورۃ ابراہیم (سورہ ابراہیم) اور یوسف (سورہ یوسف) کے ذکر کے بیان میں مخصوص ہیں۔ اوّل الذکر کے متعلق بار بار قرآن میں آیا ہے کہ چونکہ بتوں کو سجدہ کرنے سے انکار کیا اس لئے وہ آگ میں ڈالے گئے (والصفت

رکوع ۳ سورۃ الانبیاء رکوع ۵ سورۃ العنکبوت رکوع ۳) اب یہ عجیب بیان بھی یہودیوں کی ایک کتاب میں جو "تارگم جوہنتھان" کہلاتی ہے۔ پیدائش ۱۱باب ۲۸آیت اور ۱۵باب ۷آیت کے سلسلہ میں پایا جاتا ہے جہاں یہودی مصنف نے کسدیوں کے اوؔر سے آگ سمجھا۔ لفظ اوؔر کے لفظی معنے تو آگ کے ہیں لیکن یہاں یہ ایک مقام کا نام ہے۔ ابراہیم کا بُت کو سجدہ نہ کرنے کے سبب آگ میں ڈالے جانے کا باقی واقعہ جو تارگم میں پایا جاتا ہے وہ یہودی مصنف کی اپنی اختراع ہے پھر بھی قرآن میں یہ پورا قصہ شامل کیا گیا ہے!۔

علاوہ ان کے ایسے الفاظ کہ جو عبرانی سے ماخوذ ہیں قرآن میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً توریت۔ جہنم۔ سبت۔ سکینہ۔

آج کل کے تعلیم یافتہ مسلمان جیسے لنڈن کے مرحوم سید امیر علی اور کلکتہ کے پروفیسر خدا بخش مرحوم خود مانتے ہیں کہ محمدؐ صاحب نے بہت کچھ باتیں ایسے مآخذ سے لے کر قرآن میں شامل کی ہیں کہ جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے

(۳) ان مآخذ مذکور کے بالمقابل تعجب ہوتا ہے کہ مسیحی ماخذ سے قرآن میں کم لیا گیا ہے اور جو کچھ ہے اُس کا زیادہ تر حصہ غیر معتبر مسیحی روایتوں سے ماخوذ ہے۔ اس کا بڑا ثبوت خداوند مسیح کی والدہ مقدسہ حضرت مریم کے بیان میں پایا جاتا ہے۔ آپ کے بچپن کے زمانہ کی وہ کہانی جس میں ذکر ہے کہ یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ آپ کا کفیل کون ہو۔" قرعہ ڈالا گیا (سورۃ آل عمران ۳۲۔ ۳۹ آیات)، کتاب "یعقوب کی پروٹاوینجلیم" اور ایک قبطی تواریخ مریم میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ پھر یہ ذکر کہ آپ کو دردِ زہ کھجور کے ایک درخت کے نیچے لگا۔ (سورہ مریم ۲۲۔ ۲۵ آیات)

اس کہانی کا ایک حصہ ہے جو ایک غیر معتبر روایتی کتاب تواریخ پیدائش مریم اور طفولیت مسیح میں پائی جاتی ہے۔

تثلیث اور واقعۂ صلیب کے قرآنی بیان میں غالباً ناسطک فرقہ کی بدعتی تعلیم کا اثر پایا جاتا ہے۔

قرآن کی چند خصوصیات

(۱) کتب سابقہ۔ یہودیوں اور مسیحیوں کے ساتھ محمدؐ صاحب کی واقفیت اور ابتداءً اُن کے دل میں اُن لوگوں کی عزت کے باعث کہ جنہیں اہل کتاب کا امتیازی خطاب اُنہوں نے دے رکھا تھا اُن کی کتب مقدسہ کو قرآن میں ممتاز جگہ حاصل ہے۔ قرآن ظاہر کرتا ہے کہ وہ کتابیں "خدا کی دی ہوئی ہیں۔" (سورۂ السجدہ آیت ۲۳ سورۂ بنی اسرائیل آیت ۵۶ سورۂ المائدہ آیت ۵۰) وہ نور اور ہدایت لوگوں کے لئے ہے۔ (سورۂ الانعام آیت ۹۱) اور انہیں کتاب اللہ (سورۂ المائدہ آیت ۴۸) کلام اللہ (سورۂ البقرہ آیت ۷۰) کے ناموں سے پکارا ہے۔ لیکن جیسا کہ ابھی بتایا جا چکا ہے کہ محمدؐ صاحب کو ان کتابوں سے واقفیت نہیں تھی۔ مثلاً اُن کا یہ اعلان کرنا کہ کتب سابقہ میں اُن کی نسبت نبوت موجود ہے۔ (سورۂ الاعراف آیت ۱۵۰ سورۂ الصف آیت ۶) اُن کتابوں سے اُن کی عدم واقفیت کا ثبوت ہے اور چونکہ یہودیوں نے اُن کے اس دعوے کا بشدت انکار کیا۔ اس لئے ان پر وہ تمام الزامات لگائے گئے کہ جن کی رُو سے کتب مقدسہ کو بگاڑ کر پیش کرنے کا جرم اُن پر عائد کیا گیا (سورۂ البقرہ ۵۶ و ۲۷ و ۳ ۷ آیات۔ سورۂ آل عمران ۶۴ و سورۂ

نساء آیت ۴۸) اس سے محمدؐ صاحب کا مطلب یہ تھا کہ وہ اُن کو اس طور سے اپنی کتابوں کی باتیں بناتے ہیں کہ جس سے الفاظ کے اصل معنی کچھ اور ہی سمجھے جائیں۔

(۲) ابنیاءِ سابقین۔ قرآن میں ابنیاء کا بیان بہت ہے۔ جن میں سے بعض النبیوں کا ذکر بھی آیا ہے کہ جن کے متعلق اہل کتاب کو کوئی علم نہیں ہے۔ ان انبیاء کا بیان اور ان کے علاوہ اور دوسروں کا کہ جو شمار میں ہزاروں ہیں احادیث میں بھی ہے۔

محمدؐ صاحب کا خیال تھا کہ لوگوں کو ایمان کے معاملہ میں ہدایت کی ضرورت ہے اور یہ انبیا وقتاً فوقتاً وحی کے ساتھ بھیجے گئے تھے لیکن آدم سے لے کر محمدؐ صاحب تک یہ ہدایت فی الواقع یکساں رہی ہے۔

دوسرے الفاظ میں جس کا مطلب یہ ہے کہ محمدؐ صاحب کسی نئی تعلیم لانے کا دعوےٰ نہیں کرتے۔ ابنیاءِ سابقین کا ذکر قرآن میں ناگوار طور سے بار بار دوہرایا گیا ہے (ملاحظہ ہو سورہ مریم آیت ۵۰-۴۲ سورہ ص آیت ۵۴ وغیرہ سورۃ والصفٰت آیت ۷۷ اور اس سورہ کے دیگر مختلف مقامات۔ سورۃ الانعام ۸۳-۸۶ آیات) ان پیغمبروں کا لمبا سلسلہ ہے آدم سے لے کر نوح سے ہوتے ہوئے ابراہیم۔ لوط۔ اسماعیل موسیٰ تک اور پھر مسیح سے ہوتے ہوئے محمدؐ تک کہ جس کے لئے خدا کا رسول اور خاتم النبیین ہونا کہا گیا ہے۔ (سورۃ الاحزاب آیت ۴۰)

(۳) خداوند مسیح کا قرآنی بیان غور طلب ہے۔ کئی ایک ایسے مقامات قرآن سے پیش کئے جاسکتے ہیں کہ جن سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ خداوند مسیح کو قرآن میں وہ ممتاز جگہ دی گئی ہے کہ جو کسی اور پیغمبر یہاں تک کہ

محمد صاحب کو بھی نہیں دی گئی ہے۔ آپ "مریم کے پاکیزہ بیٹے" ہیں (سورۃ مریم آیت ۱۹ مقابلہ کرو سورۃ آل عمران کی آیت ۳۱ سے) آپ بزرگ ہیں اس دنیا میں اور آنے والے جہان میں (دیکھو سورۃ آل عمران آیت ۴۰) آپ اُس کے یعنی "خدا کے کلمہ" ہیں اور اُس کی طرف سے بھیجے ہوئے رُوح (سورۃ النساء رکوع ۲۳ آیت ۱۶۹) مسلمانوں میں پیغمبروں کے خطاب حسب ذیل ہیں۔ آدم صفی اللہ۔ یعنی خدا کے برگزیدہ نوح نبی اللہ یعنی خدا کے نبی۔ ابراہیم خلیل اللہ یعنی خدا کے دوست۔ موسیٰ کلیم اللہ یعنی خدا سے بات کرنے والے۔ محمد رسول اللہ یعنی خدا کے بھیجے ہوئے۔ مگر خداوند مسیح کو کلمۃ اللہ یعنی اللہ کا کلام کہا گیا ہے۔ (سورۃ النساء رکوع ۲۳)

تاہم عیسیٰ ابن مریم کا خطاب سب سے زیادہ خداوند مسیح کے لئے قرآن میں آیا ہے (مقابلہ کرو سورۃ المائدہ رکوع ۱۶ آیت ۱۱۶ سورہ صف رکوع ۱ آیت ۶ سورۃ النساء رکوع ۲۲ آیت ۱۵۷) گویا محمد صاحب کو خطاب ابن مریم کا سب سے زیادہ شہرت دے کر اُن سب خصوصیات کا انکار مقصود ہے کہ جو خداوند مسیح کے لقب ابن اللہ میں پائی جاتی ہے اور جو مسیحیوں میں رائج ہے۔ (دیکھو سورۃ الزخرف رکوع ۶ آیت ۵۹ سورۃ المائدہ رکوع ۱۰ آیت ۷۶۔ ۷۹)

قرآن خداوند مسیح کے صلیب پر مرنے کا بھی انکار کرتا ہے۔ قرآن کے بیان میں محض خداوند مسیح کی شباہت تھی جسے صلیب دی گئی یعنی غلطی سے کوئی اَور شخص مسیح سمجھا گیا اور مصلوب ہوا۔ (سورۃ النساء رکوع ۲۲ آیت ۱۵۷) حقیقت یہ ہے کہ یا تو محمد صاحب کلوری کی عجیب محبت

اور اے پیغمبر اس میں مصلحت یہی ہے کہ ہم وقتاً فوقتاً) اس کے ذریعہ تمہارے دل کو تسکین دیتے ہیں"۔ (سورۃ الفرقان رکوع ۳ آیت ۳۴ مقابلہ کرو۔ سورۃ بنی اسرائیل آیت ۱۰۷) بلاشبہ یہ حقیقت ہے کہ قرآن کی بہت سی آیتیں ہنگامی ہیں۔ یعنی اُن کا تعلق خاص حادثہ یا کسی خاص ضرورت سے ہے۔ ڈیڑھ سَو سال پیشتر سیل صاحب نے قرآن کے اپنے انگریزی ترجمے کے دیباچہ میں نہایت موزوں طور پر اس طرح وقتاً فوقتاً قرآن کے نازل ہونے کا بیان کیا ہے کہ "جب کوئی ایسی بات پیش آجاتی کہ جس سے محمد صاحب کو گھبراہٹ اور حیرت کا سامنا کرنا پڑتا اور جس کا حل وہ کسی طرح نہ کر سکتے تو وہ کسی نئے الہام کی طرف رجوع کرتے جو ہر باریک مسئلہ کا اُن کے لئے بے خطا عِلاج تھا"

محمد صاحب وہ تمام باتیں جو وحی سمجھی جاتی تھیں۔ مختلف طور پر ان کو لکھوا لیتے تھے۔ بعض اوقات کوئی کاتب اِس کام کے لِئے رکھ لیا جاتا تھا۔ خاصکر زید ابن ثابت۔ قرآن کے حِصّے "کھجور کی پتیوں۔ چمڑوں۔ پتھروں یا کسی جانور کے کندھے کی چوڑی ہڈی پر" لکھ لینا تھا لیکن زیادہ تر حِصّہ بجائے لِکھّے جانے کے صحابہ کے حافظہ میں محفوظ تھا۔ حفظ کر لینا زیادہ مفید تھا۔ کیونکہ اِسلام کے ابتدائی دنوں ہی میں قرآن کی کسی عبارت کا حفظ پڑھنا جماعتی عبادت کا ایک خاص جزو بن گیا تھا۔ لیکن اگرچہ عرب کا حافظہ نہایت تیز تھا تاہم غلطی سے بری نہیں تھا یہانتک کہ بعض اوقات خود محمد صاحب کے حافظہ نے اُن کو دھوکا دیا (دیکھو سورۃ بقر آیت ۱۰۰)۔

ہجرت کے گیارھویں سال یعنے محمد صاحب کی موت کے دُوسرے ہی برس ایسی صُورت پیش آئی کہ جس سے ابوبکر اور عمرؓ دونو کو قرآن کی حِفاظت کی فکر پڑ گئی۔ اس سال جنگ یمامہ میں بہت سے مسلمان سپاہی جو قاری بھی تھے مارے

گئے۔ اِس خوف سے کہ خُدا کی کتاب ضائع نہ ہو جائے۔ محمد صاحب کے اِن دو نو صحابیوں نے زید ابنِ حارث کو قرآن کے جمع کرنے کا حُکم دیا۔ اُس نے کیسا بڑا کام اپنے ذمہ لیا۔ حدیث میں ذکر ہے کہ اُس نے "کھجُور کے پتّوں۔ چمڑوں۔ ہڈیوں اور لوگوں کے دِلوں سے" اُسے جمع کیا ۔

مگر یہ کون کہہ سکتا ہے کہ سب کا سب جو محمد صاحب نے سُنایا تھا اور سب کا سب جو لوگوں نے حِفظ کر لیا تھا زید جمع کر سکا اور کہ بعض قاریوں کی وفات سے کوئی جُزوِ قرآن کا بالکل جاتا نہ رہا۔ بلکہ ایک حدیث جو عُمر سے مروّی ہے بتاتی ہے کہ آیت الرجم کہ جس میں زانیوں کو سنگسار کرنے کا حُکم تھا۔ محمد صاحب کے زمانہ میں قرآن میں موجُود تھی۔ مگر موجُودہ قرآن میں نہیں پائی جاتی (دیکھو رسالہ آیت الرجم مصنّفہ ڈبلیو۔ ایچ۔ ٹی گیرڈنر (پی۔ آر۔ بی۔ ایس۔ پریس انارکلی لاہور)

قرآن کی تدوین و تحفّظ

محمد صاحب کو جو پڑھنے کا حُکم دیا گیا تھا اُس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ لفظ قرآن کے معنی ہیں پڑھنا "پڑھ تُو اپنے ربّ کے نام سے" (سورہ اقراء ۹۶ پہلی آیت) اور اِس لفظ کا اِطلاق صِرف پُورے قرآن ہی پر نہیں بلکہ اس کے کسی حِصّے پر بھی ہو سکتا ہے۔ (سورۂ یُوسف آیت ۳)

مسلمانوں میں اِس کِتاب کے لئے اَور بھی نام مستعمل ہیں۔ مثلاً فرقان الکتاب۔ یہ نام خود قرآن میں پائے جاتے ہیں۔ یہ عام قاعدہ ہے کہ قرآن کا نام لیتے وقت کوئی اور صفت مثلاً شریف یا مجید بھی نام کے ساتھ لگا دیتے ہیں۔ جیسے قرآن شریف ۔

نئے عہد نامہ سے قرآن ذرا ہی بڑا ہے اور اِس میں ایسی یکسانیت پائی

جاتی ہے جو نہ تو پُرانے عہدنامہ میں ہے اور نہ نئے میں - اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا منبع ایک ہی ہے اور ایک ہی دماغ کے غور و فکر کا نتیجہ معلوم پڑتا ہے۔

قرآن ایک سَو چودہ مختلف چھوٹی بڑی سُورتوں میں منقسم ہے۔ ان سُورتوں کے نام رکھے گئے ہیں اور شمار کے ذریعہ یہ نہیں معلوم کئے جاتے ہیں - ہر سورۃ کا نام یا تو سورۃ کے اِبتدائی الفاظ سے یا کسی مضمون سے یا کسی شخص کے نام پر جس کا ذکر اس میں آیا ہو رکھا گیا ہے - اُنتیس سُورتوں کا آغاز چند حروف سے ہوتا ہے کہ جن کا مطلب پوشیدہ ہے - ہر سُورۃ کے اُوپر لکھا ہوتا ہے کہ یہ مکّی ہے یا مدنی - پھر سُورتوں کے شرُوع ہونے سے پیشتر یہ دُعائیہ فقرہ لکھا ہوتا ہے - بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم شرُوع ساتھ نام اللہ کے جو بڑا مہربان اور بخشش کرنے والا ہے اور یہ فقرہ سوائے سورہ توبہ کے ہر سُورت کے شرُوع میں آتا ہے - پھر ہر سورۃ آیتوں (نشانیوں) میں منقسم ہے -

پُورے قرآن کو مہینہ کے تیس[۳۰] دِنوں میں خصوصًا رمضان کے مہینہ میں ختم کرنے کی سہولت کی خاطر تیس[۳۰] برابر حصّوں میں اس کی تقسیم کی گئی ہے - اِن حصّوں کو عربی میں جُز اور فارسی میں سیپارہ کہتے ہیں - پھر سیپارے رکُوع میں منقسم ہیں - کہ جس کے لفظی معنی جھکنے کے ہیں - یہ قرآن کی اِتنی آئتوں کا مجمُوعہ ہے کہ جتنی مسلمان نمازیں عموماً پڑھتے ہیں ؀

عربی زبان ایسی واقع ہُوئی ہے کہ اِس میں قافیہ بندی کر لینا کچھ آسان ہے - عرب اکثر یہ طرز استعمال کرتے تھے اور قرآن میں کثرت سے اِس کا استعمال ہُوا ہے - اِس کی آئتوں کا خاتمہ ایسے حروف اور حرکات پر ہوتا ہے کہ اُن کے تلفّظ ایک دُوسرے سے مِلتے رہتے ہیں - قاری

اِس قافیہ بندی سے اپنی قرأت میں خوش الحانی پیدا کر لیتا ہے۔

بدقسمتی سے جس صورت میں قرآن عموماً پایا جاتا ہے اس کی سورتوں کی ترتیب باقاعدہ نہیں ہے۔ قرآن کی ابتدائی سورت کے بعد جو فاتحہ کہلاتی ہے سب سے بڑی سورت آتی ہے اور پھر آخر میں چھوٹی چھوٹی سورتیں ہیں۔ جن میں بارہ آیتوں سے بھی کم ہیں۔ اِس قدر تو صاف ظاہر ہے کہ یہ ترتیب جان بُوجھ کر رکھی گئی ہے۔ لیکن اِس ترتیب میں نہ تو تواریخی تسلسل پایا جاتا ہے اور نہ ہی مضامین کا سِلسلہ قائم ہے۔

حقیقتاً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب زید کو قرآن کے جمع کرنے کا حُکم ہؤا تو جیسے جیسے مصالحہ مِلتا گیا مضمون کے سِلسلہ کا خیال کئے بغیر اُس نے ان کو اکٹھا کرنا شروع کیا۔ اور یُوں مدنی سورتیں جو بعد کی ہیں ان سے پہلے قرآن میں مِلتی ہیں۔ فی الحقیقت آخر کی چھوٹی چھوٹی سُورتیں سب سے ابتدائی سُورتیں ہیں۔ اِس کے علاوہ بعض آیتیں جو بلاشُبہ مکّی ہیں۔ مدنی سُورتوں میں اور بعض مدنی آیتیں مکّی سُورتوں میں چھُپی ہُوئی ہیں۔ اِن ساری باتوں سے قرآن کو سمجھ کے ساتھ پڑھنا خاص طَور سے مُشکل ہو جاتا ہے۔

بہر حال اس کا دُوسرا رُخ بھی ہے۔ اگر ہمیں افسوس ہے کہ زید نے اپنے کام میں زیادہ آزادی اور فکر سے کام نہیں لیا تو ہمیں یہ بھی ماننا پڑتا ہے۔ کہ اُس نے نہایت ہی دیانتداری سے کام کیا اور اِس لئے بالجملہ موجُودہ قرآن ایک بڑی حد تک معتبر کتاب ہے۔

لیکن جلد ہی زید کی خدمات کی پھر ضرورت پڑی۔ اِس کی تدوین سے قرآن کا متن تو مقرّر ہو گیا تھا مگر اس کی قرأت مقرّر نہیں ہوئی تھی خلیفہ عثمان کے عہد میں مختلف لوگ قرآن کی خاص خاص عبارتوں کو مختلف

طریقہ پر پڑھنے لگے اور ہر ایک اپنی ہی قرأت کو صحیح بتاتا تھا۔ خلیفہ کو اِس بدنامی کا علاج نہایت سختی سے کرنا پڑا۔ ان میں سے بعض اختلافات کا سبب یہ تھا کہ مختلف قبیلے کے لوگ اپنی بولی میں بعض الفاظ خاص معنے میں ادا کرتے تھے۔ کہ جس کے باعث تفسیر میں اِختلاف پڑ گیا اور پھر جھگڑا اُٹھ کھڑا ہُوا۔ علاوہ اِس کے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خود محمد صاحب نے کبھی کبھی مختلف لوگوں کو ایک ہی عبارت مختلف قرأت کے ساتھ بتائی تھی۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ "قرآن سات قرأت پر نازل ہُوا تھا" (مشکوٰۃ المصابیح کتاب ۸: باب ۳ فصل)

اِن جھگڑوں سے لوگوں کی نااِتفاقیوں کو دیکھ کر عثمان مُضطرب ہُوئے اور حذیفہ کے کہنے سے بیچ میں پڑ کر جھگڑا مٹانے پر راغب ہُوئے چنانچہ بیان ہے کہ حذیفہ نے آکر عثمان سے کہا۔ "ان لوگوں کو سمجھاؤ۔ قبل اس کے کہ اپنی پاک کتاب میں اِس طرح اختلاف کرنے لگیں جس طرح یہودی اور مسیحی کرتے ہیں"۔ اِس لئے عثمان نے ایک مجلس مُقرّر کی جس میں زید اور تین اور قریش کے لوگ تھے۔ تاکہ متن قطعی طور پر مُقرّر کرکے اس کی قرأت کا قریش کے محاورہ میں ہونا ٹھہرائیں۔ جب یہ نُسخہ تیار ہو گیا تو عثمان نے اِس کی ایک ایک جلد سلطنت کے تمام خاص شہروں میں بھیجدی۔ اور حُکم دیا کہ اس سے پیشتر کے تمام نُسخے جلا ڈالے جائیں۔ عثمان کا یہ ترمیم شُدہ نُسخہ سنہ ۶۶۰ء کا ہے۔ اور اب تک یہی معتبر سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ کہنا صحیح ہے کہ بارہ سَو برس سے کسی اور کتاب کا متن اپنی اصلی حالت پر نہیں رہا ہے تو غالبًا یہ بھی صحیح ہے کہ کسی اور کتاب کی اِس سختی سے ترمیم بھی نہیں ہُوئی ہے۔

سُورتوں کی دوبارہ ترتیب کی کوشش

قرآن کی تدوین میں چونکہ سُورتوں کی ترتیب باقاعدہ نہیں رکھی گئی تھی۔ اِس لئے مسلمانوں اور مسیحیوں نے تواریخی سلسلہ کے لحاظ سے اس کی سُورتوں کو دوبارہ ترتیب دینے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً جلال الدین سیوطی اور مسیحیوں میں مسٹر راڈویل۔ قرآن کے مضامین کی سب سے موافق تقسیم دو خاص حِصّوں میں ہوتی ہے۔ اوّل وہ حِصّے کہ جن کا مکہ میں نازل ہونا کہا جاتا ہے اور جو اِسی لئے مکّی کہلاتے ہیں۔ دوم وہ حِصّے کہ جن کے لئے کہا جاتا ہے کہ مدینہ میں نازل ہُوئے تھے اور جو اس اعتبار سے مدنی کہلاتے ہیں۔ دُوسرے لفظوں میں اِس کا مطلب یہ نِکلتا ہے کہ لوگ اب یہ اصُول ماننے لگے ہیں کہ قرآن کی صحیح تفسیر صرف محمد صاحب کی زندگی کے حالات کے ساتھ مقابلہ کرکے کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ علماء متاخّرین میں سے کسی نے کہا ہے کہ "اللہ کی کتاب محمد صاحب کی زندگی کا روزنامچہ ہے"۔

قرآن کی یہ ترتیب نہ صرف اس کے مطالعہ میں سہُولت پیدا کردیتی ہے۔ بلکہ محمد صاحب کے کارنامے اور اسلام کی ترقّی کا پتہ بھی اِس سے لگ سکتا ہے۔ ہمیں اِس سے یہ بھی معلوم ہوجائیگا کہ سُورتوں کا تھوڑا تھوڑا کرکے جو نازل ہونا کہا جاتا ہے اِس سے سُورتیں اسلام کی اِبتدائی اور رفتہ حالات کے بالکل مطابق بیٹھ جاتی ہیں۔

جب قرآن کی سُورتوں کا اِس ترتیب سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔ تو ابتدائی سُورتوں میں وہ بلند الفاظ پائے جاتے ہیں جو مدنی سُورتوں میں

شاذ و نادر ہیں - اور ان میں خُدا کی قُدرت اور ہمہ جا حاضری اور توحید کا ذکر زیادہ پایا جاتا ہے - علاوہ اِس کے اِن اِبتدائی حالات سے محمد صاحب کے خیالات کی بلندی بھی پائی جاتی ہے - اور اِن کے اِس یقین کا اِظہار ہوتا ہے - کہ وہ خُدا کی طرف سے مامُور کئے گئے ہیں - (مقابلہ کرو سورۃ المدثر سورۃ الانشراح)

یہ ذیل کی اِبتدائی آئتیں قابلِ غور ہیں :-

"آفتاب کی اور اُس کی دُھوپ کی قسم اَور آفتاب کے (غرُوب ہُوئے) پیچھے جب چاند نِکلتا ہے اُس کی قسم اَور دِن کی قسم جب کہ وہ آفتاب کو نمایاں کرے - اور رات کی قسم جب وہ آفتاب کو چھُپا لے اور آسمان کی اَور اُس ذات کی قسم جس نے اُس کو بنایا ہے - اور زمین کی اور اُس ذات کی قسم جس نے اُس کو بچھایا ہے - اور اِنسان کی اور اُس ذات کی قسم جس نے پھر اُس کی بدکاری اور پرہیزگاری دونو باتیں اُس کو سمجھا دیں - غرض ہم کو ان چیزوں کی قسم جس نے اپنی رُوح کو شرک اور اخلاق بد کی گندگی سے پاک کیا وہ ضرور اپنی مُراد کو پہنچا اور جِس نے اُس کو دبا دیا وہ ضرُور گھاٹے میں رہا" (سورۃ الشمس ۱-۱۰ آیات)

اِن اِبتدائی دِنوں میں ہم محمد صاحب کو اپنے ہم وطنوں کی بُت پرستی کی مذمّت کرتے اور اُن کی نافرمانی پر اُن کو جہنّم کے عذاب سے ڈراتے ہُوئے پاتے ہیں (مقابلہ کرو - سُورۃ المرسلٰت آیت ۱۱۱ و سورۃ الھمزہ آیت ۹۶) پھر قرآن میں ان مضامین کے مقابل میں اَیسے مقامات بھی ہیں کہ جہاں اُن کے مظلوم پیروؤں کی ہمّت بڑھائی گئی ہے اور اُن سے اجرا کا وعدہ کیا گیا ہے مثلاً بہشت کا واضح بیان کہ جو اُن کو ملیگی - (سورۃ النباء و سورۃ واقعہ)

قرآن کی اِن ابتدائی سُورتوں میں محمد صاحب نے اپنے فریبی ہونے کے الزام کی بھی تردید کی ہے اور جو اُس کے الہامی ہونے پر شک کرتے ہیں اُن کو دھمکایا ہے۔ (سورۃ المرسلٰت وسورۃ الفرقان آیات ۵-۶) اِس موقع پر گزرے انبیاء کا ذکر آتا ہے کہ جس سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ اُن کی بھی تحقیر کی گئی تھی اور اُن پر بھی فریب کا الزام لگایا گیا تھا۔ (سورۃ الشعراء) محمد صاحب کے مکّی زمانہ کا آخری حصّہ جبکہ قریشیوں نے اُن کا مقاطعہ کر کے اُن کو سخت تکلیف دی تھی اس کا اشارہ اِس قسم کی آیتوں میں پایا جاتا ہے "اَے پیغمبر! قرآن جو تمہارے پروردگار کے ہاں سے تمہاری طرف وحی کے ذریعہ سے بھیجا گیا۔ اُسی کی ہدایت پر چلے جاؤ"۔ (سورۃ الانعام رکوع ۱۳ آیت ۱۱۶)

مدنی سُورتیں کہ جن کا مجموعہ پُورے قرآن کی تہائی سے کچھ زیادہ ہے۔ ہماری توقع کے مطابق مکّی سُورتوں سے مختلف ہیں۔ ان میں عقائد پر کم زور ہے اور احکام و شرائع کا زیادہ ذکر ہے کہ جن باتوں پر مسلمانوں کو روزانہ اپنی زندگی میں عمل کرنا ہے۔ واعظ کی سرگرم اور فصیح تقریر کی جگہ ایسے حُکمنامے لیتے ہیں جو ایک نئی سلطنت کے معاملات کے مدبّر کے جاری کئے ہُوئے ہیں اب محمد صاحب کو جماعتی زندگی خاندانی باتیں صُلح اور جنگ کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ قرآن کے اِس حِصّہ کو کتاب کا شرعی حِصّہ کہنا بےمحل نہ ہوگا۔

قرآن کے اِس مدنی حِصّہ میں محمد صاحب کی یہُودیوں کے ساتھ کشمکش کا ذکر اسی نمایاں حیثیت سے آیا ہے کہ جس طور سے ابتدائی سُورتوں میں اہلِ قریش کے ساتھ جھگڑوں کا ذکر ہے۔ مکّہ میں محمد صاحب کا لہجہ یہُودیوں کے ساتھ دوستانہ تھا۔ جیسے کہ (سورۃ العنکبوت کی ۴۵ آیت رکوع ۵) میں

لکھا ہے کہ "مسلمانو۔ اہلِ کتاب کے ساتھ جھگڑا نہ کیا کرو۔ مگر ایسی طرح پر کہ وہ نہایت ہی عُمدہ اور شائستہ ہو" لیکن مدینہ میں اِس بات سے تنگ آ کر کہ یہُودیوں کو اُن کی نبوّت اُن کے اپنے صحیفوں میں نہیں مِلتی یا ایسی نبوّت کے موجُود ہونے کا وہ اِقرار نہیں کرتے۔ محمد صاحب نے اُن پر غُصّہ ہو کر یہ الزام لگایا کہ وہ سچائی کو چھپاتے ہیں۔ چنانچہ دیکھو سورۃ بقر آیت ۷۲ سورۃ عمران آیت ۴۲ و ۶۴ ۔ سورۂ اعراف آیت ۱۶۱ اور جب معاملہ حد سے بڑھ گیا تو اُن پر آنیوالی حالت کا نہایت ہولناک الفاظ میں یُوں اظہار کیا۔ "اے اہلِ کتاب قرآن جو ہم نے نازل فرمایا ہے اس پر ایمان لے آؤ۔ مگر اُس سے پہلے کہ مُنہ بگاڑ کر ہم اُلٹے گدیوں میں لگا دیں"۔ (سورۃ النّسا آیت ۵۰ رکُوع ۷) اور پھر اسی سورۃ کی ۵۹ آیت میں لکھّا ہے۔ "جن لوگوں نے ہماری آیتوں سے اِنکار کیا ہم اُن کو قیامت کے دِن دوزخ میں لیجا داخل کریں گے جب اُن کی کھالیں گل جائینگی تو ہم اِس غرض سے کہ وہ عذاب کا مزہ اچھّی طرح چکھیں گلی ہُوئی کھالوں کی جگہ اُن کی دُوسری نئی کھالیں پیدا کر دینگے"۔

قرآن کی ان مدنی سُورتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ چونکہ قریشیوں کے ساتھ محمد صاحب کے تعلّقات بگڑے ہُوئے تھے اور اہلِ عرب کے دیگر قبائل کا مسلمانوں کے ساتھ دوستانہ تعلّق رکھنا مشکُوک تھا اِس لئے ایسی حالتوں نے مسلمانوں کو جلد جنگ کی اجازت دے دی۔ چنانچہ محمد صاحب نے اعلان کر دیا کہ "مُسلمانو! تم پر جہاد فرض کیا گیا اور وہ تُم کو ناگوار بھی گذریگا"۔ (سورۃ البقر آیت ۲۱۲ رکُوع ۲۶) اور "مُسلمانو! خُدا کی راہ میں خُدا کے دشمنوں یعنی کافروں سے لڑو"۔ (سورۃ البقر آیت ۲۴۵ رکُوع ۳۲)

سورۃ الاحزاب کا زیادہ تر حِصّہ محمد صاحب کے خانگی واقعات سے

تعلق رکھتا ہے جس میں البتہ بہت زیادہ ذکر ان کی بیویوں کا ہے۔ دیکھو (سورۃ الاحزاب آیت ۴۹) اِسی سورۃ میں جملہ محمد الرسُول اللہ جو نہایت عام طور پر مستعمل ہے آیا ہے۔ مکہ میں اُنہوں نے اِس بات پر زور دیا تھا کہ وہ ایک صاف گو "ڈرانے والے" ہیں (سورۃ الملک آیت ۲۶) لیکن مدینہ میں اُنہوں نے مطالبہ کیا کہ اُن کی خاص عِزّت کی جائے۔ چنانچہ اُس نے کہا "مت پکارو رسُول کو جس طرح تم آپس میں ایک دُوسرے کو پکارتے ہو" (سورۃ النّوُر آیت ۶۳) نافرمانی صرف خُدا ہی کے خلاف قصُور کرنا نہیں ہے بلکہ "اُس کے رسُول" کے خلاف بھی (سورۃ الاحزاب آیت ۳۶)۔

قرآن کے مضامین اور اُن کے ماخذ

قرآن کے مضامین کا عام مقصد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے تین مختلف مذاہب کے پیروؤں کو جن میں زیادہ تر بُت پرست اور باقی یہُودی اور مسیحی تھے ایک واحد زندہ خُدا کے علم اور بندگی میں متّحد ہو کر دینے کا تھا۔ اِس مقصد کی تکمیل کے لئے خاص قوانین اور رسُوم نافذ کئے گئے۔ جن میں کچھ نئے اور کچھ پُرانے تھے اور اس متّحدہ جماعت کی سرداری پر محمد صاحب فائز تھے کہ جس طرح پوپ اور بادشاہ دونو کے منصب پائے جاتے ہیں اور جن کی اطاعت ہر ایک پر کرنی فرض ہے کہ جنہیں خُدا نے سچّے مذہب کے قیام کے لئے کسی نئے مذہب کے جاری کرنے کے لئے نہیں بھیجا۔

مذکورہ بالا بیان کی قرآن کے مضامین سے پُورے طور پر تائید ہوتی ہے۔ خصُوصًا یہ دِکھایا جا سکتا ہے کہ کس طرح محمد صاحب نے اپنے دینی طریقہ میں نہ صرف ایسے ارکان ایمان بلکہ دستُورات اور رسُوم بھی داخل کر

لئے ہیں جو عرب کے اُن مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کا ذکر ہو چکا ہے بیشک قرآن اِس حقیقت پر گواہی دیتا ہے کہ محمد صاحب کے معترضین نے ان میں اِس قسم کی عادت دیکھی اور اُن پر یہ الزام لگایا کہ وہ اوروں سے نقل کرتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں لکھا ہے اور "کافر قرآن کی نسبت کہتے ہیں کہ یہ نرا جھوٹ ہے جس کو اِس شخص یعنے پیغمبر نے اپنے دِل سے گھڑ لیا ہے اور دُوسرے لوگوں نے اِس گھڑت میں اِس کی مدد کی۔ اَیسی بات کہنے سے یہ لوگ بڑے ہی ظلم اور سرتاسر جھُوٹ کے مرتکب ہُوئے اور یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ قرآن اگلے لوگوں کے ڈھکوسلے ہیں۔ جس کو اِس شخص نے کسی سے لکھوا لیا ہے اور وہی صُبح و شام اس کو پڑھ پڑھ کر سُنائے اور یاد کرائے جاتے ہیں۔" (سورۃ الفرقان ۵ و ۶ آیات۔ مقابلہ کرو سورۃ النحل آیات ۱۰۳ و ۱۰۵۔ رکُوع ۱۵۔ سورۃ الطور آیت ۳۳ رکُوع ۲۔ سورۃ الانبیاءٗ آیت ۵ بہرحال محمد صاحب نے ان الزامات کی تردید کی ہے۔ اور ان کے جواب میں کہا کہ "یہ تو جبرئیل کی وساطت سے نازل کیا گیا ہے"۔

(۱) قرآن میں بہتیری باتیں بُت پرستوں سے ماخُوذ ہیں :-

(۱) عرب کے بُت پرستوں سے محمد صاحب نے بہت سے رسُوم لئے کہ جن کا تعلق اب حج سے ہے (دیکھو سورۃ الحج آیت ۲۷) اَیسے رسُوم کے اسلام میں شامل کرنے سے بعضوں کو جو حیرانی ہُوئی ہے۔ اُس کی مثال عُمر خلیفہ دوم کے اِس قول میں ملتی ہے جو حجرِ اسود کے بوسہ دیتے وقت اُنہوں نے کہا تھا۔ "تحقیق کہ مَیں جانتا ہُوں کہ تُو ایک پتھر ہے۔ اور دُنیا میں تُو نفع یا نقصان نہیں پُہنچا سکتا۔ اگر مَیں پیغمبر کو بوسہ دیتے ہُوئے تجھے نہ دیکھتا تو مَیں تجھے بوسہ نہ دیتا"۔ (مشکوٰۃ المصابیح کتاب ۱۱۔ باب ۴

فصل ۳) -

(ب) ایران کے زرتشتیوں سے محمد صاحب نے کچھ تغیّر و تبدّل کر کے بہشت و دوزخ - جزا و سزا کا تصوّر لیا - اور انہی سے جنّت کی حُوروں اور جنّات کے قِصّے بھی ماخُوذ ہیں -

(۲) بہت سی باتیں یہُودیوں سے ماخُوذ ہیں -

قرآن کے بہتیرے مقامات میں عہدِ قدیم کے بیانات کے ساتھ ایک عجیب قِسم کی مطابقت اور ساتھ ہی غیر مطابقت بھی پائی جاتی ہے - یہ اس وجہ سے ہے کہ محمد صاحب کا تعلّق اُیسے یہُودیوں کے ساتھ تھا جو خود عہدِ قدیم کے اِستعمال کرنے کے اِس قدر عادی نہیں تھے - کہ جس قدر تالمُود اُن کے اِستعمال میں رہتی تھی - جو محمد صاحب سے سَو برس پیشتر مکمّل ہو چکی تھی - اور اُن کے زمانہ میں یہُودی مدرسوں کی تعلیم کی بُنیاد تالمُود کی غیر معتبر رِوایتوں پر تھی - محمد صاحب نے بائبل کے بیانات کے بجائے اُنہیں رِوایتوں کو سُنا ہوگا - قرآن میں اِس حقیقت کی ایک سے زیادہ مِثال موجُود ہے مثلاً ہابیل و قابیل کا بیان (سورۃ المائدہ آیت ۳۰ - ۳۵) جہاں ذِکر ہے کہ ایک کوّا بھیجا گیا - کہ جس نے پنجوں سے زمین کُرید کر قابیل کو دِکھایا کہ اپنے بھائی کے جسم کو کِس طرح دفن کرے - پیدائش کی کتاب میں ایسا کوئی بیان موجُود نہیں ہے، مگر تالمُود کی کتاب "پیرکے ابی الیعزر" کے اکیسویں باب میں ذِکر ہے - کہ قابیل کو نہیں بلکہ آدم کو دفن کرنے کا طریقہ کوّے نے سِکھایا - سورۃ کی سورۃ ابراہیم (سورۂِ ابراہیم) اور یُوسف (سورۂِ یُوسف) کے ذِکر کے بیان میں مخصُوص ہیں - اوّل الذّکر کے متعلق بار بار قرآن میں آیا ہے کہ چونکہ بُتوں کو سجدہ کرنے سے اِنکار کیا - اِس لئے وہ آگ میں ڈالے گئے (وَالصّفّت

رکوع ۳ سورۃ الانبیاء رکوع ۵۔ سورۃ العنکبوت رکوع ۳) اب یہ عجیب بیان بھی یہودیوں کی ایک کتاب میں جو "تارِگم جونتھان" کہلاتی ہے پیدائش ۱۱ باب ۲۸ آیت اور ۱۵ باب ۷ آیت کے سلسلہ میں پایا جاتا ہے۔ جہاں یہودی مصنّف نے کسدیوں کے اُور سے آگ سمجھا۔ لفظ اُور کے لفظی معنے تو آگ کے ہیں۔ لیکن یہاں یہ ایک مقام کا نام ہے۔ ابراہیم کا بُتوں کو سجدہ نہ کرنے کے سبب آگ میں ڈالے جانے کا باقی واقعہ جو تارگم میں پایا جاتا ہے وہ یہودی مُصنّف کی اپنی اختراع ہے۔ پھر بھی قرآن میں یہ پُورا قِصّہ شامل کیا گیا ہے۔

آج کل کے تعلیم یافتہ مسلمان جیسے لندن کے مرحُوم سید امیر علی اور کلکتہ کے پروفیسر خُدا بخش مرحُوم خود مانتے ہیں کہ محمد صاحب نے بہت کچھ باتیں ایسے ماخذ سے لیکر قرآن میں شامل کی ہیں کہ جن کا ذِکر اُوپر گذر چُکا ہے۔

(۳) اِن ماخوذِ مذکُور کے بالمقابل تعجّب ہوتا ہے کہ مسیحی ماخذ سے قرآن میں کم لیا گیا ہے۔ اَور جو کچھ ہے اس کا زیادہ تر حِصّہ غیر معتبر مسیحی روائتوں سے ماخوذ ہے۔ اِس کا بڑا ثبُوت خُداوند مسیح کی والدہ مُقدّسہ حضرت مریَم کے بیان میں پایا جاتا ہے۔ آپ کے بچپن کے زمانہ کی وہ کہانی جِس میں ذِکر ہے کہ یہ فیصلہ کرنے کے لِئے کہ "آپ کا کفیل کَون ہو" قُرعہ ڈالا گیا۔ (سورۃ آل عمران ۳۲ - ۳۹ آیات) کتاب "یعقوب کی پروطاونجیلیم" اَور ایک قبطی تواریخ مریَم میں تفصیل کے ساتھ موجُود ہے۔ پھر یہ ذِکر کہ آپ کو دردِ زِہ کھجُور کے ایک درخت کے نیچے لگا۔ (سورۂ مریم ۲۲ - ۲۵ آیات) اِس کہانی کا ایک حِصّہ ہے جو ایک غیر معتبر روائتی کِتاب تواریخ پیدائش

مریم اور طفولیت مسیح میں پائی جاتی ہے۔
تثلیث اور واقعۂ صلیب کے قرآنی بیان میں غالباً ناسطک فرقہ کی بدعتی تعلیم کا اثر پایا جاتا ہے۔

قرآن کی چند خصوصیات

(۱) کتب سابقہ۔ یہودیوں اور مسیحیوں کے ساتھ محمد صاحب کی واقفیت اور ابتداءً اُن کے دل میں اُن لوگوں کی عزت کے باعث کہ جنہیں اہلِ کتاب کا امتیازی خطاب اُنہوں نے دے رکھا تھا۔ ان کی کتبِ مقدسہ کو قرآن میں ممتاز جگہ حاصل ہے۔ قرآن ظاہر کرتا ہے کہ وہ کتابیں "خدا کی دی ہوئی ہیں"۔ (سورۃ السجدہ آیت ۲۳۔ سورۃ بنی اسرائیل آیت ۵۶۔ سورۃ المائدہ آیت ۵) وہ نور اور ہدایت لوگوں کے لئے ہے (سورۃ الانعام آیت ۹۱) اور اُنہیں کتاب اللہ (سورۃ المائدہ آیت ۴۸) کلام اللہ (سورۃ البقر آیت ۷۰) کے ناموں سے پکارا ہے لیکن جیساکہ یہ بھی بتایا جاچکا ہے۔ کہ محمد صاحب کو اِن کتابوں سے واقفیت نہیں تھی مثلاً اُن کا یہ اعلان کرنا کہ کتبِ سابقہ میں ان کی نسبت نبوت موجود ہے (سورۃ الاعراف آیت ۵۶ اور سورۃ الصف آیت ۶) اِن کتابوں سے ان کی عدم واقفیت کا ثبوت ہے۔ اور چونکہ یہودیوں نے ان کے اس دعوے کا بشدت انکار کیا۔ اِس لئے ان پر وہ تمام الزامات لگائے گئے۔ جن کی رُو سے کتبِ مقدسہ کو بگاڑ کر پیش کرنے کا جرم ان پر عائد کیا گیا (سورۃ البقر ۵۶ و ۷۲ و ۷۳ آیات سورۃ آل عمران ۶۴ (سورۃ النساء آیت ۴۸) اِس سے محمد صاحب کا مطلب یہ تھا کہ وہ ان کو اس

طور سے اپنی کتابوں کی باتیں بتاتے ہیں کہ جس سے الفاظ کے اصل معنی کچھ اور ہی سمجھے جائیں۔

(۲) انبیاءِ سابقین۔ قرآن میں انبیاء کا بیان بہت ہے۔ جن میں سے بعض ایسوں کا بھی ذکر آیا ہے۔ کہ جن کے متعلق اہلِ کتاب کو کوئی علم نہیں ہے۔ اِن انبیاء کا بیان اور ان کے علاوہ اور دُوسروں کا کہ جو شمار میں ہزاروں ہیں احادیث میں بھی ہے۔

محمد صاحب کا خیال تھا کہ لوگوں کو ایمان کے معاملہ میں ہدایت کی ضرورت ہے اور یہ انبیاء وقتاً فوقتاً وحی کے ساتھ بھیجے گئے تھے۔ لیکن آدم سے لیکر محمد صاحب تک یہ ہدایت فی الواقعی یکساں رہی ہے۔

دُوسرے الفاظ میں جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ محمد صاحب کسی نئی تعلیم کو لانے کا دعویٰ نہیں کرتے۔ انبیاءِ سابقین کا ذکر قرآن میں ناگوار طور سے بار بار دُہرایا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو سورۃ مریم آیت ۵۰-۴۲ سورۃ صٓ آیت ۴۵ وغیرہ۔ سورۃ والصّٰفّٰت آیت ۷۷ اور اس سورۃ کے دیگر مختلف مقامات۔ سورۃ الانعام ۸۲-۸۶ آیات) ان پیغمبروں کا لمبا سلسلہ ہے۔ آدم سے لے کر نُوح سے ہوتے ہوئے ابراہیم۔ لُوط۔ اسماعیل۔ موسیٰ تک اور پھر مسیح سے ہوتے ہُوئے محمد تک کہ جس کے لئے خُدا کا رسُول اور خاتم النّبیین ہونا کہا گیا ہے۔ (سورۃ الاحزاب آیت ۴۰)

(۳) خُداوند مسیح کا قرآنی بیان غور طلب ہے۔ کئی ایک ایسے مقامات قرآن سے پیش کئے جا سکتے ہیں کہ جن سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ خُداوند مسیح کو قرآن میں وہ ممتاز جگہ دی گئی ہے کہ جو کسی اور پیغمبر یہاں تک کہ محمد

صاحب کو بھی نہیں دی گئی ہے۔ آپ "مریم کے پاکیزہ بیٹے" ہیں (سورۃ مریم آیت ۱۹ مقابلہ کرو سورۃ آل عمران کی ۳۱ آیت سے) "آپ بزرگ ہیں اِس دُنیا میں اور آنے والے جہان میں" (دیکھو سورۃ آل عمران آیت ۴۰) آپ اُس کے یعنے "خُدا کے کلمہ" ہیں۔ اور اُس کی طرف سے بھیجے ہُوئے رُوح (سورۃ النّساء رکُوع ۲۳ آیت ۱۶۹) مسلمانوں میں پیغمبروں کے خطاب حسب ذیل ہیں۔ آدم صفی اللہ یعنے خُدا کے برگزیدہ۔ نُوح نبی اللہ یعنے خُدا کے نبی۔ ابراہیم خلیل اللہ یعنے خُدا کے دوست۔ مُوسیٰ کلیم اللہ یعنے خُدا سے بات کرنے والے۔ محمد رسُول اللہ یعنے خُدا کے بھیجے ہوئے۔ مگر خُداوند مسیح کو کلمۃ اللہ یعنے خُدا کا کلام کہا گیا ہے۔ (سورۃ النّساء رکُوع ۲۳)

تاہم عیسےٰ ابنِ مریم کا خطاب سب سے زیادہ خُداوند مسیح کے لئے قرآن میں آیا ہے (مقابلہ کرو سورۃ المائدہ رکُوع ۱۶ آیت ۱۱۶۔ سورۂ صف رکُوع ۱ آیت ۶ سُورۃ النّساء رکُوع ۲۲ آیت ۱۵۷) گویا محمد صاحب خطاب ابنِ مریم کو سب سے زیادہ شہرت دے کر اُن سب خصُوصیّات کا اِنکار مقصُود ہے کہ جو خُداوند مسیح کے لقب ابن اللہ میں پائی جاتی ہیں۔ اور جو مسیحیوں میں رائج ہیں (دیکھو سورۃ الزخرف رکُوع ۶ آیت ۵۹ سورۃ المائدہ رکُوع ۱۰ آیت ۷۶۔ ۷۹)۔

قرآن خُداوند مسیح کے صلیب پر مرنے کا بھی انکار کرتا ہے۔ قرآن کے بیان میں محض خُداوند مسیح کی شباہت تھی۔ جسے صلیب دی گئی ہے یعنی غلطی سے کوئی اور شخص مسیح سمجھا گیا اور مصلُوب ہُوا۔ سورۃ النّساء رکُوع ۲۲ آیت ۱۵۷) حقیقت یہ ہے کہ یا تو محمد صاحب گلوری کی عجیب محبّت

کو سمجھ نہ سکے یا اسے ماننا ہی نہیں چاہتے تھے۔ ایک دُور اندیش فرانسیسی شاعر نے اپنی ایک نظم میں یہ الفاظ محمدؐ صاحب سے کہلوائے ہیں کہ جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"نہیں تجھ پہ مَوت میں سبقت لے جاؤں گا۔ تیری مَوت اے یسُوع حد سے بڑھ کر بالا و اعلیٰ تھی۔ کیونکہ تُو نے مجرم کو منتخب ہونے دیا۔" علاوہ اس کے محمدؐ صاحب نے اپنے اس خیال کے سبب کہ وہ خاتم النبیین یعنی پیغمبروں کی مُہر سمجھے جائیں مسیح کے وعدہ فارقلیط کو اپنے متعلق پیشین گوئی کے سانچے میں ڈھال کر یوں پیش کیا ہے کہ "مریم کے بیٹے عیسٰی نے بنی اسرائیل سے کہا کہ اے بنی اسرائیل مَیں تمہاری طرف خدا کا بھیجا ہُوا آیا ہُوں۔ یہ کتاب توریت جو مجھ سے پہلے نازل ہو چکی ہے مَیں اس کی تصدیق کرتا اور ایک اور پیغمبر کی تجھ کو خوشخبری سناتا ہوں جو میرے بعد آئینگے اور اُن کا نام ہوگا احمدؐ۔" (سورۃ الصف آیت ۶) اس آیت میں لفظ احمدؐ آیا ہے لیکن احمدؐ اور محمدؐ ایک ہی مادہ سے مشتق ہیں۔

دوسری فصل

حدیث یا سنت

قرآن کا سیدھا سادا قانون جو اگرچہ باترتیب نہیں تھا تاہم جو کچھ بھی تھا عربوں کی جماعتی سیاسی اور مذہبی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے

کہ جن میں اسلام کا آغاز ہوا کافی تھا لیکن جیسے جیسے مسلمانوں کی فتوحات بڑھتی گئیں اور اسلامی شریعت دوسری قوم کے لوگوں اور دوسری تہذیبوں پر انہوں نے جاری کرنا شروع کیا تو اُن پر قرآنی شریعت کا محدود ہونا ظاہر ہونے لگا۔

محمدؐ صاحب کے بعد ہی جو خلفاء ہوئے اُن کو اس اہم مسئلہ کا سامنا کرنا پڑا تھا کہ ایک طرف تو صورت حال کا صاف تقاضا یہ تھا کہ قرآن کے مختصر قوانین کو وسعت دی جائے اور اُن نئے نئے لوگوں کی ضرورتوں کے مطابق اُن کو بنایا جائے جو اسلامی حکومت کے تابع ہوتے جا رہے تھے۔ دوسری طرف اس مسلّمہ اصول کی خلاف ورزی کرنے کے لئے بھی آزاد نہیں تھے کہ جس طرح ایمان کی باتوں میں، اسی طرح قانونی اور سیاسی معاملات میں بھی صرف قرآن ہی اُن کا سہارا رہنا ہے۔ خود محمدؐ صاحب کی زندگی اس کے احکام کے تابع تھی پھر اُن کے جانشین یعنی خلفاء کہ جو الٰہی ہدایت میں اُن سے کمتر درجہ پر تھے اس کے برعکس کیسے کر سکتے تھے۔ بہر حال یہ صاف ظاہر تھا کہ کچھ نہ کچھ کرنا ہے کیونکہ قرآن کافی نہیں ہے تو اب دقت یہ تھی کہ پھر اس کی کمی کیونکر پوری کی جائے۔

اس مشکل کا حل جو کچھ انہوں نے کیا ہم اُس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں محمدؐ صاحب کی موت کے تھوڑے عرصہ بعد ایک غیر نوشتہ یعنی زبانی قانون جو سنّت یا طریق نبوی کہلایا قبول کیا گیا کہ جس کی رُو سے "رسول اللہ کے عمدہ نمونے" (سورۃ الاحزاب آیت ۲۱) کے ذریعہ قرآن کی کمی پوری کی گئی۔ بہر حال یہ ماننے کی وجہ موجود ہے کہ محمدؐ صاحب نے اپنی زندگی میں اپنے آپ کو غلطی سے منزّہ نہیں سمجھا اور نہ اپنے اقوال کو ایسی ہدایت تصوّر کی کہ جو اُن

لوگوں کے خیالات سے بڑھ کر یقینی اور محقق ہوں کہ جن کے لئے الٰہی پیغام کے لانے کا انہوں نے دعویٰ کیا تھا ذیل کا واقعہ ہمارے اس خیال کی تائید کرتا ہے۔ روایت ہے کہ محمدؐ صاحب نے باغ والوں کو کھجور کے درختوں میں پیوند لگانے سے کہ جس کا ان میں پرانا دستور تھا ایک مرتبہ روک دیا جس کے سبب کھجور کی فصل اس سال نہایت خراب ہوئی۔ کہتے ہیں کہ اپنی اس ممانعت کا خراب نتیجہ دیکھ کر محمدؐ صاحب نے اپنی ناواقفیت کا اقرار کیا اور سمجھایا کہ اس موقعہ پر میں نے وحی سے نہیں کہا تھا اس لئے غلطی ہوئی باوجود اس قسم کے واقعہ کے ان لوگوں نے قرآن کے ان مقامات سے سنت کے لئے سند نکالی کہ جہاں مومنوں کو رسول کی اسی طرح اطاعت کرنے کا حکم ہے جس طرح خدا کی اطاعت کا مثلاً (سورۃ الاحزاب آیت ۳۶ سورۃ الفتح آیت ۱۷۔ ان کا مقابلہ کرو سورہ محمدؐ آیت ۲ سے) غرض کہ اس طرح ایک نئی تعلیم وجود میں آئی کہ جس کے مطابق محمدؐ صاحب کے اقوال وافعال خدا کی وحی کے قابو میں تھے اور اس لئے وہ بھی واجب الاطاعت مانے گئے۔ غرض کہ اب محمدؐ صاحب کی زندگی ہر بات میں عمدہ نمونہ تھی۔

اس فصل میں ہم احادیث (حدیث کی جمع) کی خاص خاص باتوں پر غور کریں گے۔ اس لفظ حدیث کے لفظی معنے ہیں بیان یا کلام کے۔ اصطلاح میں اس سے وہ قول یا فعل مراد ہے جو نبی کا یا اُن کے اصحاب کا ہو اور جو کسی سنت کی تائید یا ثبوت میں پیش کیا جائے۔ ذیل کے بیانات حدیث میں پائے جاتے ہیں۔

(۱) جو کچھ محمدؐ صاحب نے کیا یا کہا یا جو کچھ اُن کے سامنے کسی اور نے کیا لیکن انہوں نے اُس سے منع نہیں کیا۔

(۲) محمدؐ صاحب کے اقوال و افعال بھی حدیث میں شامل ہیں ہزاروں مومنین کو محمدؐ صاحب سے گفتگو کرنے اور صلاح لینے کا شرف حاصل تھا اور ان کو صحابہ کا امتیازی خطاب مل چکا تھا اور جب کہیں اُور سے لوگوں کی رہنمائی نہ ہوتی تو صحابہ کی متفقہ رائے بے خطا سمجھی جاتی۔کیونکہ جیسے قرآن میں لکھا ہے کہ "خدا اُن سے بھی راضی تھا۔" (سورۃ الفتح آیت ۱۸)
کہنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ تمام دنیائے اسلام میں احادیث کی بڑی تعظیم کی جاتی ہے۔ احادیث کے بعض بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود محمدؐ صاحب نے اُن کی تعظیم کا حکم دیا ہے کہ جن سے احادیث کی تعظیم کی بڑی سند ملتی ہے۔ ہم ذیل میں مشکوٰۃ المصابیح کی چند احادیث پیش کرتے ہیں ملاحظہ ہو مشکوٰۃ المصابیح کتاب ا باب ۶)
"تحقیق کہ سب سے احسن کلام خدا کا کلام ہے اور سب سے اچھا دستور العمل وہ ہے جو محمدؐ صاحب کو دیا گیا۔"
"جو کچھ خدا کے رسول نے حرام ٹھہرایا اُس کی مانند ہے کہ جو خود خدا نے حرام ٹھہرایا۔"
"مَیں نے دو چیزیں تمہارے لئے چھوڑی ہیں اور جب تک اُن کو مضبوط تھامے رہو گے گمراہ نہ ہو گے۔ ایک خدا کا کلام ہے اور دُوسرا اُس کے رسول کی سنت ہے۔"
مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کے موضوع اور اُس کی غایت کے متعلق چند باتیں بیان کر دی جائیں۔
حدیث کا ایک بڑا حصہ شرعی ملحوظات اور مذہبی پابندیوں سے تعلق رکھتا ہے۔ مثلاً نماز اور اس کے ادا کرنے کا قاعدہ۔ روزہ۔ زکوٰۃ

حج اور جہاد۔ فرض اور واجب احکام کی تفصیل حلال اور حرام چیزوں کا ذکر۔ رسمی طہارت اور خوراک کے متعلق شرعی قوانین فوجداری اور دیوانی قانون اور اخلاق اور مراسم آداب۔ اُن کے علاوہ الٰہیات کے مسائل پر بھی ان میں مختلف ابواب پائے جاتے ہیں۔ مثلاً روزِ عدالت کی سزا و جزا۔ دوزخ و بہشت۔ ملائک۔ پیدائش کائنات اور وحی۔

اس قسم کے بیانات کے درمیان کہیں کہیں نصائح اور اخلاق کی تعلیم بھی پائی جاتی ہے جو محمدؐ صاحب کی طرف منسوب ہے زمانہ حال میں اُن کا علیحدہ مجموعہ مختلف کتب کی صورتوں میں شائع ہوا ہے۔

لیکن احادیث سے قرآن کی ایک بڑی ضرورت پوری ہوتی ہے کہ اس کی تفسیر کرنے میں بہتری اور دقتوں کے علاوہ جو متضاد آیتیں ہیں اُن کو سلجھانے کی یہ کوشش کرتی ہیں۔

احادیث کا آغاز

جس طریقہ سے احادیث کا آغاز ہوا ہم بآسانی اس کا قیاس کر سکتے ہیں۔ محمدؐ صاحب کی موت کے بعد ان کے صحابہ کے خیال اور گفتگو جنگی معرکوں کے موضوعوں پر فرصت کے لمحوں میں خود بخود اپنے بڑے سردار کے اقوال اور افعال کے ذکر کی طرف مائل ہوتے تھے کہ حق نے اُن کے لئے ممکن کر دیا کہ وہ ایک فتحمند قوم بن جائے اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا محمدؐ صاحب کی کامیابی پر اُن کی حیرت بڑھتی گئی یہاں تک کہ وہ ان میں ایک فوق الفطرت طاقت کا ہونا خیال کرنے لگے۔

لیکن محمدؐ صاحب کے متعلق اس قسم کا حیرت افزا اور پُر ہیبت

خیال زمانۂ بعد کے مسلمانوں میں اور بھی بڑھ گیا کہ جنہوں نے محمد صاحب کا زمانہ بالکل نہیں پایا تھا اور جن کے لئے خود ان کے صحابہ ہی واجب التعظیم تھے ایسی روایتیں موجود ہیں کہ جن میں صفائی سے اس قسم کی باتوں کا ذکر پایا جاتا ہے چنانچہ ایک روایت میں ذکر ہے کہ کوفہ کی مسجد میں ایک دین دار مسلمان نے ایک صحابی سے پوچھا۔ "اے ابو عبداللہ کیا یہ ممکن ہے کہ تو محمد صاحب کے ساتھ تھا کیا تو نے واقعی رسول اللہ کو دیکھا اور کیا تو اُن سے آزادانہ ملتا تھا؟ صحابی نے جواب دیا۔ "اے ابن عم تو درست کہتا ہے۔" سائل نے بڑے جوش میں کہا "خدا کی قسم اگر میں آپ کے زمانہ میں ہوتا تو میں آپ کو اپنا مبارک قدم زمین پر نہ رکھنے دیتا۔ بلکہ جہاں آپ چاہتے میں آپ کو اپنی گردن پر اُٹھائے لئے پھرتا۔"

یہ خیال قرین عقل معلوم پڑتا ہے کہ وہ تمام باتیں جو اس کثرت کے ساتھ احادیث میں جمع کی گئی ہیں اُن کا آغاز اسی قسم کے حالات سے ہُوا ہوگا کہ جن کا ذکر ہم نے ابھی کیا ہے۔

جعلی حدیثوں کا بننا

جب ہم اس قسم کے تمام حالات پر نظر ڈالتے ہیں جیسے واقعات کی تفصیل کے معلوم کرنے کا غلبۂ اشتیاق شرعی قوانین کی زیادہ تشریح کی ضرورت اور ایسے اقوال کے دعوائے صحت کی سند تو پھر ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوتا کہ جعلی حدیثیں گھڑی گئیں۔ اسلام کے ان ابتدائی اور اشتعال انگیز ایام کے مطالبات نے صرف سینکڑوں ہی نہیں بلکہ اس قسم کے ہزاروں اقوال و اعمال پیدا کر دیئے کہ جن کا اب تک پتہ بھی نہ تھا اور جن کا ہونا نبی کی

طرف منسوب کر دیا گیا۔ محمد صاحب کے متعلق ہر قسم کے بیانات خواہ سچ یا جھوٹ اس قدر رائج ہو گئے کہ اُن کی تعداد ہزاروں سے تجاوز کر کے لاکھوں تک جا پہنچی احادیث کی جعلسازی اس قدر علانیہ ہو گئی تھی کہ خود مسلمانوں نے جیساکہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کبھی اس کا انکار نہیں کیا اور نہ کرتے ہیں۔

احادیث کے امتیازات خصوصی

حقیقی معنوں میں حدیث کے دو جزو ہوتے ہیں :۔

(۱) اسناد (واحد سند) یعنی کسی بیان کے معتبر ہونے کی "دلیل" اصطلاح میں اسناد سے مُراد ایسے اشخاص کے ناموں کا سلسلہ ہے کہ جن کے وسیلے حدیث کا مضمون ایک سے دوسرے تک پہنچتا رہا ہے۔ یوں راویوں کے ناموں کا ایک سلسلہ بن جاتا ہے کہ جس کا انقطاع پہلے راوی کے نام پر ہوتا ہے۔

(۲) متن یا حدیث کا مضمون۔

ذیل میں ایک پوری حدیث کا نمونہ ہم پیش کرتے ہیں۔

روایت ہے مسلم سے کہ بیان کیا مجھ سے محمدؐ بن عبداللہ بن نمیر الہمدانی نے کہ بیان کیا مجھ سے ابو خالد یعنی سلیمان بن حیان الاحمر نے کہ کہا مجھ سے ابی مالک الاشجعی نے اور کہا اُس سے سعد بن عبیدہ نے اور اُس سے ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہ کہا مجھ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ بنیاد اسلام کی پانچ باتوں پر ہے یعنی اللہ کو ایک جاننا۔ نماز پڑھنا۔ زکوٰۃ دینا اور رمضان کے روزے رکھنا اور حج کرنا۔

مسلمان علماء کے نزدیک صحیح حدیث کے لئے کئی ایک شرائط

کا ہونا لازمی ہے جن میں سے چند خاص کا ذکر ہم ذیل میں کرتے ہیں اول راوی کے لئے ضرور ہے کہ صفائی کے ساتھ بیان کرے کہ فلاں قول یا عمل محمدؐ صاحب کا ہے۔ دوم سلسلہ اسناد انتہیٰ سے لے کر محمدؐ صاحب تک مکمل ہو۔ سوم اسناد کا ہر راوی اپنے تقویٰ ایکی اور دیانت داری کے لئے مشہور ہو اور اُن میں سے ہر ایک کا صاحب علم ہونا بھی معلوم ہو۔ چہارم۔ حدیث کا مضمون نہ تو قرآن کے احکام کے خلاف ہو۔ اور نہ کسی ایسی تعلیم کے برعکس ہو جو قرآن سے قیاساً نکلتی ہو اور نہ کسی ایسی حدیث کے مخالف ہو۔ جس کا "صحیح" ہونا ثابت ہو چکا ہو۔

احادیث کے رواج دینے میں محمدؐ صاحب کے صحابہ نے بڑی احتیاط کی ضرورت محسوس کی تھی۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جب عثمان خلیفہ ہوئے تو انہوں نے یہ حکم جاری کیا کہ کسی کو یہ اجازت نہیں ہے کہ پیغمبر سے کسی ایسی حدیث کو منسوب کرے جو اُس نے خود ابوبکر یا عمر کے زمانہ میں نہ سنی ہو اور تحقیق کہ نہیں روکتی مجھے کوئی چیز نبی کے کسی قول کو بیان کرنے سے۔ اگرچہ میرا شمار ان صحابیوں میں ہے کہ جن کا حافظہ نہایت قوی تھا مگر یہ کہ میں نے سنا آپ کو کہتے ہوئے کہ جو کوئی میرے بارے میں کہے کوئی ایسی بات کہ نہیں کہی میں نے اُس کا ٹھکانا جہنم ہوگا (واقدی صفحہ ۱۷۱)

احادیث کا یہ ذخیرہ کہ جو شریعت کا ایک خاص جزو بن گیا تھا۔ عرصہ دراز تک صرف لوگوں کے حافظہ پر منحصر تھا۔ اُن کو کتابت میں لاکر محفوظ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ یہ حفظ کر کے یاد کر لی جاتی تھیں اور پھر صرف زبانی ایک دوسرے تک پہنچائی جاتی تھیں۔ اُستاد احادیث کے ایک بڑے ذخیرہ کا حافظ ہوتا اور طلباء کے سامنے اس کو دُہراتا جو سُن کر خود یاد کر لیتے تھے

اور اس طرح ایک دوسرے تک یہ پہنچائے جاتے تھے۔

احادیث کے اس طور پر محض زبانی محفوظ رکھنے کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ عام طور پر مسلمانوں میں یہ خیال رائج تھا کہ قرآن اپنے سوا اور کسی کتاب کے رواج پکڑنے کا مجاز نہیں ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ لوگوں کو یہ اندیشہ لاحق ہو کہ احادیث کے مضامین کہیں قرآن کے متن میں نہ مل جائیں۔

ہم پیشتر بتا چکے ہیں کہ احادیث کس طرح شمار میں کثرت سے بڑھ گئی تھیں اس لئے اب دوسرا کام یہ تھا کہ اُن کو جمع کر کے اُن کی جانچ اور تقسیم کی جائے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ پہلی صدی ہجری کے خاتمہ پر احادیث کی تلاش کا بہت زیادہ شوق لوگوں میں پیدا ہو گیا۔ احادیث کے شائقین ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک قبیلہ سے دوسرے قبیلہ کو دُنیائے اسلام کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سفر کرتے ہوئے جاتے اور جو صحابہ زندہ تھے اُن کے ساتھ یا تابعین کے ساتھ شخصی ملاقات کرتے تاکہ محمدؐ صاحب کی زندگی کے کسی ایک واقعہ کا ذکر اُن سے سُن کر سیکھیں۔

احادیث کے جمع کرنے کا کام اس قدر اہم تھا کہ محض شخصی کوششوں پر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا اور یوں ہم پڑھتے ہیں کہ محمدؐ صاحب کی موت کے قریب سو برس بعد خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے تمام مروّجہ احادیث کے باضابطہ جمع کئے جانے کا حکم صادر کیا۔

احادیث کا سب سے پہلا مجموعہ کہ جس کا ہمیں علم ہے دوسری صدی ہجری کے خاتمہ پر ترتیب پایا اور احادیث کا یہ سارا ذخیرہ جو یوں جمع کیا گیا دو صورتوں میں منتقل ہوتا ہوا پہنچا ہے۔ ایک تو نبی کی مختلف سیرت کی خاص

میں اور دوسرے احادیث کے مجموعہ کی صورت میں کہ جن میں محمدؐ صاحب کی زندگی کے ہر ممکن الخیال پہلو کا ذکر ہے۔

ان مجموعوں کی تدوین میں ان کی اصلیت کے ثبوت کا سوال نہایت اہم رہا ہے۔

احادیث کے پہنچانے میں دو قسم کے لوگوں کو فوقیت حاصل ہے۔

(۱) اصحاب یعنی وہ لوگ جو درحقیقت محمدؐ صاحب کے ساتھ رہے اور جو کچھ اُنہوں نے محمدؐ صاحب سے سُن کر یا دیکھ کر بیان کیا تو اُن کا دیکھنا یا سُننا اُس کی اصلیت کا کافی ثبوت ہے۔

(۲) تابعین یعنی محمدؐ صاحب کے بعد کے وہ لوگ جو اُن کے صحابہ کے ساتھ رہے اور اُن سے محمدؐ صاحب کے بارے میں سُنا۔

اُن کے علاوہ اُن سے کمتر درجہ کے رُوات بھی ہیں۔

جس طرح احادیث کے راویوں کے درجے ہیں اسی طرح احادیث کی بھی مشہور قسمیں ہیں۔ ہم ان میں سے صرف چند خاص قسموں کا ذکر ذیل میں کرتے ہیں۔

(۱) **صحیح** ایسی حدیث کو کہتے ہیں کہ جس کی اسناد میں کوئی ضعف نہ پایا جائے اور جو اسلام کے مروّجہ اعتقاد کے مخالف نہ ہو۔

(۲) **حسن** صحیح سے دوسرے درجہ کی حدیث ہے کہ جس کے رُوات نہایت ہی اعلیٰ درجہ کے نہ ہوں۔

(۳) **ضعیف** ایسی حدیث کہ جس کا مضمون مشتبہ ہو یا جس کے رُوات غیر معتبر ہوں۔

احادیث کے چند مشہور مجموعے

یہ بات قابلِ غور ہے کہ احادیث کا کوئی مجموعہ بھی مذہب یا سلطنت کے اختیار سے ترتیب نہیں پایا تاہم چند مجموعے جن کا ہم ذیل میں ذکر کرینگے نہایت معتبر سمجھے جاتے ہیں۔

احادیث کے سب سے پہلے مجموعوں میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ احادیث علی السبیل ترتیب صحابہ یعنی اسناد کے مطابق بیان کئے جائیں اور اس سبب سے ان کا نام مسند پڑ گیا اس قسم کے مجموعوں میں ہر حدیث ایسے شخص کے نام کی تحت میں بیان کی گئی ہے کہ جس کا نام سند کے آخر میں آیا ہے۔ چنانچہ عائشہ۔ فاطمہ۔ ابوہریرہ کے ناموں کی تحت میں ایسی احادیث بیان کی گئی ہیں کہ جن کی اسناد ان اشخاص تک پہنچتی ہیں۔ ان مسانید میں سب سے پرانی اور سب سے بڑھ کر نمونہ کی مسند امام احمد ابن حنبل کی تصنیف ہے کہ جو سنت والجماعت کے چار مذاہب میں سے ایک کا بانی ہے اس کی یہ تصنیف چھ جلدوں میں ہے اور اس میں تیس ہزار حدیثیں ہیں کہ جنہیں اس نے سات لاکھ پچاس ہزار حدیثوں سے چن کر جمع کیا اور جن کی اسناد سات سو صحابیوں تک پہنچتی ہیں۔

زمانہ بعد کی تالیفات میں احادیث علی الترتیب مضامین بیان کی گئیں مثلاً نماز۔ حج۔ جنگ۔ غذا۔ استخارہ۔ قیامت۔ جہنم وغیرہ اور اس لئے یہ مصنف کہلائے۔

احادیث کے ان تمام مجموعوں میں ذیل کے چھ مصنفات جو سب کے سب تیسری صدی ہجری کے ہیں بہت مشہور ہوئے اور آج تک ان

کی بڑی قدر و عزت ہے۔ یہ اپنے مؤلفوں کے نام پر موسوم ہیں البخاری متوفی ٨٧٠ء مسلم متوفی ٨٧٥ء ابوداؤد متوفی ٨٨٨ء الترمذی متوفی ٨٩٢ء النسائی متوفی ٩١٥ء ابن ماجہ متوفی ٨٨٦ء۔

ان چھ کتابوں کو صحاح ستہ یعنی صحیح احادیث کے چھ مجموعے کہتے ہیں ان میں سے پہلے دو کی خاص طور پر قدر کی جاتی ہے کیونکہ ان میں صرف صحیح حدیثیں شامل کی گئی ہیں۔

اور دوسرے مجموعے بھی بعد میں شائع ہوئے لیکن یہ سب ان تالیفات سے ماخوذ تھے کہ جن کا ذکر ہو چکا ہے۔ ان میں سب سے مشہور مشکوٰۃ المصابیح اور السیوطی کی تصانیف ہیں۔

احادیث کہاں تک قابلِ اعتبار ہیں

چند قدیم محدثوں کے بیان کے مطابق دوسری صدی ہجری میں ہزاروں ایسی حدیثیں رائج ہو گئی تھیں کہ جن میں ذرّہ بھر سچائی نہیں تھی بناوٹی باتوں کو رواج دینے کے لئے نہ بیہودہ طور پر محمدؐ صاحب کے نام کا غلط استعمال کیا جا رہا تھا۔ اس حقیقت سے ظاہر ہے کہ بخاری آخر کار اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ:۔

(١) چالیس ہزار اشخاص میں کہ جن کے نام بطور رُوات مستعمل ہو رہے تھے صرف دو ہزار معتبر تھے۔

(٢) چھ لاکھ حدیثیں کہ جو اُس وقت رائج تھیں ان میں صرف چار ہزار قابلِ اعتبار سمجھ کر قبول کرنے کے لائق خیال کی گئیں۔

لکھا ہے کہ بخاری کو صحیح احادیث کے جمع کرنے کی ترغیب ایک

رویا کے ذریعہ سے ہوئی۔ اُس نے خواب میں دیکھا کہ وہ محمدؐ صاحب پر سے مکھیاں ہکار رہا ہے اور کسی تعبیر کرنے والے نے یہ بتایا کہ وہ محمدؐ صاحب پر سے بہتان دُور کرے گا۔

یہ صاف ظاہر ہے کہ بخاری اور دیگر محدثین کا کام محض احادیث کا جمع کرنا نہیں تھا بلکہ اُن کی یہ کوشش بھی کہ جو حدیثیں اب تک جمع ہو چکی ہیں کسی خاص معیار سے اُن کی جانچ کی جائے تاہم جب ان کے معیار کے متعلق ہم دریافت کرتے ہیں تو یہ صفائی سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان کی کوششیں نہ صرف ناکافی بلکہ بے سود بھی تھیں۔

اوّل تو اس لئے کہ کسی حدیث کے متن کی جانچ میں انہوں نے تنقید معنوی سے کام نہیں لیا۔ اگر اُن کو اسناد کی صحت کا اطمینان ہو جاتا تو پھر وہ باقی اور باتوں کو نہیں دیکھتے تھے یہاں تک کہ پھر اگر خود حدیث کا بیان بعید العقل یا ناممکن الوقوع یا محال ہوتا تو بھی اُس کی صحت پر شک نہیں کرتے تھے۔

صحیح معنوں میں اُن کا طریق تنقید بالکل صوری یا خارجی تھا انہوں نے صرف اسناد ہی کی اصلیت کے پرکھنے پر اکتفا کیا لیکن یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اسناد کی جانچ بھی پورے طور پر نہیں کی۔ کیونکہ اگرچہ انہوں نے بعض اوقات اسناد کے کسی نقص کے باعث جیسے رُوات کا ہم عصر نہ ہونا یا مقتضائے عقل کے خلاف کسی بات کا ان میں پایا جانا۔ انہوں نے احادیث رد کی ہیں تاہم جہاں خود راویوں کے خلاف نکتہ چینی کی نوبت آئی ہے وہاں وہ ہمت ہار بیٹھے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ جہاں تک ان راویوں کا تعلق ہے جو خود ان کے اپنے زمانہ کے قریبی ایّام میں گذر چکے ہیں انہوں نے نہایت سختی سے اُن کی نکتہ چینی کی ہے لیکن اسلام کے ابتدائی ایّام کے عجیب اشخاص

یعنی صحابہ اور تابعین کی زندگی کی نکتہ چینی کرنا انہیں سخت ناگوار تھا۔ اُن کی اس پاس داری کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحابہ اور تابعین کل عملی مقاصد کے لئے نکتہ چینی سے مستثنیٰ رہے لیکن چاہیئے کہ اس قسم کے معاملات سلسلۂ اسناد کے ابتدائی حصہ یا آغاز کی نہایت سختی سے نکتہ چینی کی جائے۔ کیونکہ جو نقائص سلسلۂ اسناد کے شروع میں ہوں گے وہ آخر تک قائم رہیں گے لیکن یہی موقعہ ہے کہ جہاں انہوں نے تنقید سے بہت کم کام لیا ہے۔

جب ہم یہ دریافت کرتے ہیں کہ وہ اصحاب کون ہیں کہ جن کے نام اسناد کے سرے پہ آتے ہیں تو ہمارے اس بیان مذکور کا مطلب اور بھی صاف ہو جاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس مخصوص درجہ کے بہترین صحابہ تقریباً سب کے سب محمدؐ صاحب کی موت کے بیس اور تیس سال کے درمیان انتقال کر چکے تھے اور ان کے نام بہت کم راویوں میں ملتے ہیں بلکہ بجائے اس کے ہم پاتے ہیں کہ احادیث کا ایک بہت بڑا شمار محمدؐ صاحب کے ایسے صحابہ کی طرف منسوب ہے جو ان کی عین حیات میں کم عمر تھے۔ اُن میں سے چند نہایت ہی مشہور راویوں کا ذکر ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

ابوہریرہ۔ اس سے ہزاروں احادیث مروی ہیں لیکن اس نے محمدؐ صاحب کی موت کے صرف چار سال پیشتر اسلام قبول کیا تھا اور ان چار سال کے عرصہ میں وہ ایک گمنام نوجوان رہا۔

ابن عباسؓ۔ اس کی طرف بھی ہزاروں احادیث منسوب ہیں محمدؐ صاحب کی موت پہ یہ چودہ برس کا لڑکا تھا اور محمدؐ صاحب کی زندگی کے آخری چار سال ان کی رفاقت میں رہا۔

انس بن مالک۔ یہ ایک غیر تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ اس کی عمر

محمدؐ صاحب کی موت پر انیس ۱۹ سال کی تھی۔

پھر بھی یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ بخاری کی چُنی ہوئی احادیث کا نصف سے زیادہ حصہ انہی کم عمر راویوں کی طرف منسوب ہے۔ طبری کی مشہور تواریخ میں کہ جس کا سال وفات ۹۲۳ء ہے ابن عباس دو سو چھیاسی ۲۸۶ مرتبہ ابو ہریرہ باون ۵۲ مرتبہ انس بن مالک سینتالیس ۴۷ مرتبہ منقول ہیں۔ خلفاء راشدین میں سے ایک مرتبہ بھی کوئی منقول نہیں ہے۔

اب محمدؐ صاحب کی چاہتی بیوی عائشہ کا ذکر کرنا رہ گیا۔ محمدؐ صاحب کی رفاقت میں تھوڑے عرصہ رہنے کا اعتراض بے شک عائشہ پر عائد نہیں ہوتا مگر وہ طرف داری میں بہت مشہور ہیں۔

ان حقیقتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ اسناد جو صحیح مانے جاتے ہیں فی نفسہ بہت کم مفید ہیں اور علاوہ ازیں اسلام کے ابتدائی زمانہ کے راویوں کو ہم یقینی طور پر معتبر نہیں مان سکتے۔ بہر حال اس قدر بتا دینا ضرور ہے کہ ان نقائص کے باوجود احادیث کے تمام حصوں کو یکساں طور پر مشکوک نہیں سمجھنا چاہئے۔ ذیل کی اقسام قابل غور ہیں۔

(۱) وہ احادیث کہ جن میں محمدؐ صاحب اور ان کے صحابہ کی زندگی کے معمولی اور سیدھے سادے واقعات پائے جاتے ہیں یہ اس قسم کی ہیں کہ ان کا صحیح ہونا ہم بآسانی مان سکتے ہیں کیونکہ ان کو بگاڑ کر پیش کرنے میں کسی کا فائدہ نظر نہیں آتا۔ اس وجہ سے محمدؐ صاحب کے مدنی زمانہ کے حالات و اقوال ان کے مکی حالات کی بہ نسبت کہیں زیادہ مستند ہیں نہ صرف اس لئے کہ اس مدنی عہد میں نرالی اور خیالی باتیں کم پائی جاتی ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ اس عہد کے گواہوں کا شمار کہیں زیادہ ہے۔ محمدؐ صاحب

کے ابتدائی ایام اور مکی عہد کی احادیث میں ایسی باتیں موجود ہیں کہ جن کا صحیح ہونا نہایت مشتبہ ہے۔

(۲) نزاعی اور خیالی باتوں میں شک کی بہت گنجائش ہے اور پھر جن میں معجزات کا ذکر ہے وہ بھی غیر معتبر ہیں کیونکہ اگر اُن کے غیر معتبر ہونے کی اور کوئی دلیل نہ بھی قبول کی جائے تو بھی کم از کم قرآن کا یہ صریح بیان جو سورۃ العنکبوت کی آیت ۴۹ رکوع ۵ میں پایا جاتا ہے ایسی احادیث کے مخالف ہے۔ ان کے متعلق اس قدر جاننا کافی ہے کہ اس دوسری قسم کی احادیث پہلی چار قسم کے راویوں کی طرف منسوب ہیں کہ جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ محمدؐ صاحب کے متعلق اس قسم کے قصوں کی صرف مانگ ہی نہیں تھی بلکہ معلوم پڑتا ہے کہ امام شافعی کا یہ قول لوگوں میں مقبول تھا کہ محمدؐ صاحب کی عظمت میں کچھ مبالغہ کرنا جائز ہے

(۳) ایسی احادیث کہ جن میں عمدہ اور دینی اقوال محمدؐ صاحب کی طرف منسوب کئے گئے ہیں ان پر بھی اسی قسم کے اعتراضات وارد ہوتے ہیں مرحوم گولڈزیہر جو ایک مشہور فاضل ہو گزرے ہیں اُن کا بیان ہے کہ ابتدا میں محمدؐ صاحب کی زندگی کا ایسا خاکہ کھینچنے کی طبیعت لوگوں میں پائی جاتی تھی جو مسیح کی شان سے کہ جس کا خاکہ کلیسیا نے کھینچا ہے کسی طرح کم نہ ہو۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اس قسم کی طبیعت ان میں نادانستہ کام کر رہی ہو۔ اس لئے محمدؐ صاحب کی صرف زندگی ہی نہیں بلکہ اُنکے اقوال بھی اسی معیار کے مطابق بنائے گئے ہونگے اور یوں عہدِ قدیم اور اناجیل کے اقوال کچھ خفیف تبدیلیوں کے بعد احادیث میں داخل کر لئے گئے۔ ذیل میں اس آخری قسم کی احادیث کی چند مثالیں ہم پیش کرتے ہیں کہ جن سے اُس وقت کے لوگوں کی طبیعت کے عام میلان کا پتہ لگ سکتا ہے۔

"تحقیق کہ خدا تمہاری ظاہری صورت یا تمہارے تصرفات پر نظر

نہیں کرتا بلکہ وہ تمہارے دل اور تمہارے افعال کو دیکھتا ہے۔"

"اے خدا میرے اور میرے گناہوں کے درمیان ایسی دوری رکھ جیسی کہ تو نے پورب اور پچھم کے درمیان رکھی ہے۔"

"اے خداوند خدا تو جو آسمان میں ہے تیرا نام پاک مانا جائے۔ تیری بادشاہت آسمان و زمین میں ہے۔ جیسی تیری رحمت آسمان پر ہے اُسی طرح اپنی رحمت زمین پر بھی ظاہر کر۔ ہمارے قرضوں اور گناہوں کو بخش دے۔"

ذیل کا یہ قول احادیث کی اُس نادر قسم سے ہے کہ جو حدیث قدسی کے نام سے مشہور ہے۔ اس نام کا اطلاق ان احادیث پر ہوتا ہے کہ جن کے مطالب یا معانی محمدؐ صاحب پر الہام کے ذریعہ خدا کی طرف سے دل میں القا ہوئے یا رویا میں ان پر ظاہر کیا گیا اور پھر اپنے الفاظ میں اُنہوں نے ان کو پیش کیا۔ "خدا نے کہا۔ میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ چیزیں تیار کی ہیں جو آنکھ نے نہیں دیکھیں کان نے نہیں سُنیں اور جن کا خیال انسان کے دل میں نہیں گزرا۔"

ابن ماجہ کے دیباچہ میں ایک قول منقول ہے جو محمدؐ صاحب کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ جس سے اس قسم کی احادیث پر شک کرنا کہ جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ ہمارے لئے صحیح ٹھہرتا ہے وہ حدیث یہ ہے کہ "جو کچھ اچھی باتیں کہی گئی ہیں اُن کا کہنے والا میں ہی ہوں۔"

(۴) ایک اَور قسم کی احادیث ہیں کہ جن میں محمدؐ صاحب کی زندگی کے خاندانی معاملات درج ہیں ان میں سے بہتیری حدیثیں عائشہ سے مروی ہیں۔ غیر مسلم علماء اُن کے زیادہ تر حصے کا ترجمہ کرنا پسند نہیں کرتے کیونکہ یہ اشاعت کے ناقابل ہیں۔ ہمیں تعجب ہے کہ یہ تحریر میں کیونکر آئیں۔

(۵) احادیث کی ایک آخری قسم پر غور کرنا رہ گیا کہ جن سے شریعت کا مصالحہ بہم پہنچتا ہے یہ امر نہایت قابل غور ہے کہ ابتدائے عہد اسلام کے علماء شریعت ایسی حدیثوں کو جو فقہی مسائل پر موقوف ہوں بہت حد تک قبول نہیں کرتے تھے کیونکہ یہ بات بہت مشہور تھی کہ اسی قسم کی احادیث گھڑنے میں نہایت ہی علانیہ جعلسازی سے کام لیا گیا ہے۔ البغوی کہ جس کا سال وفات قریب ۱۱۲۰ء ہے اور جو احیاء السنت یعنی سنت کا زندہ کرنے والا مشہور تھا اپنی کتاب مصابیح السنت کے دیباچہ میں اقرار کرتا ہے کہ ایسی حدیثوں کی کثیر تعداد کہ جو مسائل فقہ کے لئے دستور العمل ہیں ان کا انحصار حسن اسناد پر ہے یعنی صحیح حدیثوں کے طبقہ ثانی کی یہ حدیثیں ہیں۔

احادیث کے نمونے

احادیث کے مشہور مجموعہ کتاب مشکوٰۃ المصابیح کے مؤلف نے جو چودھویں صدی مسیحی میں گذرا ہے اپنے اس مجموعہ میں احادیث کو پچیس ۲۵ ابواب میں جمع کیا ہے۔ اسی کتاب کے مختلف مقامات سے چند احادیث ذیل میں پیش کر کے اس باب کو ہم ختم کرتے ہیں۔ ذیل کی ہر حدیث کو محمد صاحب کا قول یا فعل سمجھنا چاہیئے۔

"مجھے حکم ہوا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کرتا رہوں یہاں تک کہ وہ گواہی دیں کہ کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے اور محمد اللہ کا رسول ہے۔"
روایت کیا اسے بخاری اور مسلم نے عمر سے۔

"جب تم میں سے کوئی نیند سے بیدار ہو اور وضو کرے تو چاہیئے کہ تین مرتبہ اپنے ناک کو صاف کرے کیونکہ تحقیق کہ شیطان ناک میں رہتا ہے۔"

روایت کیا اسے بخاری اور مسلم نے ابوہریرہ سے۔

"جو خدا کے لئے مسجد بناتا ہے خدا اس کے لئے فردوس میں ایک گھر تیار کرتا ہے۔" روایت کیا اسے بخاری اور مسلم نے عثمان سے۔

"سنگِ اسود فردوس سے آیا اور یہ دودھ سے زیادہ سفید تھا لیکن آدم کی اولاد کے گناہوں سے یہ سیاہ ہو گیا۔" روایت کیا اسے ترمذی نے ابن عباس سے

"عائشہ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا سفر کو جاتے وقت اپنی بیویوں کے نام پر قرعہ ڈالتے اور جس کا نام نکلتا اُسے اپنے ساتھ لے جاتے۔" روایت کیا اسے بخاری اور مسلم نے۔

"خدا نے ملعون ٹھہرایا ہے اُس چور کو جو ایک انڈا چوری کرے اور چاہیئے کہ اُس کا ہاتھ کاٹ ڈالا جائے۔ اور جو چور ایک رسّی کی چوری کرے چاہیئے کہ اُس کا ہاتھ کاٹ ڈالا جائے۔" روایت کیا اسے بخاری اور مسلم نے ابوہریرہ سے۔

"چھُری سے کاٹ کر گوشت نہ کھاؤ کیونکہ غیر ملک کے لوگ ایسا کرتے ہیں۔ بلکہ دانت سے کاٹو کیونکہ یہ زیادہ عمدہ اور زیادہ صحت بخش ہے۔" روایت کیا ابوداؤد نے عائشہ سے۔

"کہا انس نے کہ نبی نے منع کیا کھڑے ہو کر پانی پینے سے۔" روایت کیا مُسلم نے۔

تیسری فصل

شریعت کے دیگر مآخذ

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ قرآن کا ضابطۂ قوانین غیر مکمل ہے اور بہتیری ایسی باتوں کا کہ جن کے فیصلہ کی مسلمانوں کو اسلام کے ابتدائی زمانہ میں ضرورت پڑی قرآن نے کوئی تدارک نہیں کیا۔ برعکس اس کے وہ شرعی مسائل جن کا بیان فقہ کی کتابوں میں صراحت اور تفصیل کے ساتھ کئی کئی صفحوں میں ہوتا ہے قرآن میں محض ان کی ابتدائی باتیں پائی جاتی ہیں۔

قرآن کی تعلیم کو پورا کرنے کی غرض سے ابتداءً سنت نبوی کی طرف رجوع کیا گیا اور یوں پہلے خلفاء نے جو طریقہ اختیار کیا مقابلۃً آسان تھا شرعی انتظام کے معاملہ میں ان کو یہی کرنا پڑتا تھا کہ محمدؐ صاحب کی رائے کا جو کچھ اُن کو علم تھا اُسی کے مطابق فیصلہ کر دیتے۔ چنانچہ مقدمہ ابن خلدون میں لکھا ہے کہ "وہ (یعنی خلفاء راشدین) اپنے فیصلوں میں خود اپنی غور و فکر یا استدلال قیاسی کی طرف رجوع نہیں کرتے تھے۔ .... لیکن جب اسلام مستحکم طور پر قائم ہو گیا اور اس کے اصول جڑ پکڑ گئے تو دور دراز کے لوگوں نے اسلام کی تعلیم اور دوسرے مسلمانوں سے جو صحابہ کے پیرو تھے حاصل کی اور پھر کچھ عرصہ کے بعد اسلام کی تعلیم میں کچھ ترمیم ہوئی چونکہ عدالت میں نئے نئے مقدمات آتے تھے اس لئے علماء نے قرآن و حدیث سے ایسے مسائل قیاس کرنے پڑے کہ جن سے وہ ان مقدموں کا فیصلہ کر سکیں۔"

دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اسلامی سلطنت پھیلنے لگی تو زندگی کی نئی صورتوں اور کیفیتوں کے حسب حال ایسے مسائل پیدا ہونے لگے کہ جن کے متعلق محمدؐ صاحب نے کوئی صریح ہدایت کھلے الفاظ میں نہیں دی تھی۔ ان حالات کے تحت نئے مسائل کے استخراج اور شرعی فیصلہ کی غرض سے ایسے اصول کی طرف رجوع کرنا پڑا جو قیاس کہلاتا ہے۔

قیاس

ممکن ہے کہ قیاس سے اس طور پر مسائل استنباط کرنے کی اصل محمدؐ صاحب کی زندگی کے اس واقعہ پر مبنی ہو کہ جس کے متعلق روایت ہے کہ ایک مرتبہ محمدؐ صاحب نے ایک شخص مسمی معاذ کو زکوٰۃ کا جمع کیا ہوا روپیہ وصول کر کے غریبوں پر تقسیم کر دینے کی غرض سے یمن بھیجنا چاہا اس کام پر مامور کرتے وقت محمدؐ صاحب نے پوچھا "اے معاذ تو کس قاعدہ پر عمل کریگا؟" اُس نے جواب دیا کہ "قرآن کے حکم کے مطابق" نبی نے کہا کہ "اگر اس معاملہ میں تجھے قرآن میں کوئی ہدایت نہ ملے؟" تو معاذ نے جواب دیا کہ پھر میں سنت نبوی کے موافق عمل کروں گا۔" پھر محمدؐ صاحب نے پوچھا کہ "اگر اس سے بھی تجھے کچھ نہ معلوم ہو؟" تو معاذ نے جواب دیا کہ "میں قیاس سے استنباط کر کے اس پر عمل کروں گا۔" لکھا ہے کہ تب محمدؐ صاحب نے ہاتھ اٹھا کر کہا کہ "سب تعریف اللہ کو ہے جو اپنے نبی کے قاصد کو جس طرح چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔"

قیاس سے مسائل استنباط کرنے کی چند مثالیں ذیل میں ہم پیش کرتے ہیں۔ قرآن میں لکھا ہے۔ "ماں باپ سے بھلائی کر .... اور

نہ اُن کو اُف کر اور نہ جھڑک۔" (سورہ بنی اسرائیل آیت ۲۴) اس سے قیاس کر کے یہ مسئلہ نکلتا ہے کہ والدین کی نافرمانی ممنوع ہے اور جو ممنوعہ احکام کو نہ مانے وہ مستوجب سزا ہے۔ پھر قرآن میں لکھا ہے کہ جو عورت کسی بچے کو دودھ پلائے تو اُس بچے کے باپ پر اس عورت کے نان ونفقہ کی کفالت فرض ہے۔ اس سے قیاساً یہ نتیجہ نکالا گیا کہ باپ پر بچے کے اخراجات کی کفالت بھی فرض ہے۔ پھر قرآن میں خمر یعنی مسکرات کا استعمال منع ہے تو اس سے شراب اور افیون کا حرام ہونا بھی قیاس کیا جاتا ہے اگرچہ اُن کے استعمال کی ممانعت قرآن میں اُن کا نام لے کر نہیں کی گئی ہے۔ وہابی اس ممانعت کو تمباکو کے استعمال تک وسعت دیتے ہیں۔ علاوہ ان کے ایک حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود محمدؐ صاحب نے بھی قیاس سے کام لیا ہے روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک عورت محمدؐ صاحب کے پاس آئی اور بولی کہ میرا باپ بغیر حج کئے مر گیا ہے۔ نبی نے پوچھا کہ اگر تیرا باپ کچھ قرض چھوڑ مرتا تو تو کیا کرتی۔ اُس نے کہا کہ میں اس قرض کو ادا کرتی۔ نبی نے جواب دیا اچھا اس قرض کو بھی ادا کر۔

قیاس کی یہ اصل ٹھیٹھ مسلمانوں کے اس پکے خیال پر مبنی ہے کہ اسلامی شریعت اس قدر مکمل ہے کہ مذہبی۔ جماعتی اور سیاسی زندگی کے کُل معاملات کی تفصیل اس میں موجود ہے۔ دوسرے لفظوں میں تمام پیچیدگیاں جن کا پیش آنا ممکن ہے ان کا حل محمدؐ صاحب کی تعلیم میں پایا جاتا ہے یعنی کہ شریعت کی جو باتیں نبی نے صاف اور کھلے طور پر نہیں بتائی ہیں وہ اُن کی تعلیم سے قیاس کے ذریعہ معلوم کی جا سکتی ہیں اور چونکہ تمام ابتدائی اصول قرآن وسنت میں موجود ہیں اس لئے جو کچھ ان کے مطابق نہیں وہ غلط ہیں

اب ان باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام درحقیقت ایک شرعی مذہب ہے اور مومن کی آزاد مرضی یا اُس کی اپنی ذاتی رائے پر کچھ نہیں چھوڑا گیا ہے خاندانی زندگی کے فرائض ۔ مجرموں کے لئے تعزیرات ۔ عامۃ الناس کے لئے آئین ۔ غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کے متعلق قوانین یہ تمام باتیں اسلامی شریعت نے مسلمانوں کے لئے مہیا کردی ہیں ۔ غرض کہ ایک مسلمان کی زندگی کے ہر پہلو میں رہنمائی کرنا اس کا مقصد ہے ۔ یہ سچ ہے کہ اس طریقہ سے اسلام میں ایک قسم کی یک رنگی پیدا ہوکر قائم رہتی ہے لیکن ذہنی آزادی کا اس سے نقصان ہوتا ہے ۔

اس موقعہ پر اسلام کی ایک اَور خصوصیت ہماری توجہ اپنی طرف مائل کرتی ہے یعنی علماء اسلام کا استدلال قیاسی کے استعمال سے متضاد نتائج پر پہنچنا ۔ اسلام کے آغاز میں جب علماء قرآن وسنت سے استدلال قیاسی کے ذریعہ نتیجہ استنباط کرتے تھے تو ایک دوسرے سے مختلف نتیجوں پر پہنچنے کا ہمیشہ امکان تھا اس باہمی اختلاف کے سبب جو دقت پیش آتی ہے اس کے دور کرنے کے لئے علماء دو اقوال پیش کرتے ہیں جو محمدؐ صاحب کی طرف منسوب کئے گئے ہیں ۔ پہلا یہ ہے امتی لا تجتمع علی ضلالۃ ۔ میری امت ہرگز گمراہی کی بات پر متفق نہیں ہوگی اور دوسرا یہ کہ اختلاف امتی رحمۃ میری امت کا اختلاف رحمت ہے یہ دونو احادیث صریحاً ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن علم فقہ کی کیونکر تدوین ہوئی اس کے سمجھنے میں ان سے مدد ملتی ہے ۔

اجماع

جب کوئی مشکوک معاملہ یا ایسے مسائل پیش آتے کہ جو متن مذکورہ

بالا اصول یعنی قرآن، سنت اور قیاس سے حل نہیں ہوتے تھے تو پھر اجماع یعنی مجتہدین کے اتفاق کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔ ابو بکرؓ کا عہدۂ خلافت کے لئے انتخاب اہل اجماع کے استعمال کی ایک اچھی اور نہایت سادہ مثال ہے۔ یہ عمل اجماعِ امت کہلایا جس کے معنی اسلامی جماعت کا کسی بات پر اتفاق کرنا ہے۔ صحاح ستہ کی چھ کتابوں اور مذاہب اربعہ کا قبول ہونا اجماعِ امت سے تھا۔ عام طور پر اجماع سے خاص علماء کا کسی مسئلہ پر اتفاق کر لینا سمجھا جاتا ہے اور یہ بھی شریعت کی ایک اصل بن گئی۔

سب سے پہلے یہ درست معلوم پڑتا ہے کہ صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین جس بات پر اتفاق کر لیں وہی داخلِ شریعت سمجھی جائے کیونکہ صحابہ نے براہِ راست محمدؐ صاحب سے تعلیم پائی تھی اور پھر ان باتوں کا علم صحابہ سے تابعین کو پہنچا تھا اور یہ سارے گروہ ایسے زمانہ میں تھے جو اسلام کا عہدِ زریں سمجھا جاتا ہے۔ بعض مسلمان صرف اجماعِ صحابہ کو مانتے ہیں لیکن اصل اجماع کو صرف صحابہ تک محدود رکھنا دشوار ہے۔

آخر کار جب قرآن یا حدیث میں کسی مسئلہ کی سند نہیں ملتی اور نہ اجماع کا کوئی فیصلہ ملتا ہے تو مجتہد بعض اوقات اپنی رائے سے کام لیتا ہے لیکن اس طریقہ پر بہت کم عمل ہوا ہے اور ایسا فیصلہ چہار اصولِ مذکورہ کے درجہ سے گرا ہوتا ہے۔

مذاہبِ اربعہ

اس قسم کے اصول سے جب نئے مسائل نکالے جائیں اور بعض معاملات میں ایک اصل کو دوسرے پر ترجیح دی جائے تو مختلف شرعی طریقوں کا پیدا

ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ان طریقوں کا نام مذہب پڑ گیا۔ ابتداءً بہت سے طریقے رائج تھے کیونکہ ہر ایک اپنی رائے کے مطابق چلنے کی کوشش کرتا تھا اور یوں بعض قرآن و سنت سے زیادہ اپنی رائے کے پیرو تھے۔

ان مختلف مذاہب نے قبولیت حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن ایک ایک کر کے سب مٹنے لگے یہاں تک کہ ساتویں صدی ہجری میں صرف چار مذاہب صحیح قرار پائے جن کے بانی یہ مشہور امام تھے یعنی امام ابوحنیفہ۔ امام ابن مالک۔ امام الشافعی۔ امام احمد بن حنبل۔ ان اماموں میں اگرچہ امتیازی خصوصیات بھی ذاتی طور پر تھیں تاہم سنیوں کے اعتقاد میں یہ چاروں امام یکساں راسخ الاعتقاد سمجھے جاتے ہیں اور ان کا شمار اول درجہ کے مجتہدوں میں ہے۔ اسلام میں عالم کے لئے سب سے بڑا درجہ مجتہد کا ہے۔ مجتہد اجتہاد کرنے والوں کو کہتے ہیں جو لفظ جہد سے نکلا ہے۔ جس کے لفظی معنی کوشش کے ہیں اور اصطلاحی معنی مشکوک اور شرعی مسائل میں غور و فکر کے ذریعہ کوئی رائے قائم کرنا ہے۔

ان چاروں اماموں کی اہمیت اور اثر اس حقیقت سے ظاہر ہے کہ سنیوں کے اعتقاد میں ان کے بعد پھر کوئی مجتہد نہیں ہوا۔ مثلاً ایک فقہ کی کتاب میں جو ہندوستان میں مروج ہے لکھا ہے کہ اجماع سے یہ مراد ہے کہ چاروں اماموں کے سوائے اور کسی کی پیروی جائز نہیں۔ اس زمانہ میں نہ قاضی کوئی حکم نہ مفتی خلاف رائے چار اماموں کے کوئی فتویٰ دے سکتا ہے .... کسی دوسرے کی پیروی جائز نہیں ہے۔" (ضوابط الفرقان صفحہ ۱۷)

(۱) امام ابوحنیفہ جو امام اعظم کے نام سے مشہور ہے اور جس کی شہرت باقی اماموں میں سب سے زیادہ ہے۔ ۶۹۹ء کو بصرہ میں پیدا ہوا لیکن اس

نے اپنی عمر کا زیادہ زمانہ کوفہ میں بسر کیا اور ۷۶۷ء کو بغداد میں انتقال کیا۔ امام مالک کے برعکس کہ جس نے اپنی زندگی مدینہ میں بسر کی کہ جہاں محمدؐ صاحب کی یاد تازہ تھی ابوحنیفہ نے اپنے فیصلوں کی بہت کم بنیاد احادیث پر رکھی۔ کوفہ میں بہتیری دیگر قوموں کے ساتھ اسلام کا تعلق ہوا۔ اور ان کے لئے صرف ایک ہی شریعت تھی یعنی قرآن جو محمدؐ صاحب پر نازل ہوئی تھی۔ قرآن کی بہتری آیتیں ان کے اس خیال کی صحت پر دلالت کرتی ہیں۔ مثلاً "اور ہم نے تم پر یہ کتاب نازل کی ہے جس میں ہر چیز کا بیان شافی ہے۔" (سورۂ نحل رکوع ۱۲ آیت ۹۱) "ہم نے لکھنے سے کوئی چیز فروگذاشت نہیں کی" (سورۂ انعام رکوع ۴ آیت ۳۸) پس اگر کسی مسئلہ کے متعلق کوئی آیت نہ ملتی تو قیاس سے کام لیا جاتا تھا اور اس حد تک ابوحنیفہ نے قیاس سے کام لیا کہ وہ اس اصل قیاس کا استاد مشہور ہو گیا۔

حنفی فقہ کے طریقۂ استدلال کی ایک مثال ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں:-

سورہ بقر کی ۲۷ آیت میں لکھا ہے "وہی قادرِ مطلق ہے جس نے تمہارے لئے زمین کی کل کائنات پیدا کی۔" حنفی مذہب والے اس کے یہ معنی لیتے ہیں کہ یہ آیت مسلمانوں کے لئے خدا کی طرف سے ایک ہبہ نامہ ہے کہ جس سے باقی تمام حقوقِ ملکیت ساقط ہو گئے ہیں۔ اس آیت میں مسلمانوں سے خطاب ہے اور "تمہارے" کی ضمیر ان کی طرف راجع ہے اور "زمین" تین حیثیتوں میں منقسم ہے۔

(۱) وہ زمین جس کا کبھی کوئی مالک نہ تھا

(۲) وہ زمین جس کا کوئی مالک تو تھا مگر اس نے چھوڑ دیا ہے۔

(۳) کافروں کی جان و مال۔ اس آخری تقسیم سے حنفی فقہا غلامی لوٹ

اور کفار کے خلاف ہمیشہ جنگ کرنے کو جائز ٹھہراتے ہیں۔
ابوحنیفہ نے بہت کم حدیثوں کو مستند قرار دے کر اپنی فقہ میں داخل کیا ہے۔ لیکن اُس کے پیرووں نے اور خصوصاً ابوحنیفہ کے شاگرد محمدؒ اور ابو یوسف نے احادیث کا استعمال زیادہ آزادی کے ساتھ کر کے اس طریقہ میں بہت کچھ ترمیم کر دی ہے۔
(۲) امام ابن مالک۔ ۷۱۱ئہ کو مدینہ میں پیدا ہوا اور بیاسی[۲] سال کی عمر میں وہیں انتقال کیا۔ محمدؐ صاحب کی زندگی کا جو کچھ اثر مدینہ میں تھا۔ امام مالک نے اس قدر اپنے اندر جذب کیا کہ اپنے طریقہ کی بُنیاد سنت مدینہ پر رکھی اور درحقیقت مدینہ دارالسنّت کہلاتا بھی تھا۔ مالک نے یہ کام کیا کہ جو حدیثیں مدینہ میں مروّج تھیں انہیں ترتیب دے کر اور جمع کر کے اُن سے اور نیز دستورات مدینہ سے شریعت کا ایسا علم نکالا جو زندگی کے کل معاملات پر حاوی ہو جو کتاب اس نے تالیف کی اُس کا نام اُس نے موطّی رکھا۔ لفظ موطی کے معنی ہیں ایسی راہ جو لوگوں کے چلنے سے بن جائے اس کتاب کا زیادہ تر حصّہ صحابہ کے شرعی اقوال اور اُن کی آراء پر مبنی ہے اس کی خوشی حدیثوں کے جمع کرنے اور یاد کرنے میں تھی۔ کہتے ہیں کہ جب اس کی موت کا وقت قریب آیا تو اُسے ایک ڈر تھا کہ مبادا اُسنے کوئی شرعی فیصلہ اپنی رائے سے نہ کر دیا ہو۔
(۳) امام شافعی کا خاندانی تعلق سلطنت عباسیہ کے بانی کے ساتھ تھا۔ اُس کی پیدائش ۷۶۷ئہ کو ملک فلسطین میں ہوئی۔ قرآن۔ سنت اور اقوال صحابہ کے جاننے میں اُس کے مرتبہ کا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ اُس نے ابوحنیفہ اور امام مالک دونوں کے اجتہادات کو بغور پڑھنے کے بعد جو کچھ بہتر

جانا اخذ کر کے اپنا علیحدہ اجتہاد قائم کیا۔ امام شافعی کا یہ اجتہاد حنفی اور مالکی مذاہب کی متضاد باتوں میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش ہے۔ وہ اور اُس کے پیرو کم از کم ہر چہار اصل کے مراتب زیادہ درستی کے ساتھ قائم کرنے میں کامیاب ہوئے اور قیاس کے لئے کہ جس کے استعمال میں غلطی کا احتمال تھا اُس نے قاعدے مقرر کئے۔

(۴) امام ابن حنبل ۸۰۳ء کو بغداد میں پیدا ہوا۔ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ مسند نام مجموعہ احادیث کا یہ مؤلف ہے۔ عرصہ تک محض محدثین میں اس کا شمار رہا اور اس لئے جب اس کے پیروؤں نے اس کے طریقہ اجتہاد کو ایک علیحدہ مذہب قرار دینا چاہا تو لوگوں نے بڑی مخالفت کی اور بڑی سخت جد وجہد کے بعد اس چوتھے مذہب نے سنیوں میں جگہ پائی۔ حنبلی مذہب عمداً اور راسخاً قرآن وحدیث کے اصول کا اعادہ ہے اور اس کا نصب العین مخالفانہ ہے۔ اس مذہب میں قرآن وحدیث کے ظاہری معنی لئے جاتے ہیں۔ اور چاروں مذاہب میں تصوّف کی سب سے زیادہ مخالفت اس میں پائی جاتی ہے۔

اس قسم کے کٹر اسلامی خیالات کے رائج کرنے کا سبب یہ معلوم پڑتا ہے کہ امام ابن حنبل کے زمانہ میں خلیفہ ماموں کی سلطنت تھی اور امام ابو حنیفہ کی تعلیم کو زیادہ رواج تھا۔ امام حنبل کے خیال میں امام ابو حنیفہ کے لوگ خلیفہ کو خوش کرنے کی غرض سے قیاس کے استعمال کو خطرناک حد تک وسعت دے کر خلیفہ کی مرضی کے موافق مسئلے نکال لیا کرتے تھے اس لئے اس ڈر سے کہ دین کی حالت اس سے خطرناک ہو جائے گی۔ قیاس کی اصل کو اُس نے بالکل ترک کر دیا لیکن اُس نے یہ بھی دیکھا کہ مالک

کا مذہب کہ جس کی بنیاد سنت مدینہ پر تھی۔ اسلامی سلطنت کی ضروریات کو جو سلطنت کہ اب تیزی سے پھیل رہی تھی پورا کرنے کے لئے کافی نہیں تھا۔ بہرحال اپنے مذہب کو احادیث کی بنیاد پر قائم کرنے کے سوا کہ جو اس کے نزدیک زیادہ یقینی تھے اُس نے اوروں سے بہتر کوئی ترمیم نہیں کی۔

مذاہب اربعہ کی امتیازی خصوصیات

ان چاروں مذاہب کے خیالات کا عام رجحان کیا ہے اس کی تشریح میں ان کے چند فیصلے بطور مثال اب ہم پیش کرتے ہیں۔ مثلاً ان کے سامنے قرآن کا یہ مسئلہ پیش تھا جس پر کچھ ہی عرصہ پیشتر بہت بحث ہو چکی ہے کہ قرآن کا ترجمہ کرنا جائز ہے یا نہیں۔ مذہبی رسوم اور عبادت میں قرآن کے استعمال پر چاروں مذاہب متفق الرائے ہیں لیکن امام شافعی کا صاف فیصلہ یہ ہے کہ نماز میں قرآن کی تلاوت عربی ہی میں ضرور ہونی چاہئے۔ اس کے برعکس ابوحنیفہ عجمیوں کو جو عربی تلفظ ادا کرنے سے قاصر ہیں اس قاعدہ سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں۔ پھر اسی مسئلہ سے تعلق رکھتا ہوا ایک اور سوال ہے کہ غیر مسلموں کو قرآن سکھانا جائز ہے یا نہیں۔ اب قرآن کی تعلیم دینے میں اس کے متن کا ترجمہ لازمی طور پر کرنا پڑتا ہے۔ ابوحنیفہ کو جو اوروں کے مقابل میں زیادہ آزاد خیال ہے اس کے جائز ٹھہرانے میں کوئی دقت نظر نہیں آئی وہ حدیث سے اس معاملہ میں سند پکڑتا ہے اور یہاں اس کی رائے حنبلی مذہب کے فیصلہ کے مطابق ہے امام شافعی اس مسئلہ کے موافق اور مخالف دلائل پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہے لیکن امام مالک اس کے بالکل مخالف ہے اور وہ اس دوسرے مسئلہ یعنی قرآن کے پورے ترجمہ کئے جانے کے بھی سخت خلاف ہے۔ امام شافعی پہلے مسئلہ کی

مانند اس دوسرے مسئلہ کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ کرنے سے جھجکتا ہے۔ حنفی اور حنبلی قرآن کا بین السطور ترجمہ کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ جیساکہ آجکل فارسی۔ اردو۔ انگریزی وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔ اُن کے نزدیک ایسا ترجمہ چھاپنا بھی جائز ہے کہ جس میں ایک ہی صفحہ پر ایک طرف عربی متن اور دوسری طرف ترجمہ ہو۔

دیگر معاملات میں اُن کے فیصلوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہر مسئلہ میں متفق الرائے نہیں ہیں مثلاً اس اہم مسئلہ کے متعلق کہ جہاد کے قیدیوں کے ساتھ کیا کرنا چاہیئے ابو حنیفہ کا فیصلہ ہے کہ اُن کو سزائے موت دی جائے یا غلام بنا کر رکھا جائے۔ الشافعی اُن کو فدیہ دے کر یا بالغیر فدیہ لئے ہوئے بھی آزاد کر دینا جائز بتاتے ہیں۔ اسلام کے مرتدوں کے متعلق بھی ان اماموں کی رائے میں اختلاف ہے۔ ابو حنیفہ کی رائے ہے کہ سزا سے پیشتر اُن کو توبہ کی مہلت دینی چاہیئے۔ امام مالک کے فیصلہ کے مطابق اس مہلت کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کی اور امام شافعی کی رائے ہے کہ مرتد کو خواہ مرد ہو یا عورت قتل کر ڈالنا چاہیئے۔ ابو حنیفہ کا فیصلہ ہے کہ مرتد اگر عورت ہو تو بجائے قتل کے تنہائی میں قید کر دی جائے۔ ان اماموں کا اتفاق ایسے معاملات میں بھی نہیں ہے جہاں ان کے باہمی اختلافات کی توقع بہت کم ہے مثلاً حمل کی شرعی مدت کس قدر ہونی چاہیئے۔ اس مسئلہ میں امام مالک کی رائے باقی تین اماموں کی رائے کے مقابلہ میں حدِ اعتدال سے تجاوز کر گئی ہے۔ اس کے خیال میں حمل کی مدت چار برس تک ہو سکتی ہے جس سے یہ مہمل نتیجہ نکالا گیا ہے کہ باپ کی موت کے تین برس بعد اگر کوئی بچہ پیدا ہو تو وہ قانوناً جائداد کی وراثت کا دعوےٰ کر سکتا ہے۔ اس قسم کے استدلال کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ معاملات

کی فرضی صورتیں تصوّر کر لی گئیں اور پھر اُن پر عائد کرنے کے لئے شرعی قوانین اور اُن کی مستثنیٰ صورتیں نکالی گئیں جس سے علماء کو فرضی معاملات میں اپنی ذکاوت کا استعمال نہایت بے تکے طور پر کرنے کی ترغیب ہوئی۔ مختلف قسم کے حالات تصوّر کر لئے گئے ہیں اور پھر ان پر نہایت اہمیّت کے ساتھ بحث کی گئی ہے مثلاً اگر جنات کے ساتھ کسی بشر کی شادی ہو جائے تو مسئلہ وراثت پر کوئی اثر پڑیگا یا نہیں۔ غرض کہ اس طور سے معقولات کا ایسا ذخیرہ سُنّیوں کی فقہ میں آ گیا ہے کہ جن میں اصل مطلب سے گریز کرنے کی گنجائش ہو گئی ہے اور جس سے مومنین کو شریعت کی لفظی پیروی کرنے کی اجازت مل جاتی ہے تاکہ اُس کے اصل مقصد کے خلاف زیادہ آسانی سے عمل کر سکیں۔

بہرحال یہ چاروں امام اسلام کی کُل اصولی باتوں میں ہم خیال سمجھے جاتے ہیں اور ان کا "اجماع" ایسی ایک شریعت کے قیام کے لئے کافی مانا جاتا ہے کہ جس کے احکام تمام سُنّیوں پر جاری ہوں۔ ان ہی سنیوں سے کٹر مسلمانوں کی جماعت بنتی ہے کہ جس میں اہل اسلام کا ایک بڑا حصّہ پایا جاتا ہے۔ سُنّیوں کا یہ عقیدہ ہے اور اس سے اہل شیعہ کو اختلاف ہے کہ چار اماموں کے وقت سے آج تک کوئی مجتہد اوّل مرتبہ کا نہیں گزرا ہے کہ جسے ان اماموں کی مانند شرع میں اختیارِ مُطلق حاصل ہو۔ مسلمانوں کی کتابوں میں اس قسم کے جملے اکثر پائے جاتے ہیں۔ "ہم چاروں اماموں کی تقلید میں مقید ہیں۔" پھر "یہ خدا کا فضل ہے کہ ہم چار اماموں کی تقلید میں مقید کر دیئے گئے ہیں۔ خدا کو یہ تقلید پسند ہے اور اس میں ثبوت اور استدلال کی کچھ ضرورت نہیں پڑتی۔"

ہر مسلمان کو چاروں مذاہب میں سے کسی ایک مذہب کی تقلید کرنی اور پھر اُس مذہب کی فقہ کے مطابق زندگی بسر کرنا ضرور ہے لیکن یہ لازمی نہیں

ہے کہ کوئی صرف ایک ہی مذہب کا مقلد عمر بھر بنا رہے۔ اگر وہ چاہے تو کسی دوسرے امام کا مذہب اختیار کر سکتا ہے۔ چنانچہ ممکن ہے کہ ایک ہی خاندان میں باپ کسی امام کی تقلید کرتا ہو اور بیٹا کسی دوسرا امام کا مقلد ہو۔

مذاہبِ اربعہ کی موجودہ حالت

راسخ الاعتقاد علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ چوتھی صدی ہجری سے "اجتہاد کا دروازہ بند ہے"۔ اب علماء جو کچھ کر سکتے ہیں وہ یہی ہے کہ چاروں اماموں کے اجماع کی تشریح کریں۔ مومنین اپنے کسی شک کے مٹانے یا کسی مسئلہ کے حل کرانے کے لئے یا کسی تصفیہ طلب عقیدہ کے فیصلہ کی خاطر علماء کی طرف رجوع کرتے ہیں اور جو تحریری جوابات علماء سے حاصل کرتے ہیں اُن کی بنیاد اُن اصول پر ہوتی ہے۔ (۱) قرآن (۲) سُنت (۳) مذاہبِ اربعہ کی تعلیم (۴) اجماع۔ انہیں سے علماء کا فتوےٰ بنتا ہے۔ فتوےٰ دینے والوں کو مفتی کہتے ہیں اور علماء میں ان کا بڑا مرتبہ ہے لیکن آج کل کے جدت پسند مسلمان اس تصور کے سخت مخالف ہیں کہ سارے فیصلے گزرے زمانہ کے اجماع تک محدود ہیں۔ اُن کے خیال میں علماء اس تعلیم سے ایسی خطا کے مرتکب ہیں کہ جو مذہب کے نام پر اسلام کے خلاف اُن سے سرزد ہوئی ہے۔

حنفی مذہب کے پیرو ترکی۔ وسط ایشیا اور شمالی ہند میں پائے جاتے ہیں۔ ان کا شمار قریباً بیس کروڑ ہے۔ ان سے دوسرے درجہ پر شافعی ہیں جن کی تعداد دو کروڑ ۸۰ لاکھ ہے۔ یہ بہت جلد اپنے وطن عراق سے نکال دیئے گئے اور جنوبی عرب۔ مشرقی افریقہ۔ جنوبی ہند۔ جزائر ہند۔ فلسطین حجاز اور مصر میں بس گئے۔ امام شافعی کی قبر قاہرہ میں ہے اور وہاں کی مشہور

مسجد الازہر میں اس کی تعلیم برابر دی جاتی ہے۔ مالکیوں کا شمار اب ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ہے اور وہ مغرب اور سارے شمالی افریقہ میں سوائے جنوبی مصر اور عرب کے اُن اضلاع میں جو خلیج فارس کے ساحل کے قریب ہیں پائے جاتے ہیں۔

امام ابن حنبل کا مذہب قریب قریب معدوم ہو چلا ہے۔ یہ غور طلب بات ہے کہ مکہ میں اس مذہب کا کوئی مفتی اب نہیں ہے۔ حنبلیوں کا شمار اب قریب ساٹھ لاکھ ہے۔ لوگوں میں امام حنبل کے نام کی عزت خاص کر اس لئے باقی ہے کہ اُس نے حدیث کو بہت اہمیت دی اور یہی وجہ ہے کہ اٹھارہویں صدی مسیحی میں وہابیوں کی بغاوت سے امام حنبل کے مذہب کو وسط عرب میں کچھ عرصہ کے لئے پھر فروغ ہو گیا تھا لیکن اب یہ زوال پذیر ہو رہا ہے۔

اسلام کے ابتدائی مطالعہ کی اس کتاب میں فقہ یعنی اسلامی شریعت کے بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اسی باب میں اسلامی تعلیم کی اس شاخ یعنی فقہ کا ذکر ضمناً آچکا ہے۔ اس میں ہر قسم کے مذہبی۔ رسمی۔ دیوانی اور فوجداری قوانین شامل ہیں۔ یہاں اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ سارے فقہ کی بنیاد چہار اصول پر ہے جن کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے۔

تیسرا باب

پہلی فصل

عقائد

اسلام کے مرکزی اصول دو ہیں یعنی خدا کی توحید اور محمد صاحب کی رسالت۔ یہ دونو باتیں اسلام کے مختصر اور مشہور عقیدہ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ میں پائی جاتی ہیں اور تمام اسلامی الٰہیات انہیں دو اعتقادات پر مبنی ہے اور اگرچہ اسلامی تعلیم کی تشریح مختلف طریقوں سے کی گئی ہے کہ جس سے مختلف فرقے پیدا ہو گئے ہیں تاہم ایمان کی اس دو اصولی تعلیم کے ماننے اور عقیدہ کو اس مختصر جملہ کی صورت میں دوہرانے میں تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔

عقیدے کے یہ الفاظ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے کان میں سنائے جاتے ہیں اور جب ذرا بڑا ہوتا ہے تو پہلے اسے یہی کلمہ پڑھنا سکھایا جاتا ہے دیندار مسلمان ہر دفعہ پر اس عقیدہ کے الفاظ کا دوہرانا مستحسن سمجھتا ہے اور اُس کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ دم واپسیں اُس کی زبان پر اسی کلمہ کا ورد ہو۔

ہم پڑھ چکے ہیں کہ کس طرح قرآن اسلامی شریعت کا سرچشمہ ہے اور قرآن ہی سے یہ مختصر عقیدہ بھی نکلا ہے لیکن اس کے دونو اجزا قرآن

میں کہیں بھی ایک ساتھ نہیں آئے ہیں بلکہ دو مختلف سورتوں سے ماخوذ ہیں یعنی سورہ محمد کی اکیسویں[۲۱] آیت اور سورۃ الفتح کی انتیسویں[۲۹] آیت سے یہ کلمہ ترکیب پاتا ہے۔ اس سے اس بات کی بھی توضیح ہو جاتی ہے جو ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ قرآن کی تعلیم باترتیب نہیں ہے۔ ارکانِ ایمان کے جمع کرنے اور اسلام کی تعلیمات کا ترتیب دینے کا کام جو قرآن میں ادھر ادھر پھیلے ہوئے ہیں آنے والی نسلوں کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس فصل میں اور اس کے بعد کی فصل میں ہم ان کی محنتوں کے نتیجوں کا مطالعہ کریں گے۔

مسلمانوں سے اسلام کے دو خاص مطالبات ہیں اوّل ایمان اور دوم دین۔ یہاں دین سے مراد عملی باتیں ہیں۔ اس فصل میں ہم پہلے صرف ایمان کا بیان کریں گے۔

مسلمانوں نے ایمان لانے کے لئے یہ ضروری ٹھہرایا ہے کہ اس کا زبان سے اقرار کیا جائے اور دل سے تصدیق کی جائے۔ اس اقرار کی حسب ذیل دو صورتیں ہیں۔

(۱) "میں ایمان لاتا ہوں اللہ پر جیسا کہ وہ ہے اپنے ناموں اور اپنی صفات کے ساتھ اور اس کے سب احکام کو قبول کرتا ہوں۔" دوسری صورت اقرار کی زیادہ مفصل ہے۔

(۲) "میں ایمان لاتا ہوں اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر اور اس بات پر کہ ٹھہرانا نیکی و بدی کا سب خدا کی طرف سے ہے اور موت کے بعد جی اٹھنے پر۔"

ایمان کا پہلا رکن اللہ کو ماننا ہے یعنی یہ کہ "میں ایمان لایا اللہ پر۔" ایمان کے اس رکن کی نہایت مشہور صورت جس میں یہ ادا کی جاتی ہے وہ مختصر

عقیدہ یعنی کلمہ کا پہلا جزو ہے گویا کہ مسلمان کہتا ہے کہ "مَیں ایمان رکھتا ہوں کہ کوئی معبود نہیں مگر اللہ۔" خدا پر ایمان لانے کے اس پہلو یعنی توحید پر مسلمان بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔ اس توحید کا مطلب یہ ہے کہ "خدا ایک ہے کوئی اس کی مانند نہیں ہے وہ سب سے جُدا ہے اور اس کا کوئی ہمسر نہیں۔" قرآن میں شدت سے ایسے جملے بتکرار دوہرائے گئے ہیں کہ جن سے توحید کا اظہار ہوتا ہے۔ ذیل کی چار آیتوں والی ایک چھوٹی سی سورت کا جو توحید کے مضمون پر ہے تہائی قرآن کے برابر بتایا جانا توحید کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یہ چھوٹی سورۃ سورۃ اخلاص کہلاتی ہے۔ "اُن سے کہو کہ وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے نہ اُس سے کوئی پیدا ہوا اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ کوئی اُسکے برابر کا ہے۔"

بعض اوقات مسلمان دعوے کرتے ہیں کہ عربی لفظ اللہ خدا کا ایسا نام ہے جو محمدؐ صاحب پر نازل کیا گیا تھا اور انہوں نے ہی پہلے خدا کی وحدانیت کی اس نام سے منادی کی لیکن سچ تو یہ ہے کہ اسلام سے پہلے مسیحیوں اور بُت پرستوں کی کتابوں میں لفظ الٰہ کسی معبود کے لئے استعمال ہوتا تھا اور الُالٰہ کہ جس کا مخفف اللہ ہے خدائے برتر کے لئے مستعمل تھا۔ محمد صاحب سے صدیوں پیشتر عرب کعبہ کو بیت اللہ کہتے تھے۔ الٰہ غالباً خدا کے عبرانی ناموں ایل۔ الوہ۔ الوہیم سے مشتق ہے۔

اسلامی الٰہیات کا ایک بڑا حصہ خدا کی ذات اور صفات کی بحث سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ صفات شمار میں سات ہیں اور انہیں صفات السبع کہتے ہیں۔ ان صفات کا مختصر خلاصہ حسبِ ذیل ہے۔

(۱) حیات۔ اللہ کی ہستی کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا۔ اگر وہ چاہے

تو ایک لحظہ میں تمام عالم کو ناپید کر دے اور چاہے تو ایک دم میں پھر پیدا کر دے۔ اگر تمام کافر مومن بن جائیں تو اُسے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ اسی طرح اگر سب ایمان دار کافر ہو جائیں تو اُس کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

(ب) علم۔ اللہ علیم کل ہے۔ اُسے سب چیزوں کا علم ہے۔ خواہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔ آسمان کے اوپر ہوں یا زمین کے نیچے۔ ماضی اور مستقبل کے تمام واقعات سے وہ واقف ہے۔ وہ بھول چوک اور سہو و خطا سے پاک ہے۔ اس کا علم قدیم ہے یعنی یہ علم اُس کی ذات کے بعد حاصل نہیں ہوا بلکہ ہمیشہ سے ہے۔

(ج) قدرت۔ اللہ قادرِ مطلق ہے اگر وہ چاہے تو مُردوں کو زندہ کر دے اور پتھروں کو گویائی اور درختوں کو رفتار کی طاقت عطا کر دے اور اگر اُس کی مرضی ہو تو آسمان و زمین کو فنا کر کے دوبارہ پیدا کر دے۔

(د) ارادہ۔ اللہ جو چاہے کر سکتا ہے اور جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ ہر چیز بھلی یا بُری اس دنیا میں اُس کی مرضی سے ہے۔ مومن کا ایمان۔ دین دار کا تقویٰ۔ کافر کا کفر اور شریروں کی بے دینی سب اُسی کے ارادہ سے ہے۔ جو کچھ ہم کرتے ہیں سب اُسی کے ارادہ سے ہوتا ہے۔ اُس کا ارادہ قدیم ہے۔ اُس کی ذات کا مؤخر نہیں ہے۔

(ہ) سمع۔ اللہ سب آوازیں سُنتا ہے۔ وہ بغیر کانوں کے سُنتا ہے کیونکہ اُس کی کوئی صفت آدمی کی مانند نہیں ہے۔

(و) بصر۔ اللہ سب چیزوں کو دیکھتا ہے۔ یہاں تک کہ تاریک رات میں سیاہ پتھر پر کالی چیونٹی کے قدم کو بھی دیکھتا ہے۔ پھر بھی اُس

کی آدمیوں کی سی آنکھیں نہیں ہیں۔

(ز) کلام ۔ اللہ کلام کرتا ہے لیکن آدمیوں کی طرح زبان سے نہیں وہ اپنے بعض بندوں سے بغیر وساطت کے کلام کرتا ہے جیسا کہ اُس نے موسیٰ سے کلام کیا اور بعضوں سے جبرئیل کی وساطت سے کلام کرتا ہے اور یہی معمولی طریقہ نبیوں کو اپنے ارادے سے مطلع کرنے کا ہے۔

یہ خدا کی سات صفات ہیں لیکن ان کی اصلیت اور وسعت میں کہ کہاں تک انسان کو ان کی نسبت علم حاصل ہو سکتا ہے اختلاف رہا ہے اور ہے۔ راسخ الاعتقاد علماء نے خدا کے بارے میں زیادہ باریکی کے ساتھ تحقیق کرنے سے تاکیداً منع کیا ہے۔ بلکہ خدا کی ذات کے متعلق تجسس کرنا بھی بدعت قرار دیا ہے۔ تاہم سورہ آلِ عمران کی پانچویں آیت کی وقف کی ذرا سی تبدیلی سے مختلف معنیٰ پیدا ہو جانے کے سبب اسلام میں اختلافِ مذاہب پیدا ہو گیا ہے۔ زیادہ راسخ الاعتقاد علماء جو بعض اوقات صفاتیاں کہلاتے ہیں ان کا اعتقاد ہے کہ خدا کی صفات اُس کی ذات میں قدیم ہیں لیکن اس طرح کہ نہ ذات سے علیحدہ ہیں اور نہ ان میں کوئی تغیر ہوتا ہے۔ بعض ایسے الفاظ بھی قرآن میں خدا کے متعلق آئے ہیں جن سے الٰہیات کے مسئلہ میں دقت پڑتی ہے مثلاً ہاتھ۔ آنکھ۔ چہرہ صفاتیوں نے ان کی تشریح کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ جیسے لکھے ہیں ویسے ہی ان کو قبول کیا ہے۔

صفاتیوں کے برعکس معتزلہ فرقہ اس عقیدہ کا انکار کرتا ہے کہ صفاتِ الٰہی ازلی ہیں۔ انہوں نے خدا کی صفات سمع۔ بصر اور تکلم کا بھی انکار کیا کیونکہ یہ ایسے اعتراض ہیں جو موجودات ذی جسم سے مخصوص ہیں۔ وہ صفات کو تجرید ذہنی سمجھتے تھے جن کا خدا کی ذات میں کوئی وجود نہیں ہے۔ مثلاً جہاں کہیں

قرآن کا فقرہ "خدا کا ہاتھ"، آیا ہے اس سے انہوں نے خدا کی قدرت اور مہربانی مُراد لی ہے۔

بغداد میں معتزلوں کے اس آزاد خیال فرقہ نے اپنے ہم خیال خلفاء کے عہدِ سلطنت میں کچھ عرصہ تک ترقی کی یہاں تک کہ ایک مذہبی مصلح جس کا نام الاشعری ہے پیدا ہوا جس نے اس فرقہ کو زوال پہنچایا۔ اُس نے یہ کام اس طرح کیا کہ معتزلوں کے علم الکلام کے طریقے کو راسخ الاعتقاد اسلام کی تائید میں استعمال کیا۔ اُس وقت سے الاشعری کے اصول اور طریقے دنیائے اسلام کے ایک بڑے حصے پر حاوی رہے ہیں۔

اس سے درحقیقت یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کلمے کے پہلے جزو کا لگاتار اعلان یہ ہے کہ راسخ الاعتقاد علماء اسلام کا اصلی تصوّرِ خدا سلبی ہے۔ وہ بے مثل ہے اور محض ایک اکائی ہے اور کسی مخلوق سے کہ جس میں مشابہت پائی جائے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ خدا کی تعریف زیادہ تر سلبی صفات سے کی گئی ہے جس کا اظہار عربی کے اس مقبول عام قول میں کیا گیا ہے۔

کُلّ مَا خَطَرَ فِی بَالِكَ فَهُوَ هَالِكٌ ؛ وَاللّٰهُ بِخِلَافِ ذَالِكَ

یعنی جو کچھ خیال تمہارے دماغ میں ہو وہ مٹنے والا ہے اور اللہ اس کے برعکس ہے۔ اسلام میں اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام آئے ہیں جو اسماء الحسنیٰ کہلاتے ہیں اُن کے مطالب پر غور کرنے سے خدا کے اسلامی تصوّر کو کچھ حد تک ہم سمجھ سکتے ہیں۔

یہ اسماء الحسنیٰ دو قسم کی صفات پر عموماً منقسم کئے جاتے ہیں۔

(۱) اسماءِ جلالی یعنی جن ناموں سے خدا کا جلال ظاہر ہوتا ہے۔

(۲) اسماءِ جمالی یعنی جن ناموں میں خدا کی جمالی صفات کا بیان پایا جاتا

ہے۔

اسماءِ جلالی پر نہ صرف قرآن وحدیث میں زیادہ زور ڈالا گیا ہے بلکہ ایک ٹھیٹھ مسلمان کی روزانہ زندگی میں بھی اس کا بہت زیادہ اثر ہے۔

ان ناموں کے مطالب پر علیحدہ علیحدہ غور کرنے سے ذیل کی باتیں نکلتی ہیں۔

سات ناموں پر خدا کی وحدانیت اور اُس کے ہستئ مطلق ہونے کا بیان پایا جاتا ہے۔

پانچ ناموں سے اس کے خالق ہونے کا یا کائنات کے مبداء ہونے کا اظہار ہوتا ہے۔

چوبیس نام اُسے صفات رحمٰن اور رحیم سے موصوف کرتے ہیں لیکن اُس کی یہ صفات مومنوں کے لئے مخصوص ہیں۔ یہ واقعی اسماءِ الحسنیٰ ہیں اور اکثر قرآن میں آئے ہیں اور ان میں سے صفات رحمٰن اور رحیم اس مشہور دعائیہ جملہ میں آتے ہیں جو تسمیہ یعنی بسم اللہ کہلاتا ہے اور جو سوائے سورۃ توبہ کے قرآن کی ہر سورت کے شروع میں آیا ہے۔

ان کے علاوہ اور یہ ہیں غفّار۔ رزّاق۔ لطیف۔ حلیم۔ جمیل۔ کریم۔ مجیب۔ ولی۔ ودود۔ البرّ۔ اللہ کی چھتیس ۳۶ صفات سے اس کی قدرت اکبر اور اختیار مطلق کا اظہار ہوتا ہے یہ اُس کی جلالی صفات ہیں۔ پانچ نام بتاتے ہیں کہ وہ ایذا دیتا اور انتقام لیتا ہے۔ وہ ایسا خدا ہے جو گمراہ کرتا۔ بدلہ لیتا اپنی رحمت کو روک لیتا اور ضرر پہنچاتا ہے۔ چنانچہ دیکھو سورۃ الانعام آیت ۳۹ سورۃ السجدہ ۲۲ آیت۔ سورۃ الرعد ۳۳ آیت۔ سورۃ الجاثیہ ۲۲ آیت۔

چار نام خاص معنی میں خدا کی اخلاقی صفات کا اظہار کرتے ہیں۔

ناموں کی اس تقسیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد صاحب کے خیال میں قطعی طور پر خدا کی صفات کا تصوّر نہ صرف مادی تھا بلکہ اس کی اخلاقی صفات کا تصوّر بھی اُن کے خیال کے مطابق ناقص تھا چنانچہ قرآن میں لکھا ہے کہ خدا بہتر مکر کرنے والا ہے (دیکھو سورۃ آل عمران ۴۷ آیت ۔ سورۃ الانفال آیت ۳۰)

گناہ کے موضوع پر اسلامی علماء نے جو کچھ لکھا ہے اُس سے بھی خدا کے اسلامی تصوّر پر روشنی پڑتی ہے ۔ جن چیزوں سے خدا نے منع کیا ہے وہ گناہ ہیں ۔ اس لئے قرآن میں بار بار حلال اور حرام پر زور دیا گیا ہے ۔ اسلامی علماء کے نزدیک گناہ دو طرح کے ہیں ۔

(۱) کبیرہ یعنی بڑے گناہ ۔ جن میں سے بعض یہ ہیں ۔ خون کرنا ۔ زنا کرنا ۔ خدا یا والدین کی نافرمانی کرنا ۔ جہاد سے بھاگنا ۔ شراب پینا ۔ سود لینا ۔ جمعہ کی نماز اور رمضان کے روزے سے بے پرواہی کرنا ۔ قرآن یاد کر کے بھول جانا ۔ جھوٹی قسم کھانا یا خدا کے سوا اور کسی کے نام پر قسم کھانا ۔ جادو کرنا ۔ جُوا کھیلنا ۔ ناچنا ۔ ڈاڑھی منڈانا وغیرہ ۔ صرف توبہ کرنے سے یہ گناہ معاف ہوتے ہیں ۔

(۲) صغیرہ ۔ یعنی چھوٹے گناہ ۔ جن میں سے بعض یہ ہیں ۔ جھوٹ بولنا ۔ دھوکا دینا ۔ غصہ کرنا ۔ شہوت پرستی کرنا وغیرہ ۔ اگر کبیرہ گناہوں سے اجتناب کیا جائے اور کچھ نیک کام کئے جائیں تو اس قسم کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں ۔ چنانچہ قرآن میں لکھا ہے " دن کے دونوں سرے یعنی صبح اور شام اور اوائل شب نماز پڑھا کرو کیونکہ نیکیاں گناہوں کو دور کرتی ہیں ۔ (سورۃ ہود ۱۱۶ آیت)

مگر سب سے بڑا گناہ شرک ہے یعنی خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنا ۔

اسلام میں یہ ایک ایسا گناہ ہے جو معاف نہیں ہوتا۔

(۲) فرشتوں کا عقیدہ۔ خدا کے فرشتوں کی خواہش اور اُن کے کام اُس کے احکام کو پورا کرنا ہے۔ ان میں مرد و عورت نہیں ہوتے اور نہ یہ کھاتے پیتے ہیں۔ فرشتوں میں سے بعض آسمان پر رہتے ہیں اور بعض زمین پر ہیں بعض جو زمین پر ہیں وہ انسان پر مامور ہیں جن کے وہ اعمال لکھا کرتے ہیں۔ خاص بڑے فرشتے چار ہیں۔ اوّل جبرائیل وحی لانے والا فرشتہ۔ دوسرے میکائیل جس کے سپرد ساری جاندار مخلوقات کی روزی کی نگرانی کا کام ہے۔ تیسرے عزرائیل جو لوگوں کی موت کے وقت اُن کی جان قبض کرتا ہے۔ چوتھے اسرافیل جو محشر کے روز صُور پھونکے گا۔ یہ تمام فرشتے بے گناہ ہیں لیکن ابلیس یعنی شیطان آدم کو سجدہ کرنے کے انکار کے سبب آسمان سے نکالا گیا (سورۃ الحجر آیت ۳۰-۳۲)

مسلمان یہ بھی مانتے ہیں کہ فرشتے لوگوں کی شفاعت کرتے ہیں اور ان میں یہ عام عقیدہ ہے کہ ہر انسان کی داہنی طرف ایک فرشتہ ہے جو اُس کی نیکیوں کو لکھتا ہے اور دوسرا بائیں طرف ہے جو اُس کی بُرائیوں کو لکھتا ہے (دیکھو سورۃ یونس ۲۳ آیت) اُن کے علاوہ دو ہیبت ناک سیاہ فرشتے ہیں جن کا نام منکر اور نکیر ہے جو قبر میں مُردے کے پاس آکر اُس سے سوال کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ تیرا خدا کون ہے۔ تیرا دین کیا ہے۔ تیرا رسول کون ہے وغیرہ۔

(۳) الہامی کتابیں۔

مسلمان کو ماننا پڑتا ہے کہ خدا نے جبرائیل کی معرفت دنیا میں پیغمبروں پر اپنی کتابیں نازل کی ہیں۔ ذیل میں ان پیغمبروں کے نام درج ہیں کہ جن کو آسمانی کتابیں ملی ہیں۔ کس پیغمبر پر کتنی کتابیں نازل ہوئی ہیں اس پر علماء کا اختلاف ہے۔

آدم پر (سورہ لقرآیت ۳۵) اور اس کے بیٹے شذیث پر۔
ادریس یعنی حنوک پر (سورہ مریم آیت ۵۷) ابراہیم پر (سورۃ الاعلیٰ آیت
توریت حضرت موسیٰ پر (سورۃ السجدہ آیت ۲۳)
زبور حضرت داؤد پر (سورہ بنی اسرائیل آیت ۵۷)
انجیل خداوند مسیح پر (سورۃ المائدہ آیت ۵۰)
قرآن سب سے آخری کتاب۔ آخری نبی محمد صاحب پر نازل ہوئی ہے جس کے احکام قیامت تک جاری رہیں گے۔
قرآن سے پہلی کتابوں کے متعلق مسلمانوں میں چار قسم کے خیالات رائج ہیں۔
(ا) ترفیع جس سے یہ مراد ہے کہ پہلی کتابیں آسمان پر اُٹھا لی گئی ہیں۔ چنانچہ جب خداوند مسیح آسمان پر اُٹھا لئے گئے تو انجیل اپنے ساتھ لیتے گئے۔
(ب) تحریف جس کا مطلب یہ ہے کہ عہد قدیم اور عہد جدید میں تبدیلیاں کی گئی ہیں۔
(ج) تنسیخ اس سے یہ مراد ہے کہ قرآن کے آنے سے پہلی کتابوں کے احکام موقوف ہو گئے۔
(د) خود قرآن میں یہودیوں اور مسیحیوں کی پاک کتابوں کی ضروری تعلیمات کا خلاصہ موجود ہے۔ اس تاویل سے "خدا کی کتابوں پر ایمان" لانے کا مطلب صرف ایک ہی کتاب کو ماننا رہ جاتا ہے۔

(۴) انبیاء

دنیا میں خدا نے بہت سے انبیاء بھیجے ہیں جن میں آدم پہلے اور محمد صاحب آخری نبی ہیں۔ حدیثوں کے مطابق دو لاکھ چوبیس ہزار انبیاء اور ۳۱۵

رسول دنیا میں گزر چکے ہیں۔ جن میں سے صرف پچیس[25] کے نام قرآن میں آئے ہیں (ملاحظہ ہو سورۃ الانعام آیت ۸۴ - ۸۶) ان میں سے چھ انبیاء یعنی آدم۔ نوح۔ ابراہیم موسیٰ۔ عیسیٰ اور محمد۔ اپنے اپنے زمانہ کے سردار مانے جاتے ہیں اور ہر نبی مخصوص خطاب کے ساتھ مشہور ہے جس کے ساتھ مسلمان اس کا نام لیتے ہیں۔ جیساکہ باب دوم میں ذکر ہو چکا ہے۔ ان کو انبیاء اعظم اور اولوالعزم کہتے ہیں۔

اسلامی علماء نبی اور رسول کے عہدوں میں فرق بتاتے ہیں۔

نبی پر سب سے اعلیٰ قسم کا الہام ہوتا ہے جسے وحی کہتے ہیں لیکن اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی خاص پیغام کے پہنچانے کے لئے مبعوث ہو۔

رسول وہ ہے جس پر نہ صرف وحی نازل ہوتی ہے بلکہ وہ خدا کا کوئی خاص پیغام پہنچانے کے لئے مبعوث ہوتا ہے۔ یوں ہر رسول نبی تو ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں ہے۔

انبیاء میں عہدۂ نبوت کے مدارج ہیں (دیکھو سورۃ بنی اسرائیل آیت ۵۷) محمد صاحب کا مرتبہ ان کے عقیدہ کے موافق سب سے بڑا ہے۔ قرآن میں وہ خاتم النبیین یعنی انبیاء کی مُہر (دیکھو سورۃ الاحزاب آیت ۴۰) اور آخری اور سب سے افضل نبی کے خطاب سے ملقّب ہیں۔ نماز کی ایک کتاب میں روزانہ پانچوں وقت باجماعت مسجد میں نماز پڑھنے کی فضیلت کا ذکر کیا گیا ہے اور اس سے اتفاقیہ طور پر انبیاء کے مدارج کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

صبح کی نماز کا ثواب بیس[2] حج کے برابر ہے جو آدم کے ساتھ کیا گیا ہے
ظہر کی نماز کا ثواب چالیس حج کے برابر ہے جو ابراہیم کے ساتھ کیا گیا ہے

عصر کی نماز کا ثواب ساٹھ حج کے برابر ہے جو نوح کے ساتھ کیا گیا ہے۔
مغرب کی نماز کا ثواب اسی حج کے برابر ہے جو مسیح کیساتھ کیا گیا ہے۔
عشاء کی نماز کا ثواب سو حج کے برابر ہے جو موسیٰ کے ساتھ کیا گیا ہے۔
جمعہ کی نماز کا ثواب ہزار حج کے برابر ہے جو محمد کے ساتھ کیا گیا ہے۔
مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ ہر نبی اپنے ہی قبیلہ یا قوم کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا تھا مگر محمد صاحب تمام دنیا کے لئے نبی ہو کر آئے تھے۔ چنانچہ اس کی تائید میں ایک حدیث پیش کی جاتی ہے کہ جہاں لکھا ہے کہ محمد صاحب نے کہا کہ میں تمام لوگوں کے لئے مبعوث ہوا ہوں خواہ وہ سفید ہوں یا سیاہ۔
کثرت مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ انبیاء معصوم یعنی بے گناہ ہوتے ہیں۔ اشعریوں کے خیال کے مطابق انبیاء میں گناہ کرنے کی قدرت پیدا نہیں کی جاتی۔ مگر معتزلہ اس کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کی ذات کو کچھ ایسی صفت حاصل ہے کہ جو انہیں گناہ سے باز رکھتی ہے۔ کوئی مسلمان عصمتِ انبیاء کے متعلق زیادہ سے زیادہ شاید یہ مان لے کہ ممکن ہے کہ اپنی دعوت سے قبل کوئی گناہِ صغیرہ ان سے سرزد ہوا ہو اور اس لئے جب اُن کے گناہ کا بیان قرآن میں پڑھتے ہیں تو اُن کو کچھ دقت پیش آتی ہے۔ قرآن میں صفائی سے لکھا ہے کہ چھ اولوالعزم انبیاء میں سے پانچ کو اپنے گناہوں کے لئے خدا سے معافی مانگنی پڑی (چنانچہ دیکھو سورۃ القصص آیت ۱۵) ان چھ اولوالعزم انبیاء میں صرف خداوند مسیح کے متعلق قرآن میں یہ کہیں بھی مذکور نہیں ہے کہ آپ کو بھی خدا سے اپنے کسی گناہ کی معافی مانگنی پڑی۔ یہ آپ کا ایسا امتیاز خصوصی ہے کہ جس کی تائید حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ بخاری اور مسلم محمد صاحب کا یہ قول پیش کرتے ہیں کہ نہیں پیدا ہوتا ہے کوئی بچہ مگر شیطان

چھوتا ہے اُس کی پیدائش کے وقت اُسے اور اِس لئے اُس کے چھونے پر وہ روتا ہے سوائے مریم اور اُس کے بیٹے کے (ملاحظہ ہو۔ صحیح البخاری کتاب ۳ صفحہ ۱۹۴- صحیح مسلم کتاب ۵ ا صفحہ ۱۲۰ بیضاوی سورہ آل عمران آیت ۳۱ کی تفسیر۔ مشارق الانوار ۹۲۹)

(۵) قیامت اور روزِ عدالت

اب ہم ایمان کے ان دوارکان یعنی قیامت اور روزِ عدالت کا بیان پیش کرتے ہیں ان کے متعلق چار خاص باتیں قابلِ غور ہیں۔

(۱) صُور کا پھونکا جانا۔ لکھا ہے کہ محمد صاحب نے کہا کہ آخری ساعت اُس وقت تک نہ ہوگی کہ کوئی بھی ایسا نہ پایا جائے جو خدا کو پکارتا ہو تب اسرافیل صُور پھونکے گا اور تمام مخلوقات جو آسمان میں ہیں اور تمام لوگ جو زمین میں ہیں فنا ہو جائیں گے سوائے اُن کے جنہیں خدا قائم رکھنا چاہے اور پھر دوسرا صُور پھُونکا جائے گا اور دیکھو لوگ اُٹھ کھڑے ہوں گے اور اپنے چاروں طرف دیکھیں گے۔ سورۃ الزمر آیت ۶۸ لیکن بعض کہتے ہیں کہ اسرافیل تین مرتبہ صُور پھونکے گا پہلی مرتبہ ہیبت ڈالنے کے لئے دوسری مرتبہ ہلاک کرنے کے لئے اور تیسری مرتبہ مُردوں کو زندہ کرنے کے لئے۔ جسم کے دوبارہ جی اُٹھنے کا ذکر یا اشارہ قرآن کے مختلف مقامات میں پایا جاتا ہے چنانچہ (ملاحظہ ہو سورۃ بنی اسرائیل آیت ۵۲ سورۃ یٰس آیت ۹ ۷) لیکن محمد صاحب کو اس کا علم نہیں تھا کہ قیامت کب ہوگی۔

علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جو شخص ایمان کے اس رکن پر ایمان لاتا ہے وہ کافر ہے۔ لیکن وہ اس پر متفق نہیں ہیں کہ مرنے کے بعد روح کس حالت میں ہوتی ہے اور کہ پھر جب قیامت ہوگی تو دوبارہ کس کیفیت

ہے انسان زندہ اُٹھے گا۔ مسلمانوں کا یقین ہے کہ محمد صاحب پہلے زندہ کئے جائیں گے اور فردوس میں بھی سب سے پہلے داخل ہوں گے۔

(ب) نامۂ اعمال کا دیا جانا۔ بعثت یعنی زندہ کئے جانے کے بعد چالیس سال تک لوگ آوارہ پھریں گے اور تب ان کو اعمال نامے دیئے جائینگے جن میں ان کی نیکی اور بدی تحریر ہوگی جو کہ فرشتے نے لکھ رکھی ہیں۔ لوگ ننگے اور پریشان اُٹھیں گے بعض آوارہ پھرتے رہیں گے اور بعض چالیس برس تک کھڑے اعمال نامہ کی انتظار میں آسمان کی طرف تاکتے ہوں گے اور شدّتِ رنج کے سبب سب کے بدن سے کثرت کے ساتھ پسینہ چھوٹتا ہوگا اور تب ہر ایک کو اس کا نامۂ اعمال دیا جائے گا۔ اس طرح پر کہ نیکوں کو داہنے ہاتھ اور بدوں کو بائیں ہاتھ میں۔ چنانچہ قرآن میں لکھا ہے اور ہم نے ہر آدمی کی بُرائی بھلائی کو اس کے ساتھ لازم کر کے اس کے گلے کا ہار بنا دیا ہے اور قیامت کے دن ہم اس کا نامۂ اعمال نکال کر اُس کے سامنے پیش کر دیں گے اور وہ اُس کو اپنے روبرو کُھلا ہوا دیکھ لے گا اور ہم اس سے کہیں گے کہ اپنا نامۂ اعمال پڑھ لے اور آج اپنا حساب لینے کے لئے تو آپ ہی بس کرتا ہے (سورہ بنی اسرائیل ۱۴ و ۱۳ آیات وسورۃ الانشقاق ۱۰۔۱۴ آیات)

(ج) میزان۔ کوئی مسلمان ایمان کے اس رکن پر شبہ نہیں کر سکتا کیونکہ اس کا ثبوت قرآن۔ سنت اور اجماع سے ہے۔ میزان سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ترازو کے پلڑوں میں انسان کی نیکی اور بدی تولی جائیں گی۔ نیک کام وزن میں بھاری ہوں گے اور بُرے کام ہلکے۔ بھلے اور بُرے کام کرنے والوں کے انجام کا ذکر قرآن میں صفائی سے آیا ہے۔ (ملاحظہ ہو سورۃ المومنون آیت ۱۰۴، ۱۰۶ اور سورۃ الاعراف آیات ۷ و ۸)

انبیاء اور ملائکہ اور بعض روایات کے مطابق ایماندار بھی اعمال کے تولے جانے سے بری کر دیئے جائیں گے۔

گنہگار جن کی بدی کا پلڑا بھاری ہوگا دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔ قرآن کے متعدد مقامات میں دوزخ کا ذکر آیا ہے اور مسلمانوں کی عام دینی کتابوں میں دوزخیوں کے دردناک عذاب کا ذکر تفصیل کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

دوزخ کے حسب ذیل سات طبقے ہیں جن میں سے ہر ایک کا نام اور امتیازی حیثیت جداگانہ ہے۔

(۱) جہنم۔ یہ طبقہ گنہگار مسلمانوں کے لئے ہے (۲) لظٰی۔ مسیحیوں کے لئے (۳) الحطمۃ۔ یہودیوں کے لئے (۴) سعیر صابی۔ یعنی عرب کے ستارہ پرستوں کے لئے (۵) سقر۔ مجوسیوں کے لئے۔ (۶) جحیم۔ بت پرستوں کے لئے (۷) ہاویہ۔ منافقین کے لئے۔

(د) پل صراط۔ جب حساب کتاب ہو چکے گا اور اعمال تولے جا چکینگے تو صراط جس کے لفظی معنی راہ کے ہیں قائم کی جائے گی لیکن اس سے مراد ایک تنگ پل ہے کہ جس پر سے لوگوں کو گزرنا ہوگا (دیکھو سورہ یٰسٓ آیت ۶۶ والصّٰفّٰت آیت ۲۲ و ۲۳) اس کے متعلق حدیث میں روایت ہے کہ محمد صاحب نے کہا کہ ایک پل تلوار سے تیز اور بال سے باریک دوزخ کے اوپر ہوگا۔ بعض طرفۃ العین میں اور بعض تیز بجلی کی طرح اور بعض تیز گھوڑے کی مانند اس پر سے گزر جائیں گے۔ اور فرشتے پکارتے ہوں گے۔ اے ربّ تو بچا اور محفوظ رکھ بعض مسلمان بچ جائیں گے اور بعض سر کے بل دوزخ میں گر پڑیں گے اور ہمیشہ وہاں رہیں گے۔

اعراف ایک دیوار کا نام ہے جو بہشت اور دوزخ کے درمیان

واقع ہے اور جن لوگوں کے نیک اور بد اعمال برابر ہوں گے وہ وہاں رکھے جائیں گے ایسے لوگ بہشت کو دیکھیں گے مگر وہاں داخل نہیں کئے جائیں گے۔ دوزخ انہیں دکھائی دے گا لیکن وہ اس میں بھیجے نہ جائیں گے۔ قرآن کی ساتویں سورت اسی مضمون کے سبب الاعراف کہلاتی ہے (دیکھو سورہ اعراف آیات ۴۴ و ۴۵)

مشرک یعنی وہ لوگ جو خدا کے ساتھ دوسرے کو شریک کرتے ہیں وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے کیونکہ یہ ایسا گناہ ہے جو معاف نہیں ہو سکتا اور اس لئے اس کا عذاب سخت اور ابدی ہے (سورۃ البینۃ آیت ۵)

مسلمان جو گناہ کبیرہ کے مرتکب ہیں اگرچہ وہ بغیر توبہ کئے مر جائیں تو بھی وہ دوزخ میں ہمیشہ نہیں رہیں گے اور یہ خیال قرآن کی اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں لکھا ہے کہ "جس نے ذرہ بھر بھلائی کی وہ دیکھ لے گا اُسے" (سورۃ الزلزال آیت ۷) اور امام غزالی نے بھی یہی لکھا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو احیاء العلوم دوسری جلد پہلا باب

"خدا کی توحید پر گواہی دینے والا کوئی بھی دوزخ میں پڑا نہیں رہے گا۔ .... ایک بھی مومن دوزخ میں ہمیشہ کے لئے نہیں ڈالا جائیگا۔"

اس کے برعکس معتزلہ کی تعلیم یہ ہے کہ جو مسلمان دوزخ میں ڈالے جائینگے وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے اور جو زندگی میں گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوئے ہیں اور توبہ کئے بغیر مر گئے ہیں اگرچہ وہ کافر نہیں ہیں تاہم وہ مومن بھی نہیں ہیں اور اس لئے کافروں کا سا عذاب تو ان پر ہوگا مگر ہلکا ہوگا۔ امام اشعری کہتے ہیں کہ جو گنہگار بغیر توبہ کئے مرتا ہے اس کی مغفرت خدا کے رحم پر ہے اور محمد صاحب اس کی شفاعت کرینگے جیسا کہ خود آپ نے فرمایا ہے "میری شفاعت میری اُمت کے ان لوگوں کے لئے ہے کہ جنہوں نے گناہ کبیرہ کیا ہے" (شہرستانی کی ملل والنحل صفحہ ۷) اور اس لئے

راسخ الاعتقاد مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ محمد صاحب اُن کے شفیع ہیں اور روزِ الضاف کو اُن کی شفاعت کریں گے۔

روزِ قیامت کی بہتیری علامتیں ہیں جن میں سے چند حسبِ ذیل ہیں۔

(ا) دجال یعنی مخالف مسیح کا ظہور۔

(ب) زمین پر لوگوں کے ایمان میں کمی۔

(ج) بدامنی اور بغاوت۔ یونانیوں اور رومیوں کی جنگ۔

(د) سورج کا مغرب سے نکلنا۔

(ہ) مسیح کی آمد ثانی۔ چنانچہ قرآن میں لکھا ہے وہ (مسیح) نشان ہے اس گھڑی کا سو اس میں دھوکا نہ کرو اور میرا کہا مانو یہ ایک سیدھی راہ ہے۔ (سورۃ الزخرف آیت ۶۱) مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ خداوند مسیح جب دوبارہ نزول فرمائیں گے۔ تو آپ دجال کو ہلاک کریں گے اور آپ کا نزول دمشق کی مسجد کے قریب عصر کی نماز کے وقت ہوگا اور آپ اسلام کو از سرِ نو قائم کرنے کے بعد چالیس سال زندہ رہ کر وفات پائیں گے اور مدینہ میں محمد صاحب کی قبر کے پاس جو جگہ آپ کے لیے مخصوص ہے اُس میں دفن کئے جائیں گے۔

مسلمانوں کی دینی کتابیں جو عام طور پر رائج ہیں ان میں جنت کا ذکر نہایت صفائی کے ساتھ پایا جاتا ہے اور ان میں لکھا ہے کہ جنت کے آٹھ طبقے ہیں۔ ان کتابوں میں انسانی خوشیوں اور لذتوں کا مفصل نقشہ کھینچا گیا ہے۔ محدث ترمذی نے محمد صاحب سے یہ قول منسوب کیا ہے کہ جنت کی خوبیوں کے سو درجے ہیں۔

(۶) قدر خیر و شر۔ مومن کو اس کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ بھلائی اور برائی خدا کی طرف سے مقرر ہیں اور جو کچھ ہو چکا ہے اور جو ہونے والا ہے سب کچھ ازل سے مقرر شدہ ہے۔

اگر کوئی سوال کرے کہ خدا کیوں بدی چاہتا ہے اور برائی پیدا کرتا ہے۔ تو اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ خدا کی حکمت میں جو کچھ اُن کا انجام ہے وہ انسانی سمجھ سے باہر ہے۔

اسلام میں اس مضمون پر بڑی بحث ہو چکی ہے۔ کہ جس سے تین قسم کے خیالات کے گروہ مسلمانوں میں پیدا ہو گئے ہیں۔

(ا) جبریہ۔ جو لفظ جبر سے نکلا ہے۔ یہ لوگ انسان کا فعل مختار یعنے اپنے افعال میں آزاد ہونا نہیں مانتے۔ انسان کے سارے افعال برُے اور بھلے کا ذمہ وار خدا ہے۔

(ب) قدریہ۔ یہ لفظ قدر سے نکلا ہے جس سے مراد تقدیرِ الٰہی ہے یہ کہتے ہیں کہ بدی اور ناانصافی کو خدا سے منسوب کرنا نہیں چاہئے۔ بلکہ انسان ہے جو فعل مختار ہے۔

(ج) اشعریہ۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ خُدا کا ارادہ ازلی ہے۔ ہے اور جو کچھ خدا کرتا ہے یا انسان سے سرزد ہوتا ہے سب اسی ارادہ کے موافق ہوتا ہے اور وہ برائی اور بھلائی دونوں کا ارادہ کرتا ہے۔

اور یہاں تک تو انہیں جبریوں سے اتفاق ہے لیکن وہ کچھ اختیار انسان کیلیا بھی مانتے ہیں اس اختیار کو وہ کسبی کہتے ہیں۔ یعنی جب خدا انسان میں کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو خُدا کے عملِ تخلیق سے انسان اس کام کے کرنے کی قدرت حاصل کرتا ہے۔

اِس طرح ہر راسخ الاعتقاد مسلمان لازماً تقدیر کا قائل ہے

دوسری فصل

مذہبی فرائض

ایمان کے ساتھ ساتھ چند ایسے کام ہیں کہ جن کا تعلق دین سے ہے اور ہر مومن پر انکا کرنا فرض ہے۔ یہ دینی فرائض شمار میں پانچ ہیں اور اپنی اہمیت کے سبب ارکان دین یعنی دین کے ستون کہلاتے ہیں۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) تشہد۔ یعنی کلمہ پڑھنا۔
(۲) صلوٰۃ۔ یعنی پنجگانہ نماز۔
(۳) صوم۔ یعنی روزہ رکھنا۔
(۴) زکوٰۃ۔ یعنی آمدنی کا خاص حصہ خیرات دینا۔
(۵) حج۔ یعنی زیارت کے لئے مکہ جانا

ان کی بنیاد قرآن اور حدیث کے صریح احکام پر ہے اور اس لئے یہ فرض کہلاتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی احکام ہیں کہ جن پر مسلمانوں کو عمل کرنا پڑتا ہے لیکن یہ فرض نہیں بلکہ واجب کہلاتے ہیں۔ چند واجب احکام کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) عمرہ یعنی سالانہ حج کے موقع کے سوا اور کبھی مکہ کو جا کر حج کے رسوم پورے کرنا۔
(۲) بیوی کے لئے اپنے شوہر کی تابعداری۔

(۳) رمضان کے روزے کے بعد فطر کا صدقہ دینا۔
(۴) بقر عید کی قربانی
(۵) عشاء کی نماز کے بعد تین رکعت وِتر کی نماز پڑھنا۔
(۶) اپنے عزیز و اقارب کی مدد کرنا۔

واجبات میں فطرہ کا صدقہ اور بقر عید کی قربانی صرف صاحب حیثیت کے لئے واجب ہے۔ لیکن اگر کوئی غریب شخص انہیں کرے تو یہ اس کے لئے مستحب کہلاتے ہیں یعنی وہ ثواب کا مستحق ہوگا۔

پھر ان سے بھی کمتر درجے کے احکام ہیں کہ جن پر یا تو خود محمد صاحب کا عمل رہا ہے یا دیگر انبیائی سابقین نے ان پر عمل کیا ہے اور محمد صاحب نے ان کی اجازت دی ہے مثلاً (۱) ختنہ (۲) سر اور بعض دیگر اعضا کے بال منڈانا۔ (۳) ناخن کٹوانا۔

اس باب میں ہم صرف پانچ ارکان دین کا ہی ذکر کریں گے۔

(۱) تشہد۔ یا شہادت:۔

اس لفظ کے معنی ہیں گواہی دینا۔ اور اصطلاح میں کلمۂ شہادت کے پڑھنے کو کہتے ہیں جو یہ ہے اشہد ان لا الہ الا اللہ و اشہد ان محمد الرسول اللہ۔ یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ سوائے خدا کے کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کا رسول ہے۔

(۲) صلوٰۃ:۔

یعنی نماز۔ نماز پڑھنے سے قبل مسلمانوں کو خاص طریقہ پر طہارت کرنی پڑتی ہے۔ ان کی تین قسمیں ہیں۔

(ا) وضو (ب) غسل۔ (ج) تیمم۔ ہر ایک کی تفصیل ذیل میں

درج کی جاتی ہے۔

(و) وضو ایک قسم کی طہارت ہے جو پنجگانہ نماز سے پیشتر قاعدے کے مطابق کی جاتی ہے۔ جسم کے جن حصوں کا پانی سے وضو میں دھونا فرض ہے ان کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) منہ۔ پیشانی کے سرے سے ٹھوڈی تک اور دونوں کانوں تک دھونا

(۲) دونو ہاتھ کہنیوں تک دھونا۔

(۳) ہاتھوں کو پانی سے تر کر کے چوتھائی سر کا مسح کرنا۔

(۴) دونوں پاؤں ٹخنوں تک دھونا۔

شیعہ دونو پاؤں کو دھونے کے بجائے پاؤں کا صرف مسح کرتے ہیں مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ وضو کرتے وقت اگر ذرا سی جگہ بھی خشک رہ جائے تو کل طہارت بے سود اور نماز باطل ٹھہرے گی وضو کرنا اس قدر سیدھا سادا عمل نہیں ہے جیسا کہ نظر آتا ہے۔ چار فرائض مذکورہ کے علاوہ چودہ ۱۴ سنتیں بھی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔

وضو کے شروع میں خدا کے ناموں میں سے کوئی نام لینا۔ دانت مانجنا تین بار نتھنوں میں پانی ڈالنا سر اور ہاتھ پاؤں دھونے میں ترتیب کا خیال رکھنا۔ ہاتھ کی انگلیوں کے بیچ میں جو جگہ ہے اسے دوسرے ہاتھ کی تر انگلیوں سے اس کو دھونا۔ داڑھی کو انگلیوں سے خلال کرنا۔ پاؤں کا مسح کرنا اس طرح پر کہ ہاتھ کی پانچوں انگلیوں کو پاؤں کی پانچوں انگلیوں کے سروں سے پنڈلی تک کھینچے

اس طریقے پر جب وضو کر کے نماز پڑھی جاتی ہے تو صغیرہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ صحیح بخاری کی کتاب الوضو میں یہ روایت منقول ہے کہ محمد صاحب نے کہا کہ جو اس طرح وضو کرتا ہے۔ جس طرح میں کرتا ہوں اور

پھر دو رکعت نماز ادا کرتا ہے (رکعت کی تفصیل آگے آئے گی) اور اس درمیان میں اس کا وضو نہیں ٹوٹتا۔ اسکے سارے صغیرہ گناہ بخشے جائینگے"۔

(ب) غسل۔ کسی شرعی نجاست کے بعد تمام جسم کے دھونے کا نام غسل ہے۔ یہ اس طریقہ پر کیا جاتا ہے کہ غسل کرنے والا پہلے دائیں کندھے پر تین بار پانی ڈالے اور پھر بائیں پر تین بار اور تب سر پر تین بار پانی بہائے اس کے علاوہ غسل میں تین فرض ہیں۔ (۱) کلی کرنا (۲) ناک میں پانی ڈالنا۔ (۳) تمام بدن پر پانی بہانا۔ غسل کرنے میں چاہئے کہ ایک بال بھی خشک نہ رہ جائے۔

(ج) تیمم۔ یعنی ریت یا خشک مٹی سے طہارت کرنا۔ جن صورتوں میں اس کی اجازت ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

جب پانی دو میل یعنی ایک کوس تک نہ ملتا ہو۔ یا کوئی بیمار ہو اور پانی کے استعمال سے نقصان کا اندیشہ ہو یا پانی ایسی جگہ پر ہو جہاں کسی دشمن یا کسی جانور یا کیڑے مکوڑے کا ڈر ہو یا جب نماز عیدین یا نماز جنازہ میں دیر ہو گئی ہو اور وضو کا وقت نہ رہا ہو۔

تیمم کا طریقہ یہ ہے کہ ہاتھ کھول کر خشک زمین پر مارے اور منہ پر ملے اور پھر دونوں ہاتھوں کا کہنیوں تک مسح کرے۔

ضروری طہارت سے فارغ ہونے کے بعد مسلمان نماز پڑھ سکتا ہے نماز خواہ علیحدگی میں یا جماعت کے ساتھ دونو طرح ہو سکتی ہے لیکن اگر مسجد میں با جماعت پڑھی جائے تو اکیلے کے بہ نسبت زیادہ ثواب ہے۔ نمازی کے لئے یہ ضرور ہے کہ اس کے بدن اور کپڑے پاک ہوں اور قبلہ کی طرف اس کا منہ ہو۔ مسجد میں جو محراب بنا ہوتا ہے اس کا رخ مکہ کی طرف بنایا جاتا ہے اور یہی رخ

قبلہ کہلاتا ہے۔ مسجد میں نماز سے پہلے اذان دی جاتی ہے کہ جس کے کلمات مؤذن مسجد کے اونچے مینار پر چڑھ کر بلند آواز سے پڑھتا ہے۔ اذان روزانہ پانچ وقت مسجدوں میں دی جاتی ہے۔ اس میں چھوٹے چھوٹے جملے ہوتے ہیں کہ مسلمان اذان کے وقت جب ان کو سنتے ہیں تو وہ اسی قسم کے چھوٹے چھوٹے جملے جواب میں کہتے جاتے ہیں۔ اذان کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

اللہ اکبر۔ اللہ بہت بڑا ہے۔ چار بار۔

اشہد ان لا الہ الا اللہ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ سوائے خدا کے کوئی معبود نہیں۔ دو بار۔

واشہد ان محمد الرسول اللہ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کا رسول ہے۔ دو بار

حی علے الصلوٰۃ نماز کو آؤ۔ دو بار۔

حی علے الفلاح نیک کام کو آؤ۔ دو بار۔

فجر کی نماز کے وقت مؤذن اس قدر اور زائد کرتا ہے الصلوٰۃ خیر من النوم نماز نیند سے بہتر ہے۔ دو بار اور آخر میں اللہ اکبر دو بار اور لا الہ الا اللہ ایک بار کہہ کر موذن اذان ختم کرتا ہے۔

نماز میں چند مقررہ حرکات وسکنات ادا کئے جاتے ہیں یعنی قیام رکوع اور سجود نماز کے خاص حصہ میں سورۃ فاتحہ اور قرآن کی چند آیتیں خصوصاً آخری پارہ کی کوئی چھوٹی سورۃ پڑھی جاتی ہے۔ نماز کو سمجھنے کے لئے اس کے مختلف حرکات وسکنات کا سمجھنا ضروری ہے۔ قیام اس طرح کھڑے ہونے کو کہتے ہیں کہ نمازی دونوں ہاتھ زیر ناف باندھ کر کھڑا ہو اور حالت رکوع میں سر اور بدن جھکا کر وہ انگلیوں کو ذرا کھول کر گھٹنوں پر رکھ دیتا ہے اور سجدہ کرتے

وقت دونوں ہاتھوں کو اس طرح زمین پر رکھتا ہے کہ پاؤں سیدھے رہتے ہیں اور صرف انگلیاں زمین پر لگی ہوتی ہیں اور تب نمازی اول ناک اور پھر پیشانی زمین پر ٹیکتا ہے۔ نماز میں ایک حالت سے دوسری حالت کو بدلتے وقت مثلاً حالت قیام سے حالت رکوع یا رکوع سے سجدہ کو جاتے وقت نمازی تکبیر یعنی اللہ اکبر کہتا ہے جب نمازی قیام رکوع اور سجود کر لیتا ہے تو یہ ایک رکعت کہلاتی ہے اور پے در پے دو سجدے کرنے کے بعد نمازی کھڑا ہو کر پھر انہیں حرکات کو دوہراکر اپنی نیت کے مطابق دو رکعت یا چار رکعت پوری کرتا ہے کوئی نماز دو رکعت سے کم اور چار سے زیادہ نہیں ہوتی ہے۔

دو رکعت یا آخیر رکعت بعد نمازی بیٹھ جاتا ہے اور درود پڑھتا ہے کہ جس کا ترجمہ یہ ہے۔

اے اللہ محمد اور اس کی اولاد پر رحمت بھیج۔ جس طرح تو نے ابراہیم اور اسکی اولاد پر رحمت بھیجی تحقیق کہ تو ہی قابل تعریف اور بزرگی والا ہے۔

نماز کے خاتمے پر پہلے دائیں اور پھر بائیں طرف منہ پھیر کر کہتا ہے۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تم پر اللہ کی سلامتی اور رحمت ہو۔

نماز کا ختم ایک عمدہ حرکت پر ہوتا ہے یعنی نماز پڑھ چکنے کے بعد نمازی اپنے دونوں ہاتھوں کو آسمان کی طرف پھیلا کر خواہ عربی میں یا اپنی زبان میں درگاہ الٰہی میں مناجات یعنی دعا کرتا ہے اور تب ہاتھ منہ پر پھیرتا ہوا سینہ تک لے جاتا ہے گویا کہ ان برکتوں کو جو خدا سے ملی ہیں ہر جزو بدن پر پہنچاتا ہے۔

نماز کے پنجگانہ اوقات کا صریح ذکر کہیں قرآن میں نہیں ہے بلکہ حدیث کی بنا پر یہ مقرر کئے گئے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

فجر۔ سورج نکلنے سے قبل۔

ظہر۔ دوپہر کے وقت۔
عصر۔ سورج ڈھلنے پر۔
مغرب۔ سورج غروب ہونے کے بعد ہی۔
عشاء۔ رات کے وقت۔

فرض اور سنت نمازوں کے علاوہ ایسے نماز بھی ہیں کہ جن کا پڑھنا مسلمانوں کی مرضی پر ہے۔ انہیں نفل کہتے ہیں۔ جمعہ کے روز ظہر کی نماز کے بجائے جمعہ کی نماز پڑھی جاتی ہے۔ اس کے پڑھنے سے پہلے امام خطبہ پڑھ کر جماعت کو سناتا ہے۔

(۳) روزہ:۔

رمضان کے مہینہ میں روزہ رکھنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ روزہ اس طرح رکھا جاتا ہے کہ فجر سے لے کر آفتاب ڈوبنے تک روزہ رکھنے والا کھانے پینے۔ تیل اور عطریات۔ تمباکو اور مرد و عورت کے باہمی تعلقات سے پرہیز کرتا ہے۔ سورج غروب ہونے کے بعد کھانا کھایا جاتا ہے۔ روزے کی نیت رات کے وقت مندرجہ ذیل الفاظ میں کی جاتی ہے کہ "اے میرے خدا میں نیت کرتا ہوں کل دن کے روزے کی خاص تیرے واسطے میرے اگلے پچھلے گناہوں کو معاف کر"۔ غروب آفتاب کے بعد کچھ کھا کر روزہ کھولتے ہیں اسے افطار یعنی کھولنا کہتے ہیں۔ عموماً یہ دستور ہے کہ چھوارہ سے اگر چھوارہ نہ ہو تو پانی سے روزہ کھولتے ہیں۔ روزہ کھولتے وقت یہ دعا کہی جاتی ہے۔ "اے خدا میں نے تیرے واسطے روزہ رکھا تھا تجھ ہی پر میرا ایمان تھا اور تیرے ہی اوپر بھروسہ تھا اور اب میں روزہ کو اس کھانے سے جو تو نے دیا ہے افطار کرتا ہوں تو ہی قبول کرنے والا ہے"۔

رمضان کے مہینے میں روزہ رکھنا فرض ہے۔

نابالغ لڑکے یا لڑکیاں اور دیوانہ کو روزہ رکھنا معاف ہے۔ مریض اور مسافر کو اختیار ہے کہ قضا کرے یعنی رمضان کے عوض کسی اور وقت روزہ رکھ لے رمضان کے علاوہ اور بھی روزے ہیں جو نفل کہلاتے ہیں۔ جن کے رکھنے میں ثواب ہے مگر نہ رکھنے میں کوئی گناہ نہیں۔

رمضان کا روزہ اس وقت سے شروع کیا جاتا ہے کہ جب چاند دکھائی دے اور پھر مہینہ بھر سختی سے روزہ رکھا جاتا ہے اور جب رمضان گرمیوں کے موسم میں پڑتا ہے تو روزے دار کے جسم اور مزاج کے لئے سخت برداشت کا کام ہے۔

بعض کاموں سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے مثلاً اگر دانت مانجتے وقت ایک قطرہ پانی حلق میں چلا جائے یا کوئی زبردستی کچھ کھلا دے یا کان ناک یا سر کے زخم میں دوا ڈالی جائے یا رات کے دھوکے میں دن کو کچھ کھالے یا رات کے کھانے کا کوئی حصہ جو مقدار میں ایک دانہ سے بڑا ہو دانتوں میں یا دانت کے کسی جوف میں رہ گیا ہو یا قے ہو جائے ان ساری صورتوں میں روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور پھر قضا رکھنی پڑتی ہے۔

اگر کوئی قصداً روزہ توڑ ڈالے تو اس کے عوض کفارے کی کئی صورتیں مقرر ہیں یعنی روزہ توڑنے والا یا تو ایک غلام آزاد کرے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو دو ماہ متواتر روزہ رکھے اور اگر یہ بھی نہ ہو تو ساٹھ آدمیوں کو دو دو وقت کی خوراک دے دے یا ساٹھ دن تک روزانہ دو وقت ایک آدمی کو کھانا کھلائے۔

عمر رسیدہ اور کمزور آدمی کو روزے کے عوض کسی محتاج کو کھانا کھلانا چاہیئے۔ حاملہ عورتوں کو اور جو بچوں کو دودھ پلاتی ہیں اور جو لوگ بیمار ہیں۔

ان کو اجازت ہے کہ رمضان کے عوض پھر کبھی روزہ رکھ لیں۔ ان روزوں کو جو بعد میں رکھے جاتے ہیں قضا کہتے ہیں۔

(۴) زکوٰۃ:۔

اسلام میں دو الفاظ خیرات کے لئے مستعمل ہیں۔ اول زکوٰۃ جو سوائے خاص صورتوں کے ہر مسلمان سے لی جاتی ہے۔ دوم صدقہ جو خصوصاً عید الفطر کے روز دیا جاتا ہے۔ یہ عید رمضان کے ختم ہونے پر جب نیا چاند دکھائی دے تو منائی جاتی ہے۔ ہم یہاں صرف زکوٰۃ کا ذکر کریں گے۔

ہر بالغ مسلمان پر فرض ہے کہ اپنے مال پر زکوٰۃ دے بشرطیکہ اپنی ضروریات پورا کرنے کو اس کے پاس کافی ہو (دیکھو سورہ بقر ۴۰،۷۷ و ۴۰ آیات) حسب ذیل کی تین شرطیں کسی میں پائی جائیں تو اس پر زکوٰۃ فرض ہو جاتا ہے۔ اوّل اسلام۔ دوم حریت یعنی آزاد ہونا۔ سوم صاحب نصاب ہونا۔ نصاب سے مراد مال کی وہ مقررہ مقدار ہے جو شریعت کی طرف سے مقرر کی گئی ہے۔ مختلف چیزوں کے لئے مختلف مقدار مقرر ہے۔

جو چیزیں روزانہ خرچ میں آتی ہیں یا روزمرہ کے استعمال کی ہیں وہ زکوٰۃ سے بری ہیں مثلاً غلّہ یا کام کے اوزار و آلات اسی طرح اگر کوئی مقروض ہے تو بعد ادائے قرض کے جو مال رہے اس پر زکوٰۃ عائد ہوگی لیکن اگر وہ قرض خدا کے نام پر ہو مثلاً کوئی نذر مانی تھی یا کسی شرعی حکم کی کوتاہی کے سبب کفارہ دینا ہے تو یہ اس مال سے جس پر زکوٰۃ فرض ہے نہیں نکالنا چاہئے۔ مویشی کی زکوٰۃ کے لئے حسب ذیل قاعدے مقرر ہیں۔ بھیڑ اور بکری جب چالیس سے کم ہوں کچھ نہیں دینا چاہئے۔ ایک سو بیس پر ایک اور پھر دوسرے اسّی پر دو اور پھر ہر سینکڑہ پیچھے

ایک۔ بھینسوں پر بھی یہی حساب ہے۔ اونٹ۔ گھوڑے اور گائے پر حساب کچھ پیچیدہ ہے۔ گدھے اور خچر پر اس حدیث کے سبب زکوٰۃ نہیں لگایا جاتا کہ محمد صاحب نے کہا۔ گدھوں کی نسبت خاص کر مجھ پر کوئی حکم نازل نہیں ہوا (مشکوٰۃ المصابیح کتاب ۶ باب الفصل ۱)

جس قسم کے لوگوں کو زکوٰۃ ملنی چاہیئے ان کا ذکر قرآن کی اس آیت میں ہے۔

خیرات کا مال تو بس فقیروں کا حق ہے اور محتاجوں کا اور ان کارکنوں کا جو مال خیرات کے وصول کرنے پر تعینات ہیں اور ان لوگوں کا جن کے دلوں کا پرچانا منظور ہے ان مصارف میں مال خیرات یعنی زکوٰۃ کو خرچ کیا جائے اور نیز غلامی سے غلاموں کی گردنوں کو چھڑانے میں اور قرض داروں کے قرضے میں اور خدا کی راہ میں اور مسافروں کے زاد راہ میں یہ حقوق اللہ کے ٹھہرائے ہوئے ہیں۔ (سورۃ التوبہ آیت ۶۰)

یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ خلیفہ ابوبکر نے نومسلموں کو زکوٰۃ دینے کا قاعدہ اٹھا دیا اور خلیفہ عمر نے نومسلموں سے یہ کہا کہ "تمہارا دل اسلام کی طرف راغب کرنے کو تمہیں زکوٰۃ دی جاتی تھی مگر اب خدا نے اسلام کو کامیاب کیا ہے۔" کسی صحابہ نے اس بیان کی مخالفت نہیں کی ہے۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس حکم کی تنسیخ پر کہ زکوٰۃ نومسلموں کو دی جائے اجماع صحابہ کا اتفاق ہے۔

غلام کو بھی زکوٰۃ دی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی قیمت ادا کر کے آزاد ہو سکے اور کسی ایسے غریب کو بھی زکوٰۃ دینا جائز ہے کہ جو حج کرنا چاہتا ہے اس طرح پر اپنے غریبوں کی مدد کرنا بہتر ہے مسلمانوں کی خاص صفت ہے۔

مساجد کی تعمیر اور تجہیز و تکفین کے اخراجات اور میت کے ادائے

قرض کے لئے زکوٰۃ کا روپیہ دینا ہرگز جائز نہیں اور ماں باپ اور دادا دادی و نانا نانی اور بیٹے بیٹیوں اور پوتے پوتیوں ۔ نواسے نواسیوں کو بھی زکوٰۃ دینی جائز نہیں ۔

(۵) حج

دین کا آخری رکن حج یعنی مکہ کو جانا فرض ہے ۔ قرآن میں ذیل کی آیتوں سے اس کا فرض ہونا ثابت ہوتا ہے ۔ " اور لوگوں میں حج کیلئے پکار دو کہ لوگ تمہاری طرف دوڑے چلے آئیں گے ۔ ان میں سے کچھ تو پیادے اور ہر طرح کی سواریوں پر جو ہر راہ دور دراز سے آئی ہوں گی سوار ہوں گے .... اور کہ معبد قدیم یعنی کعبہ خانہ کا طواف بھی کریں (سورۃ الحج ۲۸ و ۳۰ آیات) لوگوں پر فرض ہے کہ خدا کے لئے خانہ کعبہ کا حج کریں جس کو اس وقت تک پہنچنے کا مقدور ہو ۔ (سورۃ آل عمران ۹۱ آیت)

مشہور مفسر بیضاوی کا بیان ہے کہ آیت مذکورہ میں فقرہ " جس کو اس تک پہنچنے کا مقدور ہو ۔" سے محمد صاحب کی مراد یہ ہے کہ اس کے پاس راہ میں کھانے کے لئے خوراک اور سواری کے لئے جانور ہو ۔

امام الشافعی نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جو شخص خود حج کو نہ جا سکے وہ اپنے عوض کسی اور کو بھیج سکتا ہے ۔ امام مالک کہتے ہیں کہ جو شخص پیدل چل کر جانے میں قادر ہو اسے حج کرنا چاہئے ۔ محمد صاحب سے بیان ہے کہ حج کرنا زندگی میں صرف ایک مرتبہ فرض ہے اور اس کے علاوہ مکہ کو جانا نفل ہے ۔ لیکن غلام کے لئے یہ حکم ہے کہ غلامی کی حالت میں اگر وہ حج کرے تو آزاد ہونے پر اسے پھر حج کرنا چاہئے ۔ اسی طرح اگر کوئی بچہ حج کو گیا ہو تو بالغ ہونے پر پھر حج کر لے ۔

حج کے رسوم کا بیان نہایت پیچیدہ ہے۔ یہاں ہم صرف اس کے تین[۲] فرض اور پانچ واجب رسوم کا ذکر کریں گے۔ ذیل کے رسوم فرض ہیں

(۱) احرام باندھنا۔ یعنی بغیر سلے ہوئے کپڑے کی دو چادریں۔ جن میں سے ایک بطور تہمند باندھتے ہیں اور دوسرا اوڑھتے ہیں اس طرح کہ سر کھلا رہتا ہے۔

(۲) عرفات کے پہاڑ پر کھڑے ہونا۔

(۳) طواف کرنا یعنی کعبے کے گرد سات بار گھومنا۔

حج کے واجبات یہ ہیں۔

(۱) وقوف یعنی مقام مزدلفہ میں رات کو قیام کرنا۔ یہ مقام عرفات اور منیٰ کے درمیان واقع ہے۔

(۲) پہاڑ صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا۔

(۳) منیٰ کی وادی میں تین ستونوں پر کنکری مارنا کہ جو شیطان کہلاتے ہیں

(۴) کعبہ کا سات مرتبہ طواف کرنا یہ اس طواف سے فرق ہے جو کعبہ میں آنے پر کیا جاتا ہے۔

(۵) منیٰ کی وادی میں قربانی کرنا اور پھر خاتمہ پر سر کے بال منڈانا حج ذی الحجہ کے مہینہ میں ہوتا ہے یہ اسلامی سال کا آخری مہینہ ہے۔

کعبہ کے چاروں طرف گھومنا طواف کہلاتا ہے اور گھومتے وقت جب حاجی سنگ اسود کے پاس آتا ہے جو کعبہ کی دیوار میں نصب ہے تو اسے بوسہ دیتا ہے۔ اگر کثرت ہجوم کے سبب پاس جاکر بوسہ دینے کا موقعہ نہ ملے تو ہاتھ سے یا لکڑی سے مَس کر کے اس ہاتھ یا لکڑی کو بوسہ دیتا ہے اور اس وقت حاجی یہ کہتا ہے۔ "اے اللہ تجھ پر بھروسہ کر کے اور

تیرے کلام کو سچ جان کر اور تیرے نبی کی سنت کی پیروی میں میں یہ کرتا ہوں تو میری عرض کو قبول کر اور میری مشکلوں کو آسان کر۔ میری عاجزی پر رحم کر اور اپنی رحمت سے مجھے بخش دے۔"

حج کے سارے رسوم جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں تھوڑی سی تبدیلی کر کے عرب کے بت پرستوں سے لی گئی ہیں۔

عمرہ چھوٹا حج ہے جو فرض نہیں ہے لیکن اس کے کرنے میں مسلمان مانتے ہیں کہ بہت ثواب ملتا ہے۔ عمرہ کے ادا کرنے کے لئے کوئی خاص وقت مقرر نہیں ہے اور ذی الحجہ کی نویں تاریخ اور اس کے بعد کے چار دن کے سوائے کہ جو خاص حج کے لئے مقرر ہیں جب چاہیں ہو سکتا ہے جو حج کے رسوم ہیں قریب قریب وہی عمرہ کے بھی ہیں خاص فرق یہ ہے کہ اس میں قربانی نہیں ہوتی اور کل رسوم کعبہ اور اس کے ارد گرد کی زیارت گاہوں تک محدود ہیں۔

حج کے ختم ہونے پر مسلمان مدینہ جا کر روضۃ النبی یعنی محمد صاحب کی قبر کی زیارت کرتا ہے۔ اسوقت سے حج کرنے والا حاجی کے معزز لقب سے پکارا جاتا ہے

تیسری فصل

اسلامی تہوار

سال کے درمیان مسلمان کئی ایک تہوار مناتے ہیں۔ ان تہواروں میں کسی نہ کسی خاص مذہبی تاریخی واقعہ کا تعلق پایا جاتا ہے۔ بعض

بعض ان میں تو عید یعنی خوشی کے موقعے ہیں اور بعض کسی سنجیدہ یا غمناک واقعہ کی یاد ہیں۔ بہر حال یہ سب کے سب بطور تیوہار ہی کے منائے جاتے ہیں۔

(۱) بقر عید

مسلمانوں کی یہ سب سے بڑی عید ہے اسے عید الضحیٰ اور عید الاضحیٰ یعنی عید قربان بھی کہتے ہیں۔ یہ قربانی درحقیقت حج کے رسوم میں سے ہے کہ جس کا ذکر گذشتہ فصل کے آخری حصہ میں ہو چکا ہے اور جب مکہ میں حاجی جمع ہو کر حج کے آخری رسوم بجا لاتے اور قربانی گذرانتے ہیں تو اس وقت تمام مسلمان بھی تمام جگہ اس رسم کو پوری کرتے ہیں۔ قربانی کا حکم سورہ حج کی ۳۳-۳۸ آیات میں پایا جاتا ہے۔

اسلام میں کس طرح اس کا آغاز ہوا قابل بیان ہے۔ مدینہ میں ہجرت کرنے کے بعد محمد صاحب نے دیکھا کہ فرعون کے ہاتھ سے موسیٰ اور بنی اسرائیل کی رہائی کے واقعہ کی یادگاری میں یہودی ساتویں مہینہ کی دسویں تاریخ کو کفارہ کا روزہ رکھتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ محمد صاحب کا یہودیوں سے دوستانہ تعلق تھا۔ اس لئے آپ نے یہود کے ساتھ روزہ رکھا اور اپنے اصحاب کو بھی اس کا حکم دیا۔ دوسرے سنہ ہجری میں جب یہودیوں کے ساتھ دوستانہ تعلق ٹوٹ گیا تو محمد صاحب نے بجائے روزہ رکھنے کے نہ صرف بقر عید کا تیوہار مقرر کر لیا بلکہ عرب کے بت پرستوں کی ایک رسم بھی قبول کر لی۔ عرب کے بت پرست ہر سال ان دنوں مکہ کا حج کیا کرتے تھے۔ اور جانور کی قربانی کرنا حج کے خاتمہ کا ایک جزو تھا اب محمد صاحب نے یہ کیا کہ اپنی اس نئی عید کا دن ذی الحج کی دسویں تاریخ مقرر کر دی جو وہی دن ہے کہ جس روز عرب کعبہ کے پاس جانوروں کی قربانیاں کرتے تھے۔ اس سے محمد صاحب کی دور اندیشی کا ایک

اور ثبوت ملتا ہے۔

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اس عید کو ماننے والے کو بڑا ثواب ملتا ہے چنانچہ ایک مشہور حدیث میں عائشہ سے روایت ہے کہ محمد صاحب نے ایک مرتبہ فرمایا کہ انسان کا کوئی کام خدا کو عید الضحیٰ کے دن خون بہانے سے زیادہ خوش نہیں آتا کیونکہ بالیقین قربان کیا ہوا جانور قیامت کے دن اپنے سینگ اور بال اور کھر سمیت آکر قربانی کرنے والے کے نیک اعمال کے پلہ کو بھاری کردے گا اور یقیناً اس کا خون زمین پر گرنے سے پہلے خدا کو مقبول ہوتا ہے۔ اس سبب سے تمہیں اس سے خوش ہونا چاہیئے (مشکوٰۃ المصابیح۔ کتاب ۴ باب ۴۹ فصل ۲ لیکن مقابلہ کرو سورۃ الحج کی آیت ۳۸ سے)

مفسر جلال الدین السیوطی کا بیان ہے کہ ابراہیم کا اپنے بیٹے اسمٰعیل کو خدا کے حکم پر قربان کردینے کی رضامندی کی یادگاری میں یہ عید مقرر ہے۔ ایک مسلمان مصنف اس قصہ کا ذکر یوں کرتا ہے کہ جب ابراہیم کعبہ بنا چکے تو خدا نے انہیں حکم دیا کہ اپنے بیٹے اسمٰعیل کو قربان کرے۔ خدا کے حکم کے مطابق ابراہیم اپنے بیٹے کو لے کر کعبہ کے پاس گئے تاکہ اسے قربان کریں اور کئی مرتبہ اپنے بیٹے کا گلہ کاٹنے کی غیر موثر کوششیں کیں یعنی جب چھری چلائی چل نہ سکی تو اسمٰعیل نے باپ سے کہا کہ میرے لئے یہ آپ کا ترس اور آپ کی شفقت ہے کہ آپ کے ہاتھ سے چھری خطا کر جاتی ہے۔ آپ اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر مجھے ذبح کیجئے۔ ابراہیم نے اس صلاح پر عمل کیا اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر اور بسم اللہ کہہ کر جو چھری چلائی تو انہوں نے گمان کیا کہ بیٹے کا گلا کٹ گیا لیکن اسی اثناء میں جبرئیل نے لڑکے کو ہٹا کر ایک مینڈھا اس کی جگہ رکھ دیا تھا۔

قرآن میں کہیں بھی اس عید کا تعلق اسمٰعیل کے ساتھ نہیں دکھایا گیا لیکن

مسلمانوں کا خیال یہی ہے۔ اسمٰعیل کا نام بخاری کی صحیح حدیث میں آتا ہے تاہم مسلمان مصنفوں کی عام رائے یہی ہے کہ یہ بیٹا جسے قربان کرنے پر ابراہیم راضی تھے اسمٰعیل ہی تھا اسحٰق نہیں اور کہ قربانی کی جگہ مکہ کے قریب منیٰ کا پہاڑ تھا اور موریا کی سرزمین نہیں تھی جیسا کہ بائبل میں پیدائش کی کتاب کے بائیسویں باب کی دوسری آیت میں مذکور ہے (مقابلہ کرو ۲۔ تواریخ ۳ : ۱)

بقر عید اس طرح منائی جاتی ہے کہ عیدگاہ میں جمع ہو کر مسلمان نماز پڑھتے ہیں۔ جب نماز ختم ہو جاتی ہے تو مسلمان خوشی خوشی ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے اور پھر باقی دن ضیافت اور خوشی منانے میں صرف کرتے ہیں۔ اس موقعہ پر تمام مسلمان اچھے لباس میں آراستہ ہو کر نکلتے ہیں اور بچوں کو نئی اور بھڑکیلی پوشاک پہناتے ہیں۔

عیدگاہ سے گھر لوٹ کر قربانی کی جاتی ہے۔ ہر مسلمان کے لئے بقر عید منانا اور صاحب استعداد کے لئے قربانی کرنا واجب ہے۔ قربانی بھیڑ یا بکرے کی کی جاتی ہے۔ ہندوستان میں عام دستور ہے کہ چند لوگ مل کر جو سات سے زیادہ نہ ہوں ایک گائے یا اونٹ اپنی طرف سے قربانی میں ذبح کرتے ہیں۔ قربانی کے جانور کا بے داغ اور بے نقص ہونا ضروری ہے۔

جب بقر عید کی نماز ہو چکتی ہے تو جو خاندان میں بڑا ہوتا ہے وہ بھیڑ یا اونٹ یا ہندوستان کے دستور کے مطابق گائے گھر کے صحن میں قبلہ رُخ لٹا کر بسم اللہ اور اللہ اکبر کہتے ہوئے ذبح کرتا ہے اور کسی دوسرے طریقہ پر جانور کا گلا کاٹنا حرام ہے۔ سورۃ الحج کی ۳۴ آیت میں خدا کا نام لے کر ذبح کرنے کا حکم یوں آیا ہے

اور ہر ایک امت کے لئے ہم نے قربانی قرار دی تھی تاکہ خدا نے جو اُن کو مویشی چارپائے دے رکھے ہیں (قربانی کرتے وقت) اُن پر خدا کا نام لیں۔

قربانی کے جانور کا گوشت تب اس طرح تقسیم کیا جاتا ہے کہ ایک تہائی رشتہ داروں اور دوسری تہائی غریبوں کو تقسیم کی جاتی ہے اور باقی حصہ گھر کے استعمال کے لئے رکھ چھوڑتے ہیں۔

(۲) عید الفطر:-

رمضان کے روزوں کے ختم ہونے پر یہ عید منائی جاتی ہے کہ جیسے بقرعید سے جو عید الکبیر (بڑی عید) کہلاتی ہے۔ امتیاز کرنے کو عید الصغیر یعنی چھوٹی عید کہتے ہیں۔ رمضان کے ختم ہونے پر جب اسلامی سال کا دسواں مہینہ شوال کا نیا چاند دکھائی دیتا ہے تو اس مہینہ کی پہلی تاریخ اس عید کا دن ہے۔ عید کے چاند نکلنے کا اعلان توپ داغ کر یا پٹاخے چھوڑ کر کیا جاتا ہے۔ چاند دیکھتے ہی مسلمان اپنی دلی مسرت اور خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو چاند مبارک! کہہ کر مبارکباد دیتے ہیں۔

چاند کے دوسرے دن جب عید منائی جاتی ہے تو سب سے پہلا کام جو مسلمان پر واجب ہے وہ صدقۂ فطر کا ادا کرنا ہے۔ اس صدقہ میں گیہوں یا گیہوں کا آٹا یا خرما یا کشمش یا ان کی مقررہ مقدار کی قیمت دی جاتی ہے۔ صدقہ ادا کرنے کے بعد مسلمان عیدگاہ یا کسی خاص بڑی مسجد میں نماز کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ امام نماز ختم کر کے ممبر کے دوسرے زینے پر کھڑا ہو کر لوگوں کو خطبہ سناتا ہے۔ خطبہ پڑھنے کے بعد امام مناجات یعنی دعا کرتا ہے اور تمام لوگ دعا میں شریک ہو کر اپنے گناہوں کی معافی۔ بیماروں کی صحت۔ بارش کی کثرت۔ فصل کی افراط اور مصیبت سے پناہ اور قرض سے رستگاری کے لئے خدا سے التجا کرتے ہیں۔ یہ دن بھی خوشی منانے اور ضیافت دینے میں صرف ہوتا ہے۔

(۳) بارہ وفات :۔

یہ تیوہار ہندوستان میں خاص کر منایا جاتا ہے۔ دیگر ممالک میں اس کا رواج کم ہے اور اسلامی سن کے تیسرے مہینہ ربیع الاول کی بارہ تاریخ کو یہ تیوہار پڑتا ہے۔ مسلمان کہتے ہیں کہ محمد صاحب جس تاریخ کو پیدا ہوئے تھے اسی مہینہ کی اسی تاریخ کو وفات بھی پائی۔

(۱) یوں یہ تیوہار محمد صاحب کی وفات کی یادگاری میں صحیح طور پر منایا جاتا ہے۔ اس کے اگلی شام کو صندل کی لکڑی گھس کر کپڑے میں اس کو تر کرتے ہیں۔ پھر کسی چیز میں رکھ کر عیدگاہ یا کسی اور جگہ لے جاتے ہیں جہاں فاتحہ دینے کے بعد اسے لوگوں میں بانٹ دیتے ہیں مقصود اس رسم سے یہ ہے کہ لوگوں کو اطلاع ہو جائے کہ دوسرے دن عرس منایا جائے گا۔ بارھویں تاریخ کی صبح کو مسجدوں یا گھروں میں قرآن کی تلاوت کی جاتی ہے۔ پھر کھانا پکا کر فاتحہ دیتے ہیں بعض لوگوں کے پاس قدم رسول ہوتا ہے یہ ایک ایسا پتھر ہے کہ جس پر قدم کا نشان ہوتا ہے اور بارہ وفات کے روز اسے جس جگہ رکھتے ہیں وہ جگہ نہایت عمدہ طور پر سجائی جاتی ہے تب خاص رسم ادا کرنے کے لئے لوگ جمع ہوتے ہیں اور میلاد خوان نبی کی ولادت معجزات اور وفات کا بیان پڑھ کر لوگوں کو سناتے ہیں۔ کچھ قرآن کا حصہ اور درود بھی پڑھا جاتا ہے۔ وہابی بارہ وفات نہیں مناتے ہیں کیونکہ قرآن یا حدیث میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

(۲) لیکن ہندوستان میں مصر اور دیگر ممالک کی طرح اس تاریخ کو محمد صاحب کی پیدائش کی یادگاری کا تیوہار مناتے ہیں رسم زیادہ بڑھتی جا رہی ہے اور اس لئے یہ دن اب جشن میلاد شریف۔ یعنی محمد صاحب کی پیدائش کی خوشی کا دن کہلاتا ہے۔ اس موقعہ پر نعتیہ قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ غزلیں گائی جاتی ہیں اور محمد صاحب

کی عادات وخصائل اور کامیابیوں کا ذکر سنایا جاتا ہے۔

(۴) آخری چہار شنبہ:۔

جسے سندوستان میں آخری بدھ کہتے ہیں اور اس سے مراد اسلامی سال کے دوسرے مہینہ کا آخری بدھ ہے اور یہ تیوہار اس بات کی یادگاری میں منایا جاتا ہے کہ محمد صاحب کو ایسے عارضہ سے جو دوسرے مہینہ میں آپ کی وفات کا باعث ہوا کچھ تخفیف ہوئی تھی اور زندگی میں آخری مرتبہ غسل کیا تھا۔ اس روز میٹھی شیر پال پکا کر نبی کے نام فاتحہ پڑھتے ہیں بعض جگہ ایک عجیب دستور پایا جاتا ہے کہ جسے سات سلاموں کا پینا کہتے ہیں۔ لوگ کیلے یا آم کا پتہ یا کاغذ کا پرچہ کسی ملا کے پاس لے جاتے ہیں وہ اس پر قرآن کی ان سات مختصر آیتوں کو لکھ دیتا ہے کہ جس میں لفظ "سلام" آیا ہے اور لکھوانے والا اس تحریر کو خشک ہونے سے پہلے پانی میں دھو کر پی لیتا ہے۔ اس طرح آیندہ کی سلامتی اور خوشحالی گویا وہ لینے لئے حاصل کرتا ہے۔

سنیوں میں یہ خوشی کا دن ہے لیکن شیعوں کے نزدیک یہ دن منحوس ہے وہابی یہ تیوہار نہیں مانتے کیونکہ اسکا ذکر قرآن وحدیث میں کہیں نہیں آیا ہے۔

(۵) شب برات:۔

اس کے معنے ہیں کتابت کی رات اور اسلامی سن کے آٹھویں مہینہ شعبان کی چودہ تاریخ کی رات کو یہ تیوہار منایا جاتا ہے حدیث میں ذکر ہے کہ محمد صاحب نے کہا ہے کہ اس رات خدا تعالے سب اعمال جو بندوں سے سال آیندہ میں سرزد ہونے کو ہوتے ہیں اور انسان کے پیدا ہونے والے بچوں اور مرنے والے لوگوں کو کتاب میں درج کرتا ہے۔

محمد صاحب نے اپنے لوگوں کو ہدایت کی ہے کہ اس رات کو جاگیں اور خاص دعاؤں کی تلاوت کریں اور دوسرے دن روزہ رکھیں لیکن حقیقتاً اس

روز بڑی خوشی منائی جاتی ہے اور اکثر بہت روپیہ آتش بازی میں صرف کیا جاتا ہے

(۶) محرم :-

اسلامی سن کا یہ پہلا مہینہ ہے لیکن اب ماتم کے ان دنوں کا نام اس سے سمجھا جاتا ہے کہ جو شیعہ لوگ علی اور ان کے دونوں بیٹوں حسن اور حسین کی شہادت کی یاد میں صرف کرتے ہیں۔ ہندوستان کے مختلف مقامات میں مختلف طریقہ سے اس کے رسوم منائے جاتے ہیں لیکن ہندوستان میں جس طرح محرم عام طور سے منایا جاتا ہے۔ ذیل میں ہم اس کا ذکر درج کرتے ہیں۔

محرم کے مہینہ کا جب چاند دکھائی دیتا ہے تو لوگ امام باڑہ یا عاشورہ خانہ (حسین کے لفظی معنے دس دن والے گھر کے ہیں۔) میں جمع ہو کر شربت یا مٹھائی پر حسین کے نام کی فاتحہ پڑھتے ہیں اور پھر غریبوں کو بانٹ دیتے ہیں جنوبی ہند میں پھر وہ ایک جگہ الاؤ کے لئے معین کرتے ہیں جس میں ہر رات آگ جلائی جاتی ہے اور دس دن برابر سب لوگ بڈھے جوان اس آلاؤ کے گرد حلقہ باندھ کر اور تلواریں اور لکڑیاں ہاتھ میں لے کر خوب کودتے ہیں اور لڑائی کے لئے اکسلانے ہوئے چلا چلا کر کہتے ہیں علی! امام حسین!! امام حسین! دولھا۔ دولھا! دوست دوست!

عاشورہ خانہ حسن کا دستور صرف جنوبی ہندوستان میں ہے بالعموم چند روز کے لئے بنایا جاتا ہے اس کی دیواروں پر سیاہ کپڑا چڑھاتے ہیں اور عمدہ خط میں قران کی آیات لکھ کر اس کے کناروں پر لٹکا دیتے ہیں۔ شمالی ہند کے امام باڑے بھی عموماً اس طرح سجائے جاتے ہیں۔ غرض کہ نہایت چمک دمک کے ساتھ یہ جگہ سجائی جاتی ہے ایک جانب تعزئے اور تابوت رکھے ہوتے ہیں جنہیں بانسوں سے بنا کر ابرق اور پنی وغیرہ اوپر سے مڑھ دیتے ہیں۔ یہ تعزئے اس روضہ کی نقل ہیں جو عراق کے مقام کربلا میں حسین کی مشہد پر بنا ہے اور بعض لوگ محمد صاحب

کی قبر کی نقل پر بھی جو مدینہ میں ہے بنا لیتے ہیں۔ تعزیوں کے پاس ایسی متعدد چیزیں بھی رکھی ہوتی ہیں جو ان چیزوں کے مشابہ سمجھی جاتی ہیں جو معرکۂ کربلا میں حسین نے استعمال کی تھیں۔ مثلاً سنہری پگڑی۔ تلوار۔ ڈھال۔ تیر و کمان۔ علم جھنڈوں میں ایک ایسا علم بھی ہوتا ہے کہ جس کے اوپر ایک پنجہ لگا ہوتا ہے۔ جس سے مراد نبی کے گھرانے کے لوگ ہیں یعنے محمد۔ فاطمہ علی حسن حسین +

ہر شب کو ان عاشورہ خانوں اور امام باڑوں میں کثرت سے لوگ جمع ہوتے ہیں اور مرثیہ سنتے ہیں۔ مرثیہ پڑھنے والے جنہیں مرثیہ خواں کہتے ہیں حسین کی توصیف میں اجرت پر گا کے سناتے ہیں۔ پھر ایک واقعہ خوان ممبر پر چڑھ کر علی اور اس کے کے بیٹوں کے بیدردی سے مارے جانے کا بیان سناتا ہے۔

ایسے بیانات کے سننے سے لوگوں کا جوش بھڑک اٹھتا ہے اور وہ بار بار اپنی جگہوں سے اُٹھ کر حقیقی یا بناوٹی غم کی حالت میں چلا چلا کہ علی! علی! حسین! حسین! کہتے ہیں اور اپنی چھاتیاں پیٹتے ہیں اور خلیفہ یزید پر لعنت بھیجتے ہیں کہ جس کے باعث یہ مارے گئے تھے۔

ساتویں دن عاشورہ خانہ یا امام باڑہ سے جلوس نکلتا ہے کہ جس میں لوگ گذرے واقعات کی یادگاری میں علم یعنی جھنڈے لئے ہوتے ہیں۔ ان میں خاص علم قاسم کا ہوتا ہے۔ حسن کے بیٹے قاسم کی شادی موت سے عین قتل حسین کی چاہتی بیٹی کے ساتھ ہوئی تھی اور اس شادی کی یادگار میں یہ علم اٹھایا جاتا ہے اور اس واقعہ کو یاد کر کے جلوس کے لوگ دولھا دولھا! کہہ کر چلاتے رہتے ہیں۔

دسویں تاریخ سے پہلی رات جسے مسلمان شب عاشورہ کہتے ہیں سب تعزیوں اور علم کا جلوس نکلتا ہے اس رات بڑی بھیڑ ہوتی ہے۔ مرد اور لڑکے عجیب عجیب طرح کی پوشاک پہن کر ادھر ادھر دوڑتے پھرتے ہیں۔

دسویں تاریخ عاشورہ کہلاتی ہے اس روز تعزیوں کو کسی میدان یا قبرستان میں لے جا کر کسی تالاب کے سامنے بڑے تعزیوں کی سجاوٹ اور آرائش کی چیزیں اتار کر وہاں دفن کر دیتے ہیں یا پانی میں بہا دیتے ہیں۔ چھوٹے اور کم قیمت سستے تعزئے پانی میں ڈبو دیئے جاتے ہیں۔ یہ میدان کربلا سمجھا جاتا ہے اور تالاب کا پانی اس شدید تشنگی کی یاد دلاتا ہے جو حسین اور اس کے ساتھیوں پر موت سے پہلے گزری تھی۔

بارھویں تاریخ تمام رات بیٹھ کر قرآن و مرثیے پڑھتے ہیں اور امام حسین کی تعریف کرتے ہیں۔

تیرھویں تاریخ کو کھانا پکوا کر اور فاتحہ اس پر دے کر محتاجوں کو تقسیم کرتے ہیں۔

سنی محرم کے رسوم کو پسند نہیں کرتے جس کی وجہ آنے والی فصل میں معلوم ہوگی لیکن دسویں تاریخ عاشورہ کو ایک خاص دن کے طور پر وہ مانتے ہیں۔ یہ دن ان کے نزدیک نہایت مستحسن ہے کیونکہ اس روز کہتے ہیں خدا نے آدم اور حوا۔ بہشت اور دوزخ۔ اور مسند عدالت اور لوح اور قلم اور تقدیر اور زندگی اور موت کو پیدا کیا۔

چونکہ فرقۂ شیعہ کا بہت کچھ ذکر آچکا ہے اس لئے اس موقعہ پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے مختلف فرقوں کا بیان کیا جائے۔

چوتھی فصل

اسلام کے فرقے

بیان کیا جاتا ہے کہ محمد صاحب نے پیشین گوئی کی تھی کہ میرے لوگ بہتیرے فرقوں میں بٹ جائیں گے۔ محمد صاحب کی یہ حدیث کتاب مشکوٰۃ المصابیح میں یوں آئی ہے کہ "عبداللہ ابن عمر سے روایت ہے کہ محمد صاحب نے کہا کہ تحقیق میری امت کے لوگوں کا وہی حال ہوگا جو بنی اسرائیل کا ہوا تھا بنی اسرائیل بہتّر فرقوں میں بٹ گئے تھے اور میری امت کے تہتّر فرقے ہو جائیں گے۔ جن میں سے ہر ایک جہنم کو جائیگا سوائے ایک کے۔ اصحاب نے پوچھا کہ یا رسول اللہ وہ ایک فرقہ جو بچ جائے گا کونسا ہوگا۔ آپ نے فرمایا وہ جو میرے طریق کے پیرو اور میرے دوست ہیں (مشکوٰۃ المصابیح کتاب اوّل باب ۱، فصل ۲) محمد صاحب کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی ہاں اس قدر فرق ضرور ہے کہ ان فرقوں کی مجموعی تعداد تہتّر سے کہیں زیادہ ہے۔

یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ کس حد تک آنے والے اختلافات کے حقیقی اسباب کا محمد صاحب کو علم تھا۔ اوپر کی حدیث کے الفاظ سے تو یقیناً تفرقے کا اصلی سبب معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ تفرقے نہ تو مذہب کی بنا پر تھے اور نہ ہی تعلیمی اختلافات کے سبب واقع ہوئے بلکہ مختلف فرقے ایک وسیع معنے میں ہمیشہ اسلام کے خاص مذہبی اصول کو مانتے آئے ہیں اور اس لئے مسلمان کہلانے کے مستحق ہیں۔ وہ خاص مذہبی اصول یہ ہیں۔ اوّل کلمہ کہ کوئی معبود

نہیں سوائے اللہ کے اور محمد اللہ کا رسول ہے اور دوم یہ عقیدہ کہ قرآن خدا کی آخری اور کامل کتاب ہے۔ اور اس حیثیت سے کتب سابقہ کو منسوخ کرتی اور ان کی جگہ لیتی ہے۔

بلکہ جس چٹان پر ٹکرا کر اسلام کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے وہ خلافت کا مسئلہ تھا یعنی ایک سیاسی معاملہ اور درحقیقت یہ سیاسی اختلافات ہی تھے کہ جن سے بہتیرے تفرقے اور بدعتیں نکل کھڑی ہوئی ہیں۔ کون محمد صاحب کا جانشین ہو؟ یہی ایک اہم سوال تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ محمد صاحب کوئی اپنا جانشین مقرر کئے بغیر انتقال کر گئے اور نہ قرآن میں اس مسئلہ پر ہدایت چھوڑ گئے علی محمد صاحب کے داماد چونکہ اپنے آپ کو حقدار سمجھتے تھے ابتدا ہی سے انہوں نے خلافت کا دعوےٰ کیا اور بعضوں نے ان کی حمایت کی لیکن تین مختلف موقعوں پر وہ خلیفہ ہونے سے رہ گئے اور لوگوں نے ابوبکر۔ عمر و عثمان کو یکے بعد دیگرے خلیفہ منتخب کیا اور گو کہ شریعت کی تعلیم کے مطابق یہ تینوں خاندان قریش میں سے ہی چنے گئے تھے تاہم علی کا تین موقعوں پر انتخاب میں نہ آنا حسد سازش اور بغاوت کا کافی سبب تھا۔

سنیّ

سنی اس راسخ الاعتقاد فرقہ کے ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں کہ جس کا ذکر محمد صاحب کی حدیث مذکورہ بالا میں پایا جاتا ہے۔ کیونکہ سنی وہ شخص ہے جو سنت رسول یعنی طریق محمد کا پیرو ہے وہ پہلے چار خلفاء کو محمد صاحب کے جائز جانشین مانتا ہے۔ احادیث کی چھ کتابوں کو جو صحاح ستہ کہلاتی ہیں قبول کرتا ہے اور چار مذاہب میں کسی ایک نہ ایک کا وہ مقلدّ

ہوتا ہے اور چاروں اماموں کے اجماع کی تقلید ضروری سمجھتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں سنی مسلمانوں کا وہ گروہ ہے کہ جو اپنے آپ کو اہل سنت کہلانے کا مستحق قرار دیتا ہے اگرچہ دوسرے فرقے بھی محمد صاحب کے نمونے کی پیروی کرنے کے مدعی ہیں تاہم ان کا دعوےٰ ہے کہ طریق نبوی کے پیرو یہی ہیں۔

اس لئے اس کتاب میں جہاں کہیں راسخ الاعتقاد یا کٹر مسلمانوں کا ذکر آیا ہے ان سے ہماری مراد سنی ہی ہیں جو شمار میں اسلام کے دوسرے فرقوں سے کہیں زیادہ ہیں سوائے ایران کے تمام اسلامی ممالک میں ان کو غلبہ حاصل ہے۔ چند سال ہوئے کہ یہ تخمینہ لگایا گیا تھا کہ دنیا کی ساری اسلامی آبادی میں کہ جس کا شمار تئیس کروڑ پچاس لاکھ ہے تقریباً اکتیس کروڑ پچاس لاکھ سنی ہیں اور سنیوں کے اس شمار میں ۹ کروڑ سے زیادہ حنفی مذہب کے مقلد ہیں۔

خوارج

ہم کہہ چکے ہیں کہ اسلام میں فرقوں کا شروع سیاسی معاملات سے ہوا اور اس کی صریح مثال فرقۂ خوارج کا آغاز ہے۔ یہ فرقہ اسلامی فرقوں میں سب سے پرانا ہے۔ ہم بتا چکے ہیں[1] کہ جنگ صفین کے موقعہ پر جب خلیفہ علی اور معاویہ مدعی خلافت کے مابین جنگ ہو رہی تھی تو کس طرح علی کی جماعت کے کچھ لوگ ان کا ساتھ چھوڑ کر الگ ہو گئے تھے اور یہی خوارج کہلائے اس جنگ کے موقعہ پر چونکہ خلافت کا فیصلہ علی نے پنچ پر چھوڑ دیا تھا۔ اس لئے ناراض ہو کر انہوں نے علی پر بزدلی کا الزام لگایا اور علیحدہ اپنی جماعت قائم

[1] دیکھو باب اوّل فصل ۳

کر لی لیکن انہوں نے خاص کر اس اصول پر اپنی بنیاد رکھی کہ خلافت کسی ایک خاندان یا قبیلہ مثلاً قریش کے کسی شخص کا اکیلا حق نہیں ہے بلکہ وہ مانتے تھے کہ چاہئے کہ محمد صاحب کا جانشین تمام مومنوں کی رائے سے ایسا شخص چنا جائے جو سب میں لائق ہو خواہ وہ حبشی ہی کیوں نہ ہو۔ درحقیقت یہ پکے جمہوری حکومت پسند بدو تھے۔

پہلی تین صدی ہجری میں اس فرقہ کے باعث بڑی خونریزی ہوئی یہ مذہب کے بڑے جنونی اور لڑنے میں بڑے دلیر تھے یہاں تک کہ اندیشہ تھا کہ جہاد کہیں اسلام کا چھٹا رکن نہ بن جائے۔

اس فرقہ کے لوگ اب تک پائے جاتے ہیں مگر اب دوسرے ناموں سے مشہور ہیں اور مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں اور خاص کر شمالی افریقہ میں ادھر اُدھر یہ منتشر ہیں۔

شیعہ

اسلام کے تمام بدعتی فرقوں میں شمار اور اثر کے اعتبار سے سب سے زیادہ اہمیت فرقہ شیعہ کو حاصل ہے۔ خارجی فرقہ کی طرح اس کا آغاز بھی خلافت کے جھگڑے سے ہوتا ہے۔ لفظ شیعہ کے معنی ہیں طرفدار کے اور اس سے مراد طرفداران علی ہیں۔ چونکہ محمد صاحب کے کوئی بیٹا نہیں تھا اس لئے ان لوگوں نے شروع ہی سے دعوےٰ کیا کہ پہلے جائز خلیفہ یا امام علی ہی تھے۔ انہوں نے محمد صاحب کے جانشین کے لئے خلیفہ کے بجائے لفظ امام کے استعمال کو ترجیح دی۔ شیعوں کو اس کا بشدت انکار ہے کہ عام انتخاب کے ذریعہ خلیفہ کا تقرر ہو سکتا ہے اور اس لئے وہ محمد صاحب کے

پہلے تین جانشینوں کی خلافت کا انکار کرتے ہیں ۔
ہم ان مصائب کا ذکر پہلے کر چکے ہیں کہ جو علی کے خاندان پر نازل ہوئیں اور یہ بھی بتا چکے ہیں کہ وہ خود کس طرح کوفہ میں قتل کئے گئے ان کا بڑا بیٹا حسن زہر سے ہلاک ہوا ۔ اور چھوٹا بیٹا حسین کربلا کے میدان میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ یزید کے حکم سے مارا گیا ۔ شیعہ یزید کو غاصب قرار دیتے ہیں اور اسے پلید کے نام سے پکارتے ہیں ۔
اس وقت سے حسین کی قبر کربلا میں اور علی کی نجف میں مقدس مقامات سمجھے جاتے ہیں اور یہ شیعہ لوگوں کی زیارت گاہیں ہیں کہ جنہیں ان کا مکہ کہنا بے جا نہ ہو گا ۔ کاظمین اور سامرّا بھی کہ جہاں بارہ اماموں میں سے بعض کی قبریں ہیں متبرک جگہیں سمجھی جاتی ہیں ۔ یہاں اور کربلا اور نجف میں شیعہ مرنے کے بعد دفن کئے جانے کی آرزو رکھتے ہیں ۔
شیعہ لوگوں نے محمد صاحب کے گھرانے کی تعظیم میں اس قدر مبالغہ کیا ہے کہ جس سے کم از کم خود ان کے درمیان محمد صاحب کی عزت میں کمی واقع ہوتی ہے ۔ معلوم ایسا پڑتا ہے کہ محمد صاحب علی سے اور حسین اپنے بڑے بھائی اور باپ سے بڑھ کر سمجھے جاتے ہیں ۔ شیعہ لوگوں پر اکثر اس بات کا بڑا اثر پڑتا ہے کہ ان کے خیال میں حسین نے خدا اور اپنے پیروؤں کے درمیان میل کرانے کے لئے اپنی جان قربان کر دی ۔
شیعہ لوگوں کے متعلق یہ کہنا صحیح ہے کہ مسئلہ خلافت پر اپنی رائے کے سبب انہوں نے عجیب مذہبی مسائل بنا لئے ہیں کہ جس سے خود ان کے اور راسخ الاعتقاد جماعت کے درمیان یہاں تک طول کھینچا کہ فرقہ بندی کا اظہار ان میں بڑھ گیا اور جس کی تعداد بعض کے قول کے مطابق ستر تک ہے اور ان میں

سے ہر فریق دوسرے فریق کا مخالف ہے۔
اب ہم اختصار کے ساتھ فرقۂ شیعہ کی بعد کی تبدیلی پر غور کریں گے
شیعوں کو امامیہ بھی کہتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ محمد صاحب کے
جانشین کو بجائے خلیفہ کہنے کے امام کے خطاب سے پکارتے ہیں اور ان کا یہ
ایمان ہے کہ سچے امام کی شناخت ہی اسلام ہے اور اس لئے وہ اپنے
آپ کو مومنین کہتے ہیں اگرچہ سنی بھی مومن کہلانے کا دعوے کرتے ہیں۔
خلافت کے متعلق اپنے اس دعوے کی تائید میں وہ کہتے ہیں کہ محمد
صاحب نے خدا کی ہدایت سے علی کو اپنا جانشین اپنی عین حیات میں مقرر
کر دیا تھا اور مسئلہ امامت پر اپنی نرالی رائے کی تائید میں قرآن کی یہ رائے
پیش کرتے ہیں جو سورہ بقر کی ۱۱۸ آیت (رکوع ۱۵) میں پائی جاتی ہے "جب
ابراہیم کو ان کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا اور انہوں نے ان کو
پورا کر دکھایا تو خدا نے فرمایا کہ ہم تم کو لوگوں کا امام بنانے والے ہیں۔ ابراہیم
نے عرض کیا اور میری اولاد میں سے؟ فرمایا ہاں مگر ہمارے اس اقرار میں
وہ داخل نہیں جو برسرِ ناحق ہوں گے۔" اس آیت کی بنا پر شیعہ یہ دلیل پیش
کرتے ہیں کہ امامت یا خلافت کے عہدے کا تقرر خدا کی طرف سے ہوتا ہے
اور چونکہ اس اقرار یا عہد میں جو اس آیت میں پایا جاتا ہے وہ لوگ شامل
نہیں ہیں جو برسرِ ناحق ہیں اس لئے خدا کے مقرر کردہ امام کو چاہئے کہ بے
لوث ہو اور گناہ کرنے پر قادر نہ ہو۔
یہ عجیب خیال عام طور پر تمام مسلمانوں میں پایا جاتا ہے کہ دنیا کی پیدائش
سے پیشتر خدا نے اپنے نور سے ایک شعاع لے کر محمد صاحب کے نور کو جو
نور محمدی کہلاتا ہے پیدا کیا۔ شیعہ کہتے ہیں کہ یہ نور محمد صاحب سے علی کو

اور پھر علی سے نسل بعد نسل باقی اور سچے امام کو منتقل ہوتا رہا۔ اس طرح علی اور اس کی نسل کو یہ لوگ قریب قریب صفات الٰہی سے متصف ماننے لگے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شیعوں کے ایمان کے مطابق امام کا محمد صاحب کی نسل سے ہونا ضروری ہے۔ اب اس قید سے سلسلہ امارت یا خلافت بنو فاطمہ میں محدود ہوتا ہے فاطمہ سے علی کی وہ نسل مراد ہے جو محمد صاحب کی بیٹی فاطمہ سے چلی اور فاطمہ کے علاوہ اور دوسری بیویوں سے جو علی کی نسل چلی وہ سلسلہ امامت سے خارج ہے۔ شیعوں کو بنو عباس کے دعوٰے خلافت کا بشدت انکار ہے۔ بنو عباس سے مراد محمد صاحب کے چچا عباس کی نسل ہے۔ یہ تواریخ میں خاندان عباسیہ کے نام سے کہلاتے ہیں

اپنے ایسے عقیدہ کے باعث شیعوں کو بہت کچھ ظلم سہنا پڑا اور خاص کر خلفائے عباسیہ نے ان پر بڑی بڑی سختیاں کیں کہ جن سے تنگ آ کر انہوں نے تقیہ کا مسئلہ نکالا۔ تقیہ کے لفظی معنی تو بچاؤ یا حفاظت کے ہیں لیکن شیعوں کی اصطلاح میں اس سے اپنے عقائد کو چھپانا سمجھا جاتا ہے (مقابلہ کرو سورہ آل عمران کی ۲۷ آیت سے) اس مسئلہ کے مطابق مذہب کی خاطر ایذا رسانی سے بچنے کے لئے شیعہ اپنے عقائد کو چھپا سکتا ہے۔ بلکہ اسے جائز ہے کہ اپنے آپ کو سنی ظاہر کرے۔ غرض کہ تقیہ پر عمل کرنے سے وہ بالکل نہیں جھجکتا کیونکہ وہ مانتا ہے کہ اس کا یہ عمل محض امام باطن کے حکم کی پیروی کرنا ہے۔

امام باطن پر ایمان رکھنا ایک اور عجیب عقیدہ ہے کہ جو شیعوں کو ایجاد کرنا پڑا۔ علی سے لے کر کل اماموں کا شمار بارہ [۱۲] ہے اور وہ مانتے ہیں کہ بارھواں [۱۲] امام ابو القاسم جو المہدی کے نام سے مشہور ہے سنہ ۹۴۰ء

میں سامرا کے غار میں غائب ہو گیا اور ان کا عقیدہ ہے کہ یہ اب تک زندہ ہے اور مومنین کی ہدایت کرتا ہے اور قیامت کے قریب جب دنیا کا آخر ہوگا تو پھر ظاہر ہو کر دنیا میں اسلام پھیلائیگا اور اس امام کی وفاداری کا عہد کرنا شیعہ مذہب کے خاص اصول میں داخل ہے یہ بات بھی قابل غور ہے کہ سنیوں میں جو مرتبہ خلیفہ کو حاصل ہے شیعوں میں امام کا مرتبہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ وہ محض محمد صاحب کا دنیا میں وارث ہی نہیں بلکہ ایک معصوم اور ناممکن الخطا استاد بھی ہے اس لئے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بحث طلب امور کے فیصلہ کرنے کا امام کو پورا پورا اختیار حاصل ہے۔ شیعوں کے ایمان کے مطابق امام کا مذہبی اختیار سنیوں کے اصل اجماع سے زیادہ معتبر ہے۔

جو شیعہ ان بارہ اماموں کو مانتے ہیں وہ اثنا عشریہ کہلاتے ہیں۔ فرقہ شیعہ کے زیادہ لوگ اثنا عشریہ ہیں۔ قریب ستر لاکھ اس عقیدے کے شیعہ ایران میں پائے جاتے ہیں کہ جہاں کا یہ سرکاری مذہب ہے۔ اور پچاس لاکھ اس عقیدے کے لوگ ہندوستان میں ہیں جن کا صدر مقام لکھنؤ ہے۔ فرقہ شیعہ کی چند اور خاص باتیں اختصار کے ساتھ ذیل میں پائی جاتی ہیں۔

سنیوں کی چھ حدیث کی کتابیں جنہیں صحاح ستہ کہتے ہیں یہ نہیں مانتے بلکہ اُن کے بجائے پانچ اور کتابیں مانتے ہیں جنہیں یہ اخبار کہتے ہیں۔ یہ اخبار احادیث کے ایسے مجموعے ہیں کہ جن کی اسناد میں صرف علی اور اس کے خاندان اور اماموں کے نام آئے ہیں۔ احادیث کے ان مجموعوں کا خاص مقصد علی کے دعوے خلافت کی تائید کرنا ہے۔

سنیوں کے برعکس شیعوں کا یہ عقیدہ ہے کہ مجتہد اب تک پائے جاتے ہیں اور ان کے علماء دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کو امام باطن کی تعلیم و تفسیر کرنے کا

حق حاصل ہے اور یوں اس عہدے کے سبب امام کے غلطی سے بری ہونے کی صفت میں بھی کسی حد تک شریک سمجھے جاتے ہیں۔ اس تعلیم کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ شیعوں میں سنیوں کی طرح مختلف مذاہب یعنی اختلاف خیالات نہیں ہے لیکن تاہم ترقی کا راستہ اُن کے لئے بھی مسدود ہے کیونکہ مجتہد کے فیصلوں کا قرآن اور اخبار کے مطابق ہونا لازم ہے۔

ایک اور دستور جو شیعوں کو سنیوں سے جدا کرتا ہے وہ متعہ ہے یعنی ایسا نکاح جو کچھ رقم کے ادا کرنے پر عارضی طور سے کچھ عرصہ کے لئے کیا جا سکتا ہے اور مقررہ میعاد کے گزر جانے پر یہ رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ سنی علماء سختی سے اس قسم کے نکاح کو بُرا ٹھہراتے اور زنا کاری کے برابر بتاتے ہیں۔

فرقۂ اسماعیلیہ

شیعوں کا ایک اور بڑا فرقہ اسماعیلیوں کا ہے جو بہتیری باتوں میں اثناعشریہ کی مانند ہے۔ اُن کا آغاز اس طرح ہوا کہ چھٹے امام جعفر نے اپنی امامت کا وارث اپنے بڑے بیٹے اسماعیل کو نہیں بلکہ اپنے چھوٹے بیٹے موسیٰ کو مقرر کیا شیعوں کی ایک بڑی تعداد نے امام جعفر کے اس فیصلہ کو منظور کر لیا اور اسماعیل کو امامت کے لائق نہیں سمجھا لیکن بعض شیعوں نے اسماعیل کے حق امامت کو تسلیم کر کے موسیٰ کی امامت کا انکار کیا اور یوں فرقہ شیعہ میں پھوٹ پڑ گئی۔ شیعوں کے اس گروہ کے نزدیک امام ظاہر کا سلسلہ امام اسماعیل پر ختم ہوتا ہے جو ساتواں امام تھا اس لئے یہ سبعیہ کہلاتے ہیں۔ اسماعیل کا بیٹا محمد ان کا پہلا امام تھا جو مکتوم یعنی امام غائب کہلایا۔ اس کے بعد چند اور امام بھی اسی نام سے کہلائے۔

شمالی افریقہ میں اس فرقہ کو بڑا فروغ ہوا کہ آخر کار انہوں نے وہاں خلافت

بنو فاطمہ قائم کرلی کہ جس کا پہلا خلیفہ عبید اللہ المہدی مقرر ہوا کہ جو علی اور فاطمہ کی نسل اور امام اسماعیل کی اولاد سے سمجھا جاتا تھا۔ خلافت بنو فاطمہ کے چھٹے خلیفہ حاکم بامراللہ سے کئی ایک دوسرے فرقے نکلے کہ جن میں سب سے مشہور ملک شام کا فرقہ دروزی ہے۔ سبعیہ تھوڑی تعداد میں ہندوستان۔ افغانستان۔ عرب اور ایران وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔

بوہرے

بوہروں کی جماعت اسماعیلیہ کی ایک شاخ ہے۔ یہ لوگ بمبئی اور بڑودہ میں خاص کر پائے جاتے ہیں ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے مطابق ان کا شمار ایک لاکھ ترپن ہزار سے کچھ زیادہ ہے۔ یہ زیادہ تر ہندو نسل کے مسلمان ہیں لیکن بعض عرب کی نسل سے ہونے کا دعوے کرتے ہیں۔ ہندوستان میں اس فرقہ کا آغاز عرب کے دینی داعیوں (مشنریوں) کے تبلیغی کام کا نتیجہ ہے ۱۵۳۹ء میں اس فرقہ کے سردار نے عرب چھوڑ کر ہندوستان کے شہر بڑودہ میں بودوباش اختیار کرلی۔ ۱۵۸۸ء میں اس فرقہ کی سرداری کے دو دعوے دار اٹھ کھڑے ہوئے جس کے سبب ان کی دو شاخیں ہوگئیں جو داؤدی اور سلیمانی کہلاتے ہیں۔ داؤدی شاخ کا داعی یا سردار سورت میں رہتا ہے اور سلیمانی شاخ کے داعی کا صدر مقام یمن ہے اور اس کا ایک نائب بڑودہ میں رہتا ہے۔ ان لوگوں کے مذہبی عقائد کا علم اور لوگوں کو کم ہے کیونکہ یہ لوگوں سے اپنے ایمان کی باتیں پوشیدہ رکھتے ہیں اور یہ دوسرے مسلمانوں سے علیحدہ رہتے ہیں۔ ان کے قبرستان اور مسجدیں بھی علیحدہ ہیں۔ داؤدی بوہرے صرف تین مرتبہ نماز پڑھتے ہیں یعنی صبح دوپہر اور رات کے وقت۔

خوجے

اسماعیلیوں کی ایک اور شاخ خوجہ کہلاتی ہے۔ خوجے خاص کر پنجاب سندھ کاٹھیاوار۔ بمبئی اور پونا میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے لوگ مشرقی افریقہ عرب اور ایران میں بھی ہیں ان کا شمار بوہروں سے ذرا ہی کم ہے۔ بوہروں کی طرح ان کا آغاز بھی گیارھویں صدی عیسوی میں مصر کے ایک خلیفہ بنو فاطمہ کی وفات سے ہوتا ہے چند سو برس ہوئے کہ اس فرقہ کے چند داعیوں نے ہندوستان میں آکر گجرات۔ سندھ اور ملتان جیسے مقامات میں سکونت اختیار کر لی اور ان لوگوں نے اپنی تعلیمات کو وہاں کے مروجہ ہندو اعتقاد کے مطابق بنانے کی کوشش کی چنانچہ قرآن سے ایک داعی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ علی وشنو کے دسویں اوتار تھے کہ عرصہ سے ہندو جس کے منتظر ہیں۔

خوجوں کی بھی دو شاخیں ہیں جو پنجابی خوجے اور آغا خانی خوجے کہلاتے ہیں۔ یہ فرق امامت کے اختلاف کے سبب سے ہے ورنہ اپنے مذہبی عقاید اور اعمال میں دونو یکساں ہیں۔ پنجابی خوجوں کی جماعت چھوٹی ہے اور وہ آغا خان کی امامت کے قائل نہیں ہیں بلکہ سنی جماعت کے چشتیہ اور قادریہ خاندانوں کے پیروؤں کو مانتے ہیں۔

خوجوں کی بڑی جماعت کہ جس میں ہندوستان سے باہر کے خوجے بھی شامل ہیں جو ہر طرف منتشر ہیں آغا خان کو اپنا امام تسلیم کرتی ہے۔ آغا خاں سوم جو آج کل زندہ ہیں اُس آغا خاں کے پوتے ہیں جس نے ۱۸۴۸ء میں ایران سے بھاگ کر سندھ میں سکونت اختیار کی تھی۔ آغا خاں کے باپ دادے ہمیشہ سے یہ دعویٰ کرتے آئے ہیں کہ ان کا سلسلۂ نسب براہ راست ساتویں

امام اسماعیل سے ہوتا ہوا علی سے ملتا ہے۔ آج کل جو آغا خان زندہ ہیں وہ بڑے دولت مند ہیں اور اپنے گھوڑ دوڑ کے گھوڑوں کے سبب یورپ اور انگلستان میں بہت مشہور ہیں۔

آغا خاں مسلمانوں کی اصلاحی تحریک کے ایک ہادی ہیں اور علیگڑھ یونیورسٹی کے وہ ہمیشہ بڑے مددگار رہے ہیں کہ جس کی امداد میں اور جس طرح دیگر قومی کاموں کے لئے بھی چندے میں بڑی رقم دیتے رہے ہیں۔ ان کے ہزاروں پیرو اس قدر ان کی تعظیم کرتے ہیں کہ جو پرستش سے کچھ ہی کم ہے اور ان کو اپنی عیش طلب زندگی کے چلانے میں اپنے ہدیوں سے مدد دیتے رہتے ہیں لیکن ان خوجوں کی جماعت میں اب باغیانہ روح ظاہر ہو رہی ہے اور وقتاً فوقتاً خاصی تعداد میں لوگ جماعت سے علیحدہ ہوتے رہتے ہیں۔ ۱۹۲۷ء میں کراچی کے خوجوں کی ایک جماعت نے جو آغا خاں سے ناخوش تھی "خوجہ انجمن مصلحین" نام جماعت کی طرف سے ایک کھلا خط آغا خاں کو بھیجا جس میں ان پڑھ خوجوں کی موجودہ بڑی تعداد کے باوجود آغا خاں کی عیش طلب زندگی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی تھی اور جماعت کی تنظیم میں بڑی تبدیلی کا تقاضا کیا تھا۔ انکے علاوہ اس خط میں ذیل کے مطالبات تھے کہ آغا خان کو چاہئے کہ جو ان کی الٰہی تعظیم کی جاتی ہے اسے ناجائز قرار دے کر اس کے ترک کرنے کا حکم نافذ کریں اور جو ہدیے ان کو بھیجے جاتے ہیں انہیں موقوف کر کے ان کے قبول کرنے سے انکار کریں اور جو دولت اپنے مریدوں سے روپیہ لے کر جمع کی ہے وہ جماعت کے ناخواندہ لوگوں کی تعلیم دلانے میں صرف کریں۔

بابی اور بہائی

دو اور جماعتیں ایسی ہیں کہ جن کی مرکزی تعلیم کا تعلق شیعوں کے مسئلہ امامت سے ہے اور یہاں ان کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ صحیح معنوں میں یہ جماعتیں اسلام کے فرقے نہیں ہیں بلکہ ان کا ظہور اسلام کی بغاوت ہے یہ سمجھنے کے لئے کہ ان کا آغاز کیسے ہوا، منکرین پر بس پیشتر قدیم شیعوں کے ایک پرانے اور ان کے پسندیدہ خیال کی طرف رجوع کرنا ہے۔ ان قدیم شیعوں کا عقیدہ تھا کہ بارھواں امام یعنی امام غائب جو مہدی کہلاتا ہے اپنے لوگوں کے ساتھ ایسے درمیانی کے ذریعہ تعلق قائم رکھتا تھا جو باب یعنی دروازہ کہلاتے تھے اور یکے بعد دیگرے مقرر ہوا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ ۶۹ سال تک جاری رہا اور تب آخری باب نے اپنا جانشین مقرر کرنے سے انکار کر دیا۔ نو صدی گزرنے کے بعد ایران میں مرزا علی نے پھر از سر نو اس مسئلہ کو تازہ کر کے خود باب ہونے کا دعوےٰ کیا اور اعلان کیا کہ مہدی اور ابنیاء کی عقل مجھ میں سکونت گزیں ہے مرزا علی ۱۸۲۰ء کو شیراز میں پیدا ہوا تھا اور اوائل عمر ہی میں مذہبی غور و فکر کی طرف مائل پایا گیا اور کم سنی ہی میں کربلا جا کر اس قدر ریاضت کی کہ پرہیزگاری اور دینداری میں مشہور ہو گیا۔ ۱۸۴۴ء میں موصوف اپنے امام غائب کے درمیان باب یعنی پیغام رسانی کا ذریعہ ہونے کا دعویٰ کیا اور اعلان کیا کہ "جو کوئی اپنے خداوند خدا تک پہنچنا چاہتا ہے اور اس راہ کو جو اس تک لے جاتی ہے معلوم کرنا چاہتا ہے۔ اسے چاہئے کہ میرا وسیلہ اختیار کرے۔"

بوشہر میں اس نے سکونت اختیار کر لی اور بہت جلد بہت سے لوگ اس کے شاگرد ہو گئے کہ جن میں چند ذی اثر لوگ بھی شامل تھے۔ اس

کے سرگرم شاگردوں نے ایران بھر میں اس کی تعلیم کی منادی کرنی شروع کر دی جس سے اس قدر لوگ اس کے پیرو ہو گئے کہ اب مُلّا اس کی مخالفت کرنے لگے۔

باب کی تعلیمات چند کتابوں کے مجموعہ میں کہ جس کا نام بیان رکھا گیا ہے پائی جاتی ہیں۔ یہ قرآن کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ اس مجموعہ میں مذہب کے پُر اسرار اور باطنی معنی اس نے غیر واضح طور پر بیان کئے ہیں۔ عام طور پر اس کی تعلیم میں اس قدر آزادانہ خیال پایا جاتا ہے کہ جس کی مثال قرآن میں اس سے پیشتر ملنی مشکل ہے۔ اس کی تعلیم کا خاص موضوع یہ تھا کہ خدا تک کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ انسان صرف کسی مقرر کئے ہوئے درمیانی کے ذریعہ خدا تک باریابی حاصل کر سکتا ہے اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے مرضی اول جو خدا سے علیحدہ تھی انبیاء میں مجسم ہوئی "باب" میں بھی مرضی اول متکلم ہے اور کہ پھر اس میں ہو کر کلام کرے گی کہ جسے "خدا ظاہر کرے گا۔"

اسلام کی طرف جیسا کچھ اس کا خیال تھا اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے بڑے زور کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ کوئی کتاب آخری نہیں ہے اور کہ جس جس طرح انسان ترقی کرتا جائیگا اور اعلیٰ تعلیم کی ضرورت اسے پڑتی رہے گی۔ اسی طرح نئے نئے پیغمبر بھی خدا بھیجتا رہے گا۔ قدیم پیغمبروں کی تعلیمات میں کوئی حقیقی اختلاف نہیں ہے بلکہ ہر نیا ظہور اپنے سے پیشتر کی تعلیم کو اور بھی مکمل کرتا ہے۔ اس قسم کی تعلیم سے چاروں طرف مخالفت پھیلنے لگی اور ۱۸۴۸ء میں نئے شاہ کی تاجپوشی کے موقعہ پر کہ جس کے وزیر کو بابیوں سے نفرت تھی۔ اس مخالفت نے ایذا رسانی کی صورت اختیار کر لی "باب" قید کر دیا گیا اور عرصہ تک قید خانہ میں مقید رہنے کے بعد ۱۸۵۰ء

کو جولائی کے مہینہ میں اس پر موت کا فتویٰ لگا کر وہ قتل کر ڈالا گیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ نیک سیرت شخص تھا اور مذہبی اور جماعتی اصلاحات کے کاموں میں بڑا سرگرم رہتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ ایذا رسانی نے اس کی تعلیم کو اور بھی تقویت بخشی۔

بدقسمتی سے دو سال بعد چند بابیوں نے خود اپنی مرضی سے شاہ کو قتل کرنے کی سازش کی اس سے ساری جماعت پر نہایت بے دردی کے ساتھ پھر ایذا رسانی ٹوٹ پڑی اور اس سنگ دلی کے ساتھ یہ قتل کئے گئے کہ جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ ان ایذا رسانیوں کے موقعوں پر اپنے ایمان کی خاطر ان مظلوموں سے عجیب بہادری اور وفاداری کے کام ظاہر ہوتے ہیں اور یوں بابی تحریک کے ایک حصہ کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

۱۸۴۹ء میں باب نے اپنا جانشین مرزا یحییٰ کو مقرر کیا کہ جسے اُسنے صبح ازل کا خطاب عطا کیا۔ چند برسوں تک یہ شخص بابی تحریک کا سردار مانا گیا۔ شاہ کے قتل کے منصوبہ کے باعث جو ایذا رسانی شروع ہوئی تھی اس سے بھاگ کر وہ بغداد گیا۔ جہاں ایک سال بعد اس کا سوتیلا بھائی مرزا حسین علی بہاء اللہ جو عمر میں اس سے زیادہ تھا اور قید سے ابھی چھوٹا تھا اس کے پاس پہنچا لیکن دس سال بعد ایران کی حکومت نے ان دونو کو قسطنطنیہ جلاوطن کر دیا اور حکومت ترکی نے اُن کو وہاں سے اڈریانوپل بھیج دیا۔ اب تک بہاء اللہ نے باب کی تعلیمات کی نظر ثانی کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا تھا اور کچھ عرصہ تک اپنے چھوٹے بھائی کے ماتحت رہا جو اس سے کم ضدی تھا لیکن اس کا اپنا اثر برابر اس سرعت کے ساتھ بڑھتا گیا کہ ۱۸۶۶ء میں اس نے اپنے آپ کو وہی شخص ہونا بتایا کہ جس کی خبر باب نے اس پُر اسرار

فقرہ میں دی تھی کہ "جسے خدا ظاہر کریگا۔" مرزا یحییٰ اور اس کے پیروں نے اس کے دعوے کا انکار کیا اور آپس میں سخت جھگڑا ہو پڑا کہ جس سے مار پیٹ کی نوبت پہنچی۔ ترکی حکومت آخر کار بیچ میں پڑی اور ان دونوں کو شہر بدر کر گئے بہاء اللہ کو مع اس کے پیروؤں کے عکہ میں بھیج دیا جو شمالی فلسطین میں مقام حیفہ کے قریب ترکی حکومت کے قیدیوں کی بستی ہے اور یحییٰ کو جزیرہ قبرص میں نظر بند کر دیا۔ جہاں ۱۹۱۲ء میں وہ مر گیا۔

باب در حقیقت شیعوں کے مسئلہ امامت کی اصلاح کرنا چاہتا ہے مرزا یحییٰ بابی تعلیم کو قائم و محفوظ رکھنے کے علاوہ اور کچھ کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن بہاء اللہ نے ایک آزادانہ روش اختیار کی اور آپ کو ایک نئے نظام عالم کے قاصد کی حیثیت میں پیش کیا۔ اُس نے اعلان کیا کہ میں ذات الوہیت کا ایک ظہور اور خدا کی آخری کتاب کا رسول ہوں اور ان حیثیتوں میں اس کا ظہور صرف شیعوں یا کل اسلام کے لئے نہیں بلکہ سارے بنی نوع انسان کے لئے تھا اس طرح اصل بابی مذہب کو اس نے سب سے آخری مذہب بہائی کے پیشرو کی حیثیت میں بنا کر اس کا تابع کر دیا۔ اس نے بھی اپنی تعلیمات ایک کتاب میں درج کیں کہ جسے قران کے طرز پر تیار کیا۔ اس کے علاوہ اس نے حکومتوں کے نام مراسلے روانہ کئے کہ جس میں اس کی تعلیم کا ماحصل درج تھا۔

بہاء اللہ کا اسلام سے بالکل جدا اپنا ایک مسلک قائم کرنا اس کی اصلاحات سے ثابت ہوتا ہے مثلاً صرف تین مرتبہ نماز پڑھنا اور مکہ کی طرف منہ کر کے نماز نہ پڑھنا۔ رمضان کے روزے کی تنسیخ مستورات پر سے پردہ کی قید ہٹا دینا۔ بردہ فروشی کی مخالفت۔ دیگر مذاہب کے لوگوں کے ساتھ میل جول رکھنے کا حکم۔ موسیقی کا جائز قرار دینا۔ جہاد کی تنسیخ۔

یہ ماننا پڑتا ہے کہ جو حالت عورتوں کی اسلام میں ہے۔ بہائی مذہب اسے کہیں بہتر بناتا ہے اور اسلام کی جماعتی اور خاندانی برائیوں پر قید عائد کر کے اُن کو رد کرتا ہے۔ آزاد خیالی کی بہ ترغیب دیتا ہے اور سب کے ساتھ مہربانی اور شفقت سے پیش آنے پر زور دیتا ہے۔ اس مذہب نے ایران اور دیگر مقامات کے مسلمانوں کے دلوں سے اس خیال کے نکال ڈالنے میں جو خاطر جمعی کے ساتھ ان کے دل نشین ہو گیا ہے کہ ملکی اور روحانی معاملات میں اسلام کا فیصلہ قطعی ہے۔ بہت کچھ کیا ہے۔

۱۸۹۲ء بہاء اللہ کی موت پر اس کا بڑا بیٹا عباس آفندی کے جسے بہائی عبد البہاء یعنی خادم جلال کہتے ہیں جماعت کا سردار مقرر ہوا ۱۸۹۲ء میں اپنے باپ کی طرح اس کا بھی اپنے سوتیلے بھائی مرزا محمد علی سے جھگڑا ہوا۔ مرزا محمد علی نے دعویٰ کیا کہ بہاء اللہ نے عباس کو نہیں بلکہ مجھے اپنا جانشین اور جماعت کا سردار مقرر کیا تھا۔ عباس جو حیفہ میں فی الحقیقت قید تھا اپنے باپ کی طرح اس نئے مذہب کی عالمگیر اور صلاح کن اور خلق دوست خصوصیات پر زور دیتا رہا بہائی مذہب صریحاً ایک ایسا طریقہ دینی ہے جو دیگر مذاہب کی باتوں کو منتخب کر کے بنا ہے اور یہ مذہب سب سے اعلیٰ انتہائے کمال کو حاصل کرنے کا دعویدار بھی ہے اور مسیحیت۔ یہودیت۔ بدھ مت۔ اسلام۔ فریمسن اور تھیوصفی کے سب سے اعلیٰ خیالات کا خلاصہ ہونے کا یہ دعویٰ کرتا ہے۔ عباس ہی کی زندگی میں مرکز عکہ۔ حیفہ اس کے زیادہ عقیدت مند پیروؤں کی زیارت گاہ بن گئی تھی اور اس وقت سے لے کر اب تک بہائیوں کے نزدیک اس مقام کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو مکہ اور مدینہ کو مسلمانوں میں ہے۔

بہائیوں کی صحیح تعداد کا پتہ نہیں لگتا بے شک چند سو کے قریب یہ ملک

شام میں پائے جاتے ہیں لیکن ایران میں اس تحریک کے ماننے والوں کی تعداد کے بتانے میں سیاحوں اور دیگر لوگوں نے بہت ہی مبالغہ کیا ہے۔

۱۸۹۲ء میں ایک سیرین مسیحی ڈاکٹر ابراہیم جارج خیر اللہ نے اس تحریک کو امریکہ میں پھیلانے کی کوشش کی۔ اس شخص نے بہائی مذہب قبول کر لیا تھا اور بہاء اللہ کے دعاوی کا حامی تھا اور جب ۱۸۹۸ء میں یعنی بہاء اللہ کے دونو بیٹوں کے جھگڑا کے بعد یہ عکہ گیا تو عباس کو چھوڑ کر اس نے محمد علی کی اطاعت منظور کر لی۔ لیکن جب امریکہ واپس آیا تو وہاں کے بہائیوں کے زیادہ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے سے قاصر رہا۔ آخر کار عباس افندی نے اپنے داعیوں یعنی مشنریوں کو امریکہ بھیجا کہ وہ وہاں اس کے دعاوی کی حمایت کریں اور ۱۹۱۲ء میں وہ خود وہاں گیا اور تب وہاں دونو مخالف فریقین نے ایک دوسرے کی ملامت کر کے خوب اپنا تماشہ بنایا۔ بہرحال امریکہ میں عباس کے پیروؤں نے اس کا ساتھ دے کر اس کے کام کو پھیلانے میں بڑی مدد دی۔

۱۹۲۱ء کو نومبر کے مہینہ میں عباس کا انتقال حیفہ میں ہوا۔ اب جو مرتبہ اس نے حاصل کیا تھا اس سے ظاہر ہے کہ سرکار برطانیہ نے اسے سر کا خطاب دیا اور اس کے جنازہ میں فلسطین کا ہائی کمشنر بھی شامل تھا۔ وہ صرف بیٹیاں چھوڑ کر مرا اور اس لئے اس کا نواسہ شوقی ربانی اس کا جانشین مقرر ہوا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جماعت نے پوری طرح اس کی پشتی نہیں کی ہے۔

بہائیوں کی تبلیغی کارروائیاں وسیع پیمانہ پر بہتیرے ممالک میں جاری ہیں اور اب وہ دعوے کرتے ہیں کہ امریکہ۔ جرمنی اور روس میں ان کے ہزار ہا ماننے والے موجود ہیں اور کہ ہندوستان میں انہوں نے بہتیرے مقامات میں

تبلیغی مرکز کھول رکھے ہیں کہ جہاں مسلمان تک اس نئے مذہب میں داخل ہو رہے ہیں۔ امریکہ میں اس تحریک پر ایک غور کرنے والا شخص لکھتا ہے کہ اس پر اس تحریک کا اثر کس قسم کا ہوا کہ "چند نہایت ہی اچھے لوگوں کے دلوں میں کچھ امیدیں ایسے لوگوں نے پیدا کیں کہ جن کے پاس ان اچھے لوگوں کے لئے کوئی پیغام نہیں تھا۔" بے شک مردہ عبدالبہا کے حق میں جو دعاوی آج کل کے کتب و رسائل میں پیش کئے جاتے ہیں انہیں فضول کہنا تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ مثلاً عبدالبہا خدا کا مقبول وسیلہ ہے"۔ .... وہ "عہد کا مرکز ہے"۔ .... تمام لوگ جنہیں اس کے ساتھ روحانی لگاؤ ہے ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ آج کل کی دنیا میں وہ درحقیقت الٰہی ہدایت کا مرکزی نقطہ ہے .... جس طرح زندگی کا خون دل سے ہو کر جسم کے تمام اعضا میں گردش کرتا ہے .... اسی طرح خدا کی محبت کی روح عبدال .... سے ہو کر گروہ کے ہر شریک میں سرایت کرتی ہے۔" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس فرقہ میں امام باطن کے مسئلہ کو پھر فروغ دیا جا رہا ہے

پانچویں فصل

تصوّف

تصوف اسلام۔ اس کی مذہبی زندگی کے طریقہ کا نام ہے کہ جس میں بجائے ظاہری رسوم کے انسان کی باطنی کیفیات پر زور دیا جاتا ہے تصوف

کا آغاز کیوں ہوا اس کا سبب خاص دو باتوں میں پایا جاتا ہے۔ ایک تو خدا کے خالص تنزیہ کی تعلیم سے اطمینان کا میسر نہ ہونا اور دوسرے فرقہ معتزلہ کا عقل کی مدد سے الٰہیات کا فلسفیانہ دشواریوں کو حل کرنے میں ناکامیاب رہنا۔ یہی دو خاص اسباب تصوّف کے آغاز کے ہیں۔

قرآن اور سنت کے ذریعہ خدا کی حقیقت تک رسائی کرنے میں جب لوگوں کی خاطر جمعی نہیں ہوئی اور خالص عقل خدا کی حقیقت کے حصول کے لئے کافی نہ سمجھی گئی تو اسے حاصل کرنے کے لئے صوفیوں نے ایک اور تیسرا اصول مقرر کیا جسے کشف کہتے ہیں۔ کشف سے مُراد روح انسانی کا بلا واسطہ خدا کی حقیقت کو حاصل کرنا ہے کہ جو نہ الہامی صحیفوں کے وسیلے اور عقلی دلائل کے ذریعہ استنباط سے حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ اس کشف کی بنیاد تجربہ پر ہے۔

اگرچہ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ تصوف شریعت کے خلاف نہیں ہے تاہم بعض اعتبارات میں ان کا فرق ظاہر ہے۔ شریعت مذہب کی خارجی اور ظاہری باتوں سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن تصوّف نفس انسانی کی باطنی کیفیات کی نگہداشت کرتی اور اسے باقاعدہ چلاتی ہے ان کے مختلف عمل کے ظاہر کرنے کی غرض سے کسی صوفی نے کہا ہے کہ مذہب کے علم کی تین قسمیں ہیں۔ پہلا وہ علم ہے جو خُدا سے حاصل ہوتا ہے دوسرا وُہ علم ہے جو خُدا کیساتھ بندہ حاصل کرتا ہے۔ تیسرا خُدا کا علم ہے۔ وہ علم جو خُدا سے حاصل ہوتا ہے۔ وُہ علم الشریعت ہے کہ جسے خدا نے الہام کے ذریعہ اپنے بندوں پر نازل کیا اور جو علم خدا کیساتھ بندہ حاصل کرتا ہے وہ علم الطریقت ہے اور جو خدا کا علم ہے اسے علم المعرفت کہتے ہیں۔ جو صرف انبیا اور اولیا کو حاصل ہے۔ یہ آخری قسم کا علم محض مذہب کی خارجی باتوں سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ الٰہی فضل اور تجلّی کا نتیجہ ہے

تصوّف کی ابتدائی تاریخ

علم تصوف اپنی ترقی اور ظہور میں تین صریح تواریخی منازل سے گزر کر اپنی موجودہ حالت تک پہنچا ہے۔

سب سے پہلے اپنی ابتدائی منازل میں یہ ایک زاہدانہ تحریک تھی اس تحریک کے آغاز کا سبب خلفائے بنو امیہ اور ان کے عہد کے اراکین سلطنت کی شریعت سے لاپرواہ زندگی تھی۔ یہ خلفاء پہلے چار خلفاء راشدین سے اس قدر اپنی زندگی میں مختلف تھے کہ پرہیز گار اور دین دار مسلمان بیزار ہو کر زاہد یہ تبلیغی کے ذریعہ اطمینان قلب حاصل کرنے کے لئے تارک الدنیا ہو گئے۔ یہ درویش اسلام کے سب سے قدیم عربی ہیں۔ ان کے خیال میں فقیری اختیار کرنا ثواب کا کام تھا اور درویشی فردوس حاصل کرنے کا نہایت ہی یقینی وسیلہ تھا اور یوں ابتداء میں لوگ دنیا کی نعمتوں کو اس نیت سے ترک کرتے تھے کہ آخرت میں اجر ملیگا۔ لیکن بعد کو فقیری صرف خدا کی ہی محبت میں اختیار کی جانے لگی اور ذات الٰہی کے ساتھ اس قسم کی محبّت کہ جو ہر طرح کی غرض سے خالی ہو تصوّف کا خاصہ بن گیا۔

تصوف کی اس ابتدائی منزل کے صرف دو صوفیوں کا مختصر ذکر ذیل میں ہم پیش کرتے ہیں یعنی ابراہیم بن ادہم اور رابعہ بصری۔ یہ دونوں ہجری کے دوسری صدی میں تھے۔

(۱) ابراہیم بلخ کا بادشاہ تھا اور اس کی دولت کی کثرت اس سے ظاہر ہے کہ جب وہ باہر نکلتا تھا تو چالیس سنہری تلواریں آگے اور چالیس سنہری ڈھالیں پیچھے رہتی تھیں۔ لیکن طبیعت چونکہ دینداری کی طرف زیادہ مائل تھی

اس لئے تخت شاہی اور دنیا کی عیش ترک کر کے پوری فقیری اختیار کر لی۔ بہتیرے قصے ابراہیم کے متعلق بیان کئے جاتے ہیں کہ جن سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ ابراہیمؔ کس طرح فقر کو دوست رکھتا تھا۔ منقول ہے کہ ایک روز ابراہیمؔ کو کھانے کو کچھ نہ ملا۔ اس نے رات کے وقت شکریہ میں چار سَو رکعت نماز ادا کی۔ دوسرے دن کچھ نہ ملا۔ پھر چار سَو رکعت نماز شکریہ میں ادا کی۔ حتیٰ کہ ہفتہ بھر یہی کیفیت رہی۔ جب کمزوری کے آثار نمودار ہوئے تو کہا۔ "اے پروردگار اب اگر کچھ دے تو مناسب ہے۔" اسی وقت ایک نوجوان نے آکر پوچھا کہ کیا کھانا چاہیئے اور اسے گھر لے گیا۔ میزبان ابراہیم کا غلام رہ چکا تھا۔ جب اس نے ابراہیم کو غور سے دیکھا تو چلا اٹھا کہ "حضور ہیں تو آپ کا غلام ہوں جو کچھ میرے پاس ہے سب آپ کا ہے۔" ابراہیم نے عاجزانہ طور پر جواب دیا۔ "میں نے تجھے آزاد کیا اور جو کچھ تیرے پاس ہے تجھے بخشا۔ مجھے اجازت دے کہ میں چلا جاؤں" اور گھر سے جلدی جلدی نکل کر دعا مانگی کہ "اے پروردگار میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب سے تیرے سوا کسی سے کچھ نہ مانگونگا۔ کیونکہ میں نے روٹی مانگی تو نے دنیا میرے سامنے پیش کر دی۔"

ابراہیم نے مکہ کا حج کئی مرتبہ کیا اور ایک مرتبہ کئی سالوں تک وہاں قیام کیا لیکن چاہ زمزم سے پانی نہ نکالا کیونکہ کنوئیں پر کا ڈول بادشاہی تھا۔ اور دولت مندوں کی چیزوں کا استعمال اپنے حق میں ناجائز خیال کرتا تھا۔

ایک مرتبہ ابراہیم نے ایک درویش کو اپنی غریبی کی حالت پر روتے دیکھ کر کہا کہ میرا خیال ہے کہ تو نے درویشی کو مفت خریدا ہے۔ اس نے پوچھا کیا درویشی بکا کرتی ہے۔ ابراہیم نے جواب دیا۔ ہاں! میں نے بلخ کا ملک دے کر خریدی ہے اور پھر بھی سستی ملی ہے۔

(۲) رابعہ - رابعہ بصرہ کی ایک عورت تھی کہ جس کا انتقال یروشلم میں ۸۰۱ء میں ہوا۔ اس کی پیدائش ایک بڑے غریب گھرانے میں ہوئی تھی اور صغر سنی میں یتیم ہو گئی تھی۔ اپنی بہنوں میں چوتھی تھی چنانچہ اس کا نام رابعہ سے ظاہر ہے۔ بصرے میں جب قحط پڑا تو اس کی بہنیں منتشر ہو گئیں اور کسی نے باندی بنا کر چھ درموں کے عوض رابعہ کو فروخت کر دیا۔ بطور باندی وہ دن بھر روزہ رکھ کر اپنے آقا کی خدمت کرتی جو اس سے سخت محنت کے کام لیتا تھا اور رات کو بڑے عرصہ تک دعا اور عبادت میں مشغول رہتی۔ اس کے آقا نے اس کی زاہدانہ زندگی سے متاثر ہو کہ اسے آزاد کر دیا اور اس وقت سے پورے طور پر خدا کی محبت میں رابعہ درویشی کی زندگی بسر کرنے لگی۔

دعا میں بے تکلفی کے ساتھ آزادانہ طور پر خدا سے رفاقت رکھنے اور کلام کرنے کا تصور رابعہ ہی سے تصوّف میں داخل ہوا ہے اور یوں مقررہ عبادتوں کے علاوہ کہ جو ثواب کے کام مانے جاتے ہیں آزادگی کے ساتھ دعا مانگنا بھی خدا کی حضوری کے حاصل کرنے کا ذریعہ بن گیا۔

رابعہ درویشی کے عہد کو پورا کرنے میں کبھی نہیں جھجکی۔ بار بار اس کے دوستوں نے چاہا کہ اس کی مالی مدد کریں لیکن وہ ہمیشہ انکار کرتی رہی کیونکہ اپنی ساری ضرورتوں کے لئے اسے خدا ہی پر بھروسہ تھا اور جو اس کی کچھ مدد کرنا چاہتے انہیں وہ جواب میں یہ کہتی کہ مجھے شرم آتی ہے کہ میں دنیاوی چیز اس سے مانگوں جو دنیا کا خود مالک ہے۔ اور پھر بھلا ان سے کیوں کر مانگوں کہ جن کے پاس دنیا مستعار ہے۔

رابعہ کی دعائیں ہمارے اس بیان مذکور کو مثال میں پیش کی جا سکتی ہیں کہ جہاں ہم نے ذکر کیا ہے کہ صوفی آخرت کے اجر کی امید پر دنیا ترک کر کے

درویشی اختیار نہیں کرتا۔ بلکہ خالص خدا کی محبت میں ہم ذیل میں رابعہ کی صرف دو ایسی دعائیں نقل کرتے ہیں۔

"اے پروردگار! جو کچھ دنیا میں دینے کے لئے میری قسمت میں تو نے لکھ رکھا ہے وہ تو اپنے دشمنوں کو دے اور جو کچھ اجر آخرت میں میرے لئے ہے وہ اپنے دوستوں کو عطا فرما۔ کیونکہ میرے لئے تو ہی کافی ہے۔"

"اے پروردگار! اگر میں دوزخ سے ڈر کر تیری پرستش کرتی ہوں تو مجھے دوزخ میں ڈال اور اگر بہشت کی امید پر تیری عبادت کرتی ہوں تو بہشت مجھ پر حرام کر دے اور اگر میں صرف تیری خاطر تیری پرستش کرتی ہوں تو اپنے جمال کو مجھ سے نہ چھپا۔"

تصوّف کے دور کی دوسری منزل۔ فلسفیانہ عناصر کا آغاز

تصوف کی دوسری منزل کا زمانہ ۷۸۶ء سے ۸۶۱ء تک کا ہے کہ جو تاریخی اعتبار سے ہارون رشید کے خلیفہ ہونے کے وقت سے لے کر خلیفہ متوکل کی وفات تک کا زمانہ ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ جب اسلامی خیالات پر فلسفہ یونان کا بڑا اثر پڑ رہا تھا۔ افلاطون اور ارسطو کی تصنیفات کا جو ترجمہ عربی زبان میں کیا گیا تھا لوگ بڑے شوق سے مطالعہ کر رہے تھے کہ جس کے باعث دنیائے اسلام میں اس وقت عقل پرستوں کی ایک بڑی تحریک پھیل رہی تھی کہ جس کے اثر سے تصوف نے فلسفیانہ رنگ اختیار کر لیا اور چند نئے عناصر جیسے معرفت۔ وجد اور ہمہ اوست تصوف کی خصوصیات میں داخل ہو گئے۔

تصوف کے اس دور کے صرف دو بڑے صوفیوں کا ذکر ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

(۱) ذوالنون مصری اس کا سالِ وفات ۸۶۱ء ہے یہ اس عہد کے ان مشہور صوفیوں میں سے ہے کہ جنہوں نے اپنے وسیع علم سے تصوف میں بہت کچھ اضافہ کیا اور تصوف میں جو اب تک ایک عملی اور زاہدانہ زندگی بسر کرنے کا نام تھا فلسفیانہ عناصر بھی داخل کر دیئے۔ ذوالنون مصری اپنے وسیع علم اور اپنی ریاضت اور رفاقت الٰہی کے سبب بڑا مشہور تھا۔ وہ مصر کے پرانے کھنڈرات میں وہاں کے کتبوں کو جو پرانے نقوش میں تحریر تھے پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ علم کیمیا میں بھی اس کی بڑی شہرت ہے۔ آخر کار خلیفہ متوکل نے اس پر بدعت کا الزام لگا کر اسے قید کر دیا۔ لیکن جب خلیفہ کو اس کے علم اور تقویٰ کا پتہ لگا تو اسے قید سے رہا کر کے خود اس کا مرید ہو گیا۔

تصوف میں ذوالنون ہی کے سبب سب سے پہلے یہ خیال داخل ہوا کہ معرفت یعنی خدا کے حقیقی علم کے حاصل کرنے کا ذریعہ وجد ہے۔ وہ کہا کرتا تھا۔ خدا کو وہ سب سے اچھی طرح جانتا ہے جو اس میں فنا ہے۔

(۲) اس عہد کا دوسرا مشہور شخص ابو یزید ہے جو بایزید بسطامی کے نام سے مشہور ہے۔ بسطام بحیرہ کاسپین کے جنوبی مشرقی کونے پر صوبہ قومس میں ایک شہر تھا۔ اس کا دادا آتش پرست تھا اور اس کا باپ شہر کے امراء میں مانا جاتا تھا بایزید سلطان العارفین کے لقب سے مشہور ہے اس نے صوفیوں میں سب سے پہلے فنا کی تعلیم دی۔ اس کا قول ہے کہ "مخلوق احوال کے تحت ہے لیکن عارف کو حال نہیں کیونکہ اس کے نشانات مٹ جاتے ہیں اور اس کی ذات دوسرے کی ذات میں فنا ہو جاتی ہے اور اس کے علامات دوسرے کے علامات میں

گم ہو جاتے ہیں۔" اور یوں وہ حالت وجد میں اکثر یہ کہتے سنا گیا۔ سبحانی ما اعظم شانی۔ میں پاک ہوں میری شان کیا ہی بڑی ہے اور انی انا اللہ لا الہ الا انا فاعبدون۔ میں ہی معبود ہوں میرے سوا اللہ کوئی معبود نہیں۔ اسلئے میری پرستش کرو (سورۃ الانبیاء آیت ۲۵)

یہ سچ ہے کہ اگرچہ اس قسم کے جملے جو اس کی زبان سے حالت وجد میں نکلا کرتے تھے ان میں سے بعض قرآن کی آیتیں ہوا کرتی تھیں اور ممکن ہے کہ ان کے لئے یہ کہا جائے کہ ان کے کہتے وقت وہ قرآن کا استعمال کرتا تھا۔ تاہم بعض ایسے جملے بھی اس کی طرف منسوب ہیں کہ جن میں الوہیت کا دعویٰ پایا جاتا ہے اور جو قرآن کی آیتیں نہیں ہیں اور پھر ذات انسانی کے مسئلہ فنا پر جو اس کی تعلیم ہے ان سب سے ظاہر ہوتا ہے کہ درحقیقت وہ مسئلہ ہمہ اوست کا معتقد تھا مثلاً ذیل کی اس دعا سے بھی یہی ظاہر ہے۔

"اے خدا کب تک میرے اور تیرے درمیان "میں" اور "تو" کا فاصلہ رہیگا۔ اسے دور کر تاکہ "میں" "تو" ہو جاوں۔ اور "میں" پھر کچھ نہ رہوں اے میرے خدا جب تک میں تیرے ساتھ ہوں میں سب سے زیادہ ہوں اور میں جب اپنے آپ میں ہوتا ہوں تو سب سے کمتر ہوں۔"

اسلام میں تصوّف نے کیسے جگہ حاصل کی

تصوف کو اپنے ابتدائی دور میں راسخ الاعتقاد تعلیم کے مطابق ہونے کے باعث اسلام میں جگہ حاصل تھی۔ لیکن جب اس کی تعلیم میں فلسفہ وحدت الوجود جیسے غیر اسلامی عناصر داخل ہو گئے تو پھر تصوّف نے بڑی کوششوں کے بعد امام غزالی کے ذریعہ اسلام میں پھر جگہ حاصل کی۔ اس طرح مشہور امام الغز

(۱۰۵۸ - ۱۱۱۱ء) کے وقت تصوف کے تیسرے دور کا شروع ہوتا ہے کہ جن کے وسیلے تصوف نے کچھ ترمیم کے بعد اسلام میں قبولیت حاصل کی ہے

امام غزالی کا پورا نام ابو حامد محمد ہے۔ اس کا وطن ملک ایران کے صوبۂ خراسان میں مشہد کے قریب مقام طوس میں تھا۔ امام غزالی کو علم الکلام یعنے اسلامی الٰہیات کی تواریخ میں وہ جگہ حاصل ہے جو اور کسی نے اب تک نہیں پائی ہے۔ حالت صغر سنی میں یتیم ہو جانے کے باوجود بھی علم حاصل کرنے کیلئے بڑی مشقت سے دور دراز شہروں کا سفر کیا کہ جو اپنی درسگاہوں کے لئے مشہور تھیں اور جلد ہی اپنی قابلیت و لیاقت کیلئے مشہور ہو گیا اور بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں جو اس وقت کی ایک بڑی مشہور درسگاہ تھی مدرس مقرر ہوا کہ جہاں تارک الدنیا ہو کر صوفی بننے سے بیشتر عرصہ چار سال تک درس دیتا رہا۔

اپنی خود نوشت سوانح عمری میں اس نے لکھا ہے کہ اسے بچپن ہی سے علم حاصل کرنے کا بے حد اشتیاق تھا کہ جس غلبۂ شوق نے اُسے ہر مذہب اور فلسفہ کے مطالعہ کرنے اور ہر شخص سے اس کے اپنے عقیدہ کے مطالب و معانی کے دریافت کرنے پر مجبور کیا اور جب حق و باطل میں اس نے امتیاز کرنا چاہا تو اُسے جانچ کی کوئی یقینی کسوٹی نہیں ملی۔ جو کچھ علم حواس خمسہ کے ذریعہ اسے حاصل ہوتا تھا ان کا اسے پورا یقین نہیں تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اگر حواس خمسہ دھوکا دیتے ہیں تو کیا یہ ممکن نہیں کہ ذہن بھی دھوکے میں ہو؟ شاید ہماری زندگی ایسے خالی تصورات سے مرکب ہے کہ جنہیں ہم غلطی سے حقیقی سمجھ رہے ہیں۔

دو مہینہ تک وہ نہایت ہی شک کی حالت میں پڑا رہا اور تب وہ کہتا ہے کہ خدا نے اسے روشنی عطا کی اور پھر اپنے ذہنی توازن کو اس نے حاصل کیا اور صفائی کے ساتھ غور کرنے کے لائق ہوا۔ اور اب وہ اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ

کہ اس کی قوتِ تفکر ہی سچائی تک اس کی ہدایت کر سکتی ہے اور یوں مذہبی عقائد کی بنیادی باتوں کی جانچ کے لئے وہ چار قسم کے لوگوں کی طرف متوجہ ہوا جو سچائی کے مدعی تھے۔ متکلمین یعنی علماء الٰہیات۔ علماء فرقۂ باطنیہ۔ حکماء یعنی فلاسفر اور اہلِ تصوف۔

ان کے مطالعہ کے بعد اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ علم الکلام یعنی راسخ الاعتقاد اسلام کی الٰہیات۔ بدعتی تعلیمات کے رد کرنے کو مفید تو ہے لیکن یہ اس کے اپنے مرض مذہبی تشکیک کا علاج نہیں ہے۔ فرقۂ باطنیہ کے معلمین اگرچہ سچائی کا دعوٰے کرتے تھے مگر اسے تسلی نہیں دے سکے۔ باقی رہا حکما تو اُن کے تمام طبقے یعنی دہریئے (مادہ پرست) طبعئین (فطرت پرست) اور الٰہئین (خدا پرست) کافر اور ملحد سمجھے جاتے ہیں۔ بہر صورت اس کی مذہبی طبیعت نے ناقص عقل کی ہیکل میں پرستش کرنا گوارا نہیں کیا۔ یوں اب تصوف ہی اس کی آخری امید تھی۔ تصوّف کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ یہی ایک درست راہ اختیار کرنے کو اس کے لئے رہ گئی ہے۔ دورانِ مطالعہ میں اس نے معلوم کیا کہ تصوف کے اعلیٰ منازل پر عبور حاصل کرنے کا ذریعہ محض مطالعہ نہیں بلکہ حقیقی تجربہ ہے اور پھر بڑی سخت کشمکش کے بعد تمام دنیاوی حوصلوں کو ترک کر کے ۱۰۹۵ء میں بغداد سے نکل پڑا اور ملک شام میں کئی سال فقیرانہ زندگی بسر کرتے ہوئے پھرنے کے بعد جس تسلی کا اسے اشتیاق تھا حاصل ہو گئی۔ ۱۱۱۱ء میں اس نے وفات پائی۔

امام غزالی اسلام کے لئے ایک باثر ہستی ثابت ہُوا۔ اور اُسی کے اثر سے اسلام میں تصوف نے ایک مستحکم جگہ حاصل کی اور اسی نے فلسفہ اور فلسفی مسائل کو کہ جسے اس کے وقت تک راسخ الاعتقاد علماء بدعت سمجھتے تھے اسلامی

الٰہیات میں ایک باعزت جگہ دلوائی اور یوں اس کے زمانہ سے تین اصول اسلام کے طریقۂ دین میں باہم ملے جلے پائے جاتے ہیں یعنی نقل۔ عقل اور کشف۔ نقل سے مراد قرآن اور سنت ہے۔ عقل سے اسلامی الٰہیات میں فلسفیانہ اور منطقیانہ دلائل وقیاسات سمجھے جاتے ہیں اور کشف، وہ علم ہے کہ جو براہِ راست صوفیوں کے دل پر جس کا القا ہوتا ہے۔

تصوّف کے امتیازات خصوصی

تصوف کی پوری تعلیم ان دو سوالات کے جوابات پر مبنی ہے۔ پہلے یہ کہ انسان کو خدا کی باطنی حضوری کا تجربہ کیسے حاصل ہو سکتا ہے اور دوسرے یہ کہ انسان اور کائنات کے ساتھ تعلق کے اعتبار سے خدا کیا ہے۔ پہلے سوال کا جواب تصوف کی تعلیم کی وہ شاخ ہے جو الطریقت کہلاتی ہے کہ جس کا بیان آگے کی فصل میں آئے گا۔ اور دوسرے سوال کا جواب علم المعرفت ہے کہ جہاں خدا کا ذکر قرآن کی تعلیم توحید کے مطابق نہیں بلکہ تعلیم وحدت الوجود یا ہمہ اوست سے ماخوذ ہے۔

اصوفیوں کی تعلیم کے مطابق انسان میں روحانی کیفیات کے حاصل کرنے کے لئے چند خاص مقام جنہیں لطائف کہتے ہیں مقرر ہیں۔ ان کے شمار میں صوفیوں کے مختلف سلسلوں کا اختلاف ہے۔ لیکن ذیل کے تین لطائف ہر سلسلہ کی فہرست میں شامل ہیں یعنی قلب۔ سِر۔ روح ان کے روشن ہونے سے سالک درجہ معرفت کو پہنچتا ہے۔ اگرچہ ان کے محل کا ہونا جسم انسانی میں بتایا جاتا ہے تاہم وہ مانتے ہیں کہ ان کا جسمانی وجود نہیں ہے۔ قلب کا محل سینہ میں الٹی طرف ہے اور روح کا محل سینہ کی سیدھی طرف اور سِر کا محل ان دونوں کے بیچ میں ہے۔ قلب کا کام خدا کو جاننا ہے۔ یہ ایک

حقیقت لطیفہ روحانی ہے کہ جس کا تعلق دل سے ہے۔ صوفی اسے انسان کی حقیقت کہتے ہیں اور اسے کل اشیاء کی ماہیت کے علم کی قابلیت حاصل ہے اور مغربی خیال کے برعکس یہ قوت متخیلہ کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ خدا نے فرمایا کہ "آسمان اور زمین میں میری گنجائش نہیں لیکن میں اپنے وفادار بندوں کے دلوں میں رہتا ہوں۔" اسی طرح سِرّ کا کام خدا پر دھیان کرنا اور روح کا کام اس سے محبت کرنا ہے۔

خدا کے وجود کے متعلق صوفیوں کے دو خاص گروہ ہیں۔ اوّل جن کا شمار زیادہ ہے۔ وہ وحدت الوجودی یعنی فلسفہ ہمہ اوست کے قائل ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وجود یعنی جس کے ساتھ موجودیت یا ہستی ہے ایک ہی چیز ہے اور وہ خدا ہے۔ ان کے نزدیک کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا صرف یہی مطلب نہیں ہے کہ کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے۔ بلکہ یہ کہ کوئی موجود نہیں سوائے اللہ کے۔ انہیں اتحادیہ یا وحدت الوجودیہ کہتے ہیں۔

صوفیوں کا دوسرا گروہ قرآن کی تعلیم توحید الٰہی کو قائم رکھنے کی غرض سے اس قسم کے تمام فقروں اور اصطلاحوں کا کہ جن سے وحدت الوجود کا عقیدہ نکلتا ہے مختلف مطلب نکالتا ہے اور ان کی تشریح اس طرح کرتا ہے کہ خدا کے وجود کی حقیقت کل کائنات کی ہستی کے مقابلہ میں اس قدر زیادہ ہے کہ کائنات کی ہستی اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ جنہیں الہامیہ یا وحدت الشہودیہ کہتے ہیں۔

عام طور پر تمام صوفیوں کے نزدیک خدا ہستی محض یا وجود مطلق کا نام ہے۔ یوں فلسفہ کے اعتبار سے قریب قریب تمام صوفی وحدت الوجودیہ ہیں لیکن یہ وحدت الوجودی مادہ پرستوں کی نہیں ہے کہ جن کے نزدیک مجموعہ کائنات کا نام خدا ہے۔ بلکہ یہ ایک روحانی وحدت الوجودی ہے کہ جس کے زاویۂ نگاہ

سے تمام کائنات میں ایک نادیدنی قادر مطلق اور ہمہ جا حاضر روحانی وجود کے لامحدود صفات ایک دھندلے عکس کی طرح دکھائی دیتے ہیں اور صرف جسے حقیقی معنی میں وجود حاصل ہے۔

صوفیوں کے نزدیک ہر چیز خدا کے ذکر میں مصروف ہے "ساتوں آسمان اور زمین اور جو فرشتے اور آدمی آسمان و زمین میں ہیں سب اس کی تسبیح میں لگے ہیں اور جتنی چیزیں ہیں سب اس کی حمد و ثنا کے ساتھ اس کی تسبیح اور تقدیس کر رہی ہیں۔" (سورہ بنی اسرائیل رکوع ۵) وہ ہر جگہ اور ہر چیز میں ہے "ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں۔" (سورہ ق رکوع ۲) ایک صوفی کا قول ہے کہ "جو کچھ خدا نہیں ہے مجھے دکھاؤ تو میں تمہیں دکھاؤں گا کہ خدا کیا ہے۔"

فلسفہ کے نقطۂ نگاہ سے خدا وجود مطلق ہے اور صوفیوں کے شغل و دھیان کے زاویۂ نگاہ سے خدا حسن مطلق ہے کہ تمام دنیاوی خوبصورتی خواہ یہ شکل و صورت کی خوبصورتی ہو یا خیال یا فعل کی ہو سب اسی کا ایک دھندلا عکس ہے۔ ہماری محدود عقل اس لامحدود پر عبور حاصل نہیں کر سکتی اور اس لئے ہم تشبیہ اور استعارات کے ذریعہ کہ جس کسی پہلو سے وہ لامحدود ہستی اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے ہم اس کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کی قدرت کے اعتبار سے کوئی اسے بادشاہ کہتا ہے کوئی اس کی محبت کا خیال کر کے اسے باپ کہہ کر پکارتا ہے۔ اس کے جمال کا مغلوب ہو کر صوفی سب سے بڑھ کر اسے حسن ازلی تصور کرتا ہے اور اس لئے صوفی اپنے گیتوں میں عاشق کے استعارے اور تشبیہ کا استعمال کرتا ہے۔ وہ صاحب جمال ہے اور تمام کائنات اس کے جمال کا پرتو ہے۔

صوفیوں کا بیان ہے کہ ستّر ہزار حجاب اس وجود مطلق یا حسن ازلی کو اس عالم احساسات سے جدا کرتے ہیں اور سالک جب راہ طریقت میں قدم مارتا ہے تو ان حجابات اور سات مقامات سے گزرتا ہوا ہر مقام میں دس ہزار حجابات طے کرتا ہے اور طریقت کی منزلوں میں جیسے جیسے آگے بڑھتا جاتا ہے اس تصوّر الٰہی میں تبدیلی آتی جاتی ہے یعنی وجود مطلق جو شروع میں اس کے لئے ایک خارجی حقیقت تھی اب رفتہ رفتہ خود اپنے میں اسے پاتا ہے یہاں تک کہ کائنات اور خود اس کی اپنی ذات ہستی مطلق اُس کے لئے ہو جاتی ہے اور یوں کلمہ لا الٰہ الا اللہ یعنی کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے ان تین مطالب پر پہلے منحصر ہوتا ہے۔ کوئی فاعل نہیں سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے اور کہ کوئی موجود نہیں سوائے اللہ کے لیکن جب سالک راہ طریقت میں آگے بڑھتا ہے تو کلمہ کا مطلب اس کے لئے یہ ہو جاتا ہے کہ کوئی معبود نہیں سوائے تیرے اور آخر کار طریقت کی آخری منزل میں کلمہ کا مطلب یہ رہ جاتا ہے کہ نہیں کوئی معبود سوائے میرے سالک کے لئے طریقت کی یہ آخری منزل ہے جس کا ذکر آگے کی فصل میں تفصیل کے ساتھ کیا جائے گا۔

چھٹی فصل

الطریقت اور پیران طریقت کے سلسلے

تصوف کی اصطلاح میں روحانی زندگی کی ترقی سفر سے تعبیر کی گئی

ہے اور خدا کا تلاشی یا تصوف کا عامل سالک یعنی مسافر کہلاتا ہے اُس کی تعلیم کا یہ مقصد ہے کہ سالک خدا کی معرفت حاصل کرے کہ جس کی ذات حق تمام عالم میں ساری وطاری ہے اور آخر کار روح جو تلاش حق میں ادھر ادھر پھرتی ہوئی ہے وہ رہنمائی پاکر "مقامات" کے ذریعہ آگے کو بڑھتی ہے اور چند خاص "احوال کا تجربہ اٹھاتی ہوئی راہ" طریقت" پر چل کر اس منزل مقصود پر پہنچتی ہے کہ جہاں فنا فی الحقیقت کے وسیلے خدا کے ساتھ وصل کا مرتبہ حاصل کر لیتی ہے۔

جو شخص صوفی بننے کا ارادہ رکھتا ہے اسے سب سے پہلے کسی شیخ کا وسیلہ اختیار کرنا پڑتا ہے کہ جس کی بیعت کر کے وہ اس کا مرید ہو جاتا ہے شیخ کے پاس اس عقیدہ کے مطابق مادی جسم کو لطیف بنانے کا قصد موجود ہوتا ہے اور اس کی زیر ہدایت وہ روحانی عشق کی آگ میں صاف کیا جاتا ہے کہ جس کی آنچ ذکر کے ایندھن سے برابر سلگائی جاتی ہے۔ یہ ذکر خاص طور پر خدا کو یاد کرنے کا نام ہے کہ جس کا بیان آگے چل کر آئے گا۔

سلوک کے ابتدائی منازل

صوفی طریقت کی جن ابتدائی منازل کو طے کرتا ہے ان کا مقصد تزکیۂ نفس یعنی دل کی صفائی ہے وہ ابتدائی منازل یہ ہیں۔ توبہ۔ پرہیزگاری۔ ترک۔ فقر اور توکل۔ سب سے پہلی منزل توبہ کی ہے۔ اس کا مطلب اپنے گناہ کی غفلت کی نیند سے نفس کا بیدار ہونا اور گذشتہ گناہوں پر تاسف کرنا ہے۔ حقیقی توبہ میں تین باتیں داخل ہیں۔ پہلے اپنی نافرمانیوں پر دلی افسوس کرنا۔ دوسرے آئندہ گناہ نہ کرنے کا پکا اقرار کرنا۔ تیسرے فوراً گناہ

ترک کر دینا۔

رابعہ کی تعلیم کے مطابق گناہ روح کے لئے نہایت ہی خطرناک چیز ہے کیونکہ یہ روح اور محبوب یعنی خدا کے درمیان جدائی ڈالتا ہے۔ اس کا یہ بھی قول ہے کہ جب انسان محض عذاب کے ڈر سے نہیں بلکہ گناہ کو معبود اور عابد کے درمیان رکاوٹ سمجھ کر افسوس کرتا ہے تو اس سے حقیقی توبہ پیدا ہوتی ہے۔ رابعہ کہتی ہے کہ توبہ کی توفیق محض الٰہی فضل سے حاصل ہوتی ہے کہ جو انسان کو خدا سے ملتی ہے اور یہ انسان کا اپنی طاقت سے خدا کی طرف پھرنا نہیں ہے بلکہ صرف خدا ہی کو گنہگار کے دل کو اس طرح چھونے کی طاقت ہے کہ وہ اپنی برائی سے پھرے اور توبہ کرے۔"

سچے تائب کی معافی یقینی ہے کیونکہ توبہ فضل کی علامت ہے ایک ہی روح میں گناہ اور فضل نہیں رہ سکتے۔ امام غزالی کا قول ہے کہ "تاریکی اور روشنی ایک جا جمع نہیں ہو سکتے اور نہ غلاظت اور دھوبی کی صفائی اکٹھے رہ سکتی ہیں۔"

ترک دنیا کہ جس میں فقر بھی شامل ہے طریقت کی ابتدائی نیکیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ صوفیوں کا انتہائے کمال محض دولت کی محتاجی ہی نہیں ہے بلکہ دولت کی خواہش کا بھی نہ ہونا ہے۔ فقیر اور درویش یہ دو ایسے نام ہیں کہ جن پر صوفی فخر کرتا ہے۔ کیونکہ اس کی اصطلاح میں ان کا مطلب ہر ایسی چیز کو ترک کرنا ہے جو خدا کی یاد سے غافل کرے۔ رابعہ کا قول ہے کہ فقیر خدا کی مخلوقات میں سب سے زیادہ دولت مند ہے کہ وہ بخشش کرنے والے کی خاطر اس کی بخششوں کو ترک کرتے ہیں۔"

اب توکل یعنی خدا پہ بھروسہ رکھنے کا ذکر کرنا رہ گیا۔ اس میں زندگی

کے دکھوں کے باوجود صبر کی عادت ڈالنا بھی شامل ہے صوفیوں کی اصطلاح میں توکل محض قوت برداشت کا نام نہیں ہے بلکہ خواہشات نفسانی سے لڑنا اور ان پر غلبہ پانے کی کوشش کرنے کا نام ہے۔ اس کے حاصل کرنے کے تین مراتب ہیں۔ اول اپنے دکھ و تکلیفات کی شکایت نہ کرنا یہ مرتبہ تائب کا ہے۔ دوئم۔ جو کچھ مقدر میں ہے اس پر قناعت کرنا یہ مرتبہ زاہد کا ہے۔ سوئم۔ جس طرح خدا پیش آئے اس کے سلوک کے ساتھ محبت رکھنا یہ اولیا کا مرتبہ ہے۔ ذیل کا واقعہ صبر اور توکل کی عمدہ مثال ہے۔ سفیان ثوری جو مسلمانوں میں ولی مانا جاتا ہے رابعہ کے پاس ایک مرتبہ ملاقات کی غرض سے آیا۔ رابعہ اس وقت بیمار اور سخت تکلیف میں تھی۔ سفیان رابعہ کی یہ حالت دیکھ کر بولا کہ اگر تم خدا سے دعا مانگو تو وہ تمہاری تکلیف دور کر دیگا۔ رابعہ نے جواب دیا۔ "اے سفیان کیا تمہیں یہ نہیں معلوم کہ یہ کس کی مرضی ہے کہ میں تکلیف اٹھاؤں۔ کیا یہ خدا کی مرضی نہیں ہے" ؟ سفیان نے جواب دیا "ہاں"۔ رابعہ بولی "جب تم یہ جانتے ہو تو مجھ سے اس کی مرضی کے خلاف اس سے مانگنے کو کیوں کہتے ہو۔ اپنے محبوب کی مرضی کی مخالفت کرنی روا نہیں"۔

صوفی کے "احوال"

منازل اور مقامات کا "احوال" سے امتیاز کرنا ضروری ہے۔ لفظ "احوال" حال کی جمع ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں حال ان احساسات یا قلبی کیفیات کا نام ہے۔ جو خود بخود بغیر سالک کے اپنے ارادے کے اس پر طاری ہوں۔ مثلاً تاسف۔ خوف۔ خوشی وغیرہ۔ یہ احوال

جو سالک پر طاری ہوتے ہیں۔ اِن کا بیان مختلف ترتیب سے اور مختلف شمار کے ساتھ آیا ہے۔ مگر عام طور پر ذیل کے دس قریب ہر فہرست میں پائے جاتے ہیں یعنے دھیان۔ قربت۔ عشق۔ خوف۔ اُمید۔ تمنا۔ رفاقت اِطمینان۔ فکر۔ یقین۔ یہ احوال سالک کے دل میں خُدا کی طرف سے پیدا کئے جاتے ہیں کہ جب وہ طاری ہوتے ہیں تو اُس کو نہ وہ دُور کرنے پر قادر ہے اور نہ اُن کو اپنے اندر قائم رکھ سکتا ہے۔

جب تک سالک کُل منازل" "مقامات" طے کرکے ان تمام احوال کا تجربہ حاصل نہیں کر لیتا۔ جو خُدا اُس پر طاری کرنا چاہتا ہے۔ طریقت کی راہ ختم نہیں ہوتی۔ ابتدائی منازل کے بعد راہِ طریقت کی وہ بلند چڑھائی شروع ہوتی ہے۔ جو صوفیوں کی اِصطلاح میں تجلّی۔ معرفت اور حقیقت کہلاتی تھی۔

طریقت کے سات خاص مقامات

طریقت کے ابتدائی مقامات کے علاوہ سات خاص مقامات بھی ہیں کہ جنہیں نفس کو وجُودِ مُطلق کے ساتھ مرتبۂ وصال تک پہنچنے کے لئے طے کرنے پڑتے ہیں۔ مختلف صوفیوں نے ان کا مختلف بیان کیا ہے۔ لیکن عام طور پر سات خاص مقامات یہ بیان کئے جاتے ہیں۔

(۱) عبُودیت۔ اِس مقام پر سالک شریعت پر عمل کرتا اور خُدا کی عبادت میں اپنا وقت صرف کرتا ہے۔

(۲) عشق۔ اِس مقام میں الٰہی تاثیر اس کے نفس کو خُدا کی محبّت

کی طرف مائل کرتی ہے۔

(۳) زہرہ۔ یہاں عشق الٰہی کے اثر سے دُنیا کی تمام خواہشات سالک دل سے دُور کرتا ہے

(۴) معرفت۔ یہاں سالک خُدا کے کام اور اُس کی ذات و صفات پر غور کرتا ہے۔

(۵) وجد۔ اس مقام میں سالک الحق یعنے خُدا کی اکیلی حقیقی ہستی پر دھیان کرتا ہے کہ جس سے اُس کے قوائے ذہنی میں ایک جوش پیدا ہوتا ہے۔

(۶) حقیقت۔ یہاں خدا کی ذات حقیقی کی تجلی سالک کے دل پر ہوتی ہے۔

(۷) وصل۔ اب سالک خدا کو گویا آمنے سامنے دیکھتا ہے۔ اس مقام پر سالک مرتبۂ فنا حاصل کر لیتا ہے کہ جب اس کی ہستی الحق میں مٹ جاتی ہے۔

ان سات خاص مقامات کا تعلق سات سیاروں سے ہے یعنی قمر۔ عطارد۔ زہرہ۔ شمس۔ مریخ۔ مشتری۔ زحل۔ یہ کرۂ ارض کے چاروں طرف ہیں۔ ان کے پار ثوابت ہیں کہ جس کے آگے عالم الحق ہے۔ علاوہ اس کے سات مقامات کا تعلق چار خاص منازل سے ہے جو یہ ہیں۔ شریعت طریقت۔ معرفت اور حقیقت۔ ہر منزل کا تعلق دو خاص مقامات مذکورہ سے ہے لیکن حقیقت کا تعلق صرف مقام وصل کے ساتھ ہے۔

اور پھر ان چار خاص منازل کا تعلق چار خاص احوال کے ساتھ ہے کہ سالک جن کے تجربہ سے گذرتا ہے وہ یہ ہیں:۔

(۱) ناسوت۔ یہ ہر انسان کی فطری حالت ہے۔ اس حالت میں سالک کو شریعت پر عمل کرنا فرض ہے۔

(۲) ملکوت ۔ یہ حالت ملکوتی ہے ۔ اس حالت میں سالک طریقت اختیار کرتا ہے ۔
(۳) جبروت ۔ یہ حالت صاحب قدرت ہونے کی ہے ۔ اس حالت میں سالک معرفت اختیار کرتا ہے ۔
(۴) لاہوت ۔ یہ حالت الوہیت کی ہے کہ جب سالک مرتبۂ فنا کو حاصل کر کے الحق کے ساتھ وصل حاصل کر لیتا ہے ۔ یہاں سالک حقیقت کو پالیتا ہے ۔

ذکر

سالک راہِ طریقت میں جب قدم مارتا ہے تو اسے چند شغل کرنے پڑتے ہیں کہ جن کے خاص طریقے ذکر اور مراقبہ کہلاتے ہیں ۔ ذکر کے لفظی معنی یاد کرنے کے اور مراقبہ کے معنی نگاہ رکھنے کے ہیں لیکن جو کچھ ان کا مطلب صوفیوں کی اصطلاح میں ہے ذیل کے بیان سے ظاہر ہوگا ۔

ذکر دو قسم کے ہیں ۔ ذکر جلی کہ جو باواز کیا جاتا ہے ۔ ذکر خفی جو دھیمی آواز میں یا دل ہی دل میں کیا جاتا ہے ۔

ذکر کرنے کے طریقے شاہ ولی اللہ کے بیان کے مطابق حسب ذیل ہیں

ذکر جلی

(۱) ذکر کرنے والا معمولی طریقہ پر بیٹھ کر اپنے بائیں جانب سے لفظ اللہ کھینچتا ہوا گلے سے آواز نکالتا ہے
(۲) ذاکر اس طرح دو زانو بیٹھ کر کہ جس طرح نماز کے وقت بیٹھتے ہیں

لفظ اللہ اور زیادہ زور کی آواز کے ساتھ پہلے داہنے گھٹنے اور پھر بائیں گھٹنے کی جانب سے نکالتا ہے۔

(۳) ذاکر چار زانو بیٹھ کر لفظ اللہ اور بھی زیادہ زور کی آواز کے ساتھ پہلے داہنے گھٹنے اور پھر بائیں گھٹنے کی طرف سے نکالتا ہے۔

(۴) چار زانو بیٹھا ہوا ذاکر لفظ اللہ پہلے بائیں جانب سے اور پھر داہنی طرف سے اور تب سینہ کے درمیان سے بلند آواز کے ساتھ نکالتا ہے۔

(۵) دوزانو قبلہ رُخ بیٹھ کر ذاکر اپنی آنکھیں بند کرتا ہے اور لفظ "لا" کو مقام ناف سے کھینچتا ہوا بائیں جانب لے جاتا ہے اور تب لفظ "الہ" گویا دماغ سے نکالتا ہوا "الا اللہ" کہہ کر بائیں طرف قلب پر ضرب مار کر جملہ ختم کرتا ہے۔

کسی لفظ کو زور کی آواز سے سینہ کی کسی جانب منہ کر کے ختم کرنے کو اصطلاح میں ضرب کہتے ہیں۔ ذکر کے پانچوں طریقوں میں سے ہر طریقہ کا ذکر کئی سو مرتبہ کرنا پڑتا ہے۔

ذکرِ خفی

(۱) ذاکر اپنی آنکھ اور لب بند کر کے گویا دل کی زبان سے پہلے اللہ سمیع (اللہ سنتا ہے)، اس طرح کہتا ہے کہ ناف سے نکالتا ہوا سینہ تک لاتا ہے اور پھر سینہ سے اللہ بصیر (اللہ دیکھتا ہے) کہتا ہوا دماغ تک اور دماغ سے اللہ علیم (اللہ جانتا ہے) کہتا ہوا آسمان تک ایک سانس میں لے جاتا ہے اور تب اللہ علیم کو آسمانوں سے دماغ تک اور اللہ بصیر کو دماغ سے سینہ تک اور اللہ سمیع کو سینہ سے ناف تک لا کر واپس آتا ہے اور اسی

طرح اوپر آسمانوں تک لے جاتا ہے اور پھر ناف تک واپس لاتا ہے اور بتکرار کئی مرتبہ کرتا ہے۔

(۲) ذاکر لفظ اللہ دھیمی آواز میں پہلے داہنی طرف سے اور پھر بائیں طرف سے نکالتا ہے۔

(۳) ذاکر سانس باہر نکالتے ہوئے " لا الہ" اور سانس اندر لیتے ہوئے " الا اللہ" کہتا ہے۔

اس تیسری ذکر میں بڑی محنت ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں مرتبہ اسی طرح دوہرایا جاتا ہے اور یہ طریقہ سب سے مفید مانا جاتا ہے۔

مراقبہ یا تحمد اشت دھیان کرنے کا ایک شغل ہے کہ جس کا طلب الٰہی تجلی کی حفاظت کرنا ہے۔ یہ اس طرح کیا جاتا ہے کہ صوفی پہلے اللہ حاضری (اللہ میرے ساتھ حاضر ہے) اور اللہ ناظری (اللہ مجھے دیکھتا ہے) اللہ شاہدی (اللہ میرا شاہد ہے) اللہ معی (اللہ میرے ساتھ ہے) کا ذکر کرتا ہے اور جب اُن اذکار کا ذکر خواہ آواز کے ساتھ یا خاموشی میں کر چکتا ہے تب قرآن کی کسی ایک آیت یا کئی آیتوں پر دھیان کرنا شروع کرتا ہے۔ ذیل کی آیتوں سے ظاہر ہو جائیگا۔ کہ کس قسم کے خیالات صوفیوں کے نزدیک روحانی ترقی اور عبادت کے لیے مفید سمجھے جاتے ہیں۔

وہی شروع سے ہے اور وہی آخر تک رہے گا اور وہ قدرتوں سے ظاہر اور ذات و صفات سے پوشیدہ ہے اور وہ ہر چیز سے واقف ہے (سورہ الحدید ۳ آیت)

تم لوگ کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے (سورہ الحدید ۴ آیت)

اور ہم لوگ اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں (سورہ ق آیت ۱۵)

جہاں کہیں منہ کرلو اُدھر ہی کو اللہ کا سامنا ہے (سورۃ البقرۃ آیت ۱۰۹)
سب چیزیں اللہ سے گھری ہیں (سورۃ النساء آیت ۱۲۵)
جتنی مخلوقات روئے زمین پر ہے سب فنا ہو جانے والی ہے اور صرف تمہارے پروردگار کی ذات باقی رہ جائے گی جو بڑی عظمت والی اور بزرگ ذات ہے۔ (سورۃ الرحمٰن ۲۶ و ۲۷ آیات)

ریاضت و عبادت کے ان طرائق مذکورہ کے علاوہ خدا کا ذکر اور طریقوں سے بھی کیا جاتا ہے۔ یہ طریقے عام طور پر بہت مستعمل ہیں۔ عموماً یہ ایسے فقرے ہیں کہ جنہیں مسلمان خوشی اور تعجب کے وقت استعمال کرتے ہیں اور پھر بطور عبادت کے بھی ان کا ورد کیا جاتا ہے۔

(۱) تسبیح۔ یعنی سبحان اللہ کہنا۔
(۲) تحمید۔ یعنی الحمد للہ کہنا۔
(۳) تکبیر۔ یعنی لا الہ الا اللہ کہنا۔

یہ فقرے یا اس قسم کے اور دوسرے فقرے صوفی تسبیح پر پڑھتے ہیں کہ جس سے ان کو شمار معلوم رہتا ہے کہ کوئی فقرہ کئی مرتبہ انہوں نے پڑھا ہے۔

پیرانِ طریقت کے سلسلے

جو شخص صوفی بننے کا ارادہ رکھتا ہے وہ پہلے بطور سالک کے کسی خانوادہ یا سلسلہ کی مریدی اختیار کرتا ہے۔ ہر خانوادہ کا سلسلہ جداگانہ ہوتا ہے اور ہر سلسلہ کا مرکز مرشد یا پیر کہلاتا ہے جو اس سلسلہ کے بانی کا خلیفہ یا سجادہ نشین سمجھا جاتا ہے۔ عموماً ہر مرشد اپنا خلیفہ خود مقرر کرتا ہے لیکن بعض صورتوں میں اس عہدۂ خلافت کا موروثی ہونا بھی پایا گیا ہے۔ مرشد یا

شیخ کی قیام گاہ خانقاہ کہلاتی ہے اور پیر اور مریدوں کی جماعت کو حلقہ کہتے ہیں۔

پیران طریقت کے قریباً کل سلسلوں کا آغاز علی سے ہوتا ہوا محمد صاحب تک پہنچتا ہے اور اس لئے صوفیوں کا یہ دعوے ہے کہ طریقت کا آغاز اسلام کے ساتھ ساتھ ہوا ہے۔ مسلمان کہتے ہیں کہ محمد صاحب کو دو قسم کا علم خدا کی طرف سے ملا تھا۔ ایک علم سفینہ ہے جو قرآن میں پایا جاتا ہے اور دوسرا علم سینہ ہے کہ آپ کے دل پر جس کا القا ہوا۔ پہلی قسم کے علم پر شریعت کی بنیاد ہے جس پر عمل کرنا ہر مسلمان کے لئے فرض ہے۔ دوسری قسم کے علم کو علم باطنی کہتے ہیں اور صحابہ میں یہ صرف چند مخصوص لوگوں کے لئے تھا کہ جن کے ذریعہ سینہ بسینہ منتقل ہوتا رہا ہے۔ اب عام مسلمانوں کا اگرچہ یہ خیال ہے کہ طریقت کی تعلیم جیسی آج صوفیوں میں پائی جاتی ہے بجنسہ یہی تعلیم محمد صاحب کے وقت سے چلی آرہی ہے تاہم گذری فصل میں تواریخی حیثیت سے اس کا بتدریج ترقی پانا دیکھ چکے ہیں۔ یہ تواریخی بیان صوفیوں کے نزدیک مقبول نہیں ہے۔

پیران طریقت کے سلسلے شاخ در شاخ نکلتے ہوئے اگرچہ سینکڑوں تک پہنچ گئے ہیں لیکن چار خاص سلسلوں کے مرید شمار میں کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ جو چشتیہ۔ سہروردیہ۔ قادریہ اور نقشبندیہ کہلاتے ہیں۔

سلسلۂ چشتیہ

ہندوستان میں پیران طریقت کا سب سے قدیم سلسلہ یہی ہے۔ اس سلسلہ کا بانی شیخ ابو اسحاق شامی ہے کہ جس کا انتقال ۹۴۰ء میں ہوا۔ ہندوستان میں اس کا ورود خواجہ معین الدین چشتی کے وسیلہ ہوا کہ جو جنوبی

افغانستان کے مقام سیستان کا رہنے والا تھا۔ وہ شہاب الدین غوری کے لشکر کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوا اور کچھ عرصہ دہلی میں قیام کرنے کے بعد اجمیر میں سکونت اختیار کی۔ جہاں ۱۲۳۶ء میں اس نے وفات پائی ہندوستان کے تمام حصوں سے ہر سال مسلمان رجب کی چھٹی تاریخ کو اس کی وفات کی یادگاری کے موقعہ پر اس کی قبر پر جمع ہو کر عرس مناتے ہیں خواجہ معین الدین کی روحانی اولاد کا شمار مشہور ولیوں میں ہے۔ جن میں سے چند کا ذکر مختصر طور پر ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

خواجہ معین الدین نے اپنے مرید خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کو دہلی میں اپنا خلیفہ اپنی عین حیات ہی میں مقرر کر دیا تھا۔ جس سال اس کے عزیز مرشد خواجہ معین الدین کا انتقال ہوا اسی سال اس نے بھی وفات پائی اور دہلی کے سلطان التمش کا سال وفات بھی یہی ہے۔ خواجہ قطب الدین کو جو عزت اور شہرت حاصل تھی اس کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ سلطان التمش خود اس کے مریدوں میں سے تھا اور اس کی موت پر اسے غسل جنازہ دینا اپنے لئے باعث فخر سمجھا۔

قطب الدین نے اپنا خلیفہ شیخ فریدالدین عطار شکر گنج کو مقرر کیا جو بابا فرید کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۲۶۵ء میں بابا فرید نے وفات پائی اور پنجاب کے مقام پاک پٹن میں دفن ہوا کہ جہاں اس کا عرس محرم کی پانچویں تاریخ کو منایا جاتا ہے۔ اس نے تصوف پر کئی کتابیں لکھی ہیں کہ جن میں سب سے مشہور کتاب تذکرۃ الاولیا ہے۔ اس کے بعد اس کے دو مشہور مرید یعنی حضرت نظام الدین اولیا دہلی میں اور حضرت مخدوم علاؤ الدین احمد صابر پیران کلیر میں خلیفہ مقرر ہوئے۔

نظام الدین صوبۂ متحدہ کے مقام بدایوں کا رہنے والا تھا اور بیس برس کی عمر میں بابا فرید نے اپنے جیتے جی اسے خلیفہ مقرر کیا۔ نظام الدین سے خاندانِ چشتیہ کی ایک نئی شاخ نکلی جو نظامیہ کہلاتی ہے ۱۳۲۵ء میں اس نے وفات پائی اور دہلی کے مضافات میں دفن ہوا۔ اس کی قبر آج تک زیارت گاہِ خلائق ہے اور وہ خود محبوب الٰہی کے نام سے مشہور ہے۔

علاؤ الدین صابر بابا فرید کا دوسرا خلیفہ تھا کہ جس نے رڑکی کے قریب مقام کلیر میں سکونت اختیار کی اور ۱۲۹۱ء میں انتقال کیا اس وقت سے کلیر کا نام پیران کلیر پڑ گیا۔ اس نے چشتیہ خاندان میں ایک اور نئی شاخ جاری کی کہ جو اس کے نام پر صابری کہلاتی ہے۔ ربیع الاول کی سترہ تاریخ کو اسکا عرس منایا جاتا ہے۔

سلسلۂ سہروردیہ

اس خاندان کا آغاز ضیاء الدین ابی نجیب سہروردی سے شروع ہوتا ہے کہ جس نے ۱۱۶۷ء میں انتقال کیا۔ ہندوستان میں یہ خاندان شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی خلیفہ شیخ شہاب الدین سہروردی کے ذریعہ جاری ہوا۔ شیخ شہاب الدین خود ضیاء الدین ابی نجیب سہروردی بانیٔ خاندان کا مرید اور خلیفہ تھا۔ بہاؤ الدین کا انتقال ۱۲۶۶ء میں ہوا اس کی قبر ملتان میں ہے کہ جس کی بڑی عزت و تعظیم کی جاتی ہے۔ اس کے مرید ہندوستان میں اسلام کے سرگرم مبلغ تھے۔

اس خاندان کے مشہور ولیوں میں ذیل کے لوگ گزر چکے ہیں جلال بن احمد کبیر جو مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے نام سے مشہور ہے۔ کہتے

ہیں کہ اس نے چھتیس حج مکہ کا کیا اور بڑی بڑی کرامتیں اس سے ظہور میں آئیں۔ اس کا انتقال ۱۳۸۴ء میں ہوا۔ دوسرا مشہور ولی اس کا پوتہ ابو محمد عبد اللہ تھا جو قطب عالم کے نام سے مشہور ہے ۱۴۵۳ء میں اس نے وفات پائی اور گجرات کے مقام بٹوہ میں دفن ہوا۔ ابو محمد عبد اللہ کا بیٹا سید محمد شاہ عالم نے اپنے زمانہ کے سیاسی اور مذہبی کارناموں میں بڑا حصہ لیا۔ ۱۴۷۵ء میں اس کا انتقال ہوا اور احمد آباد کے قریب مقام رسول آباد میں اس کی قبر ہے۔

سلسلۂ قادریہ

سلسلۂ قادریہ کی ابتداء شیخ عبد القادر جیلانی سے ہوتی ہے۔ جو غوث الاعظم کے لقب سے مشہور ہے۔ غوث صوفیوں میں ولی کا سب سے بڑا مرتبہ سمجھا جاتا ہے اور ہندوستان بھر میں پیر پیران اور پیر دستگیر کے نام سے شیخ عبد القادر کی عزت کی جاتی ہے اور ربیع الآخر کی گیارھویں تاریخ کو جو ہندوستان میں گیارھویں شریف کہلاتی ہے کل دنیائے اسلام میں اس کا عرس منایا جاتا ہے۔ تمام ہندوستان میں جگہ جگہ اس کے نام پر زیارت گاہیں بنی ہیں جہاں لوگ اس سے منت مانتے یا اپنی درخواستیں پیش کرنے کو جاتے ہیں۔ شیخ عبد القادر کی وفات ۱۱۶۶ء میں ہوئی۔ ہندوستان میں یہ سلسلہ اس کی اولاد میں سے ایک شخص محمد غوث نے جاری کیا۔ جس نے ۱۴۸۲ء میں سندھ کے مقام اُچ میں سکونت اختیار کی۔ اس سلسلہ قادریہ کا ایک مشہور پیر شیخ میر محمد گزر چکا ہے مغل شہنشاہ شاہجہان کا بیٹا دارا شکوہ اس کا بڑا معتقد تھا۔ اور اسے اپنا مذہبی ہادی سمجھتا تھا۔ دارا شکوہ نے خود متعدد کتابیں تصوف پر لکھی

ہیں۔ اور خود اس کی سوانح عمری بھی لکھی ہے۔

سلسلۂ نقشبندیہ

اس سلسلہ کا آغاز خواجہ بہاؤالدین نقشبند سے ہوتا ہے اس کا وطن ترکستان تھا۔ ۱۳۸۹ء میں اس نے وفات پائی اور شہر بخارا کے قریب دفن ہوا۔ ہندوستان میں اس کا ورود خواجہ محمد باقی باللہ کے طفیل سے ہوا جو کابل کا رہنے والا تھا مگر دہلی میں سکونت اختیار کی جہاں ۱۶۰۳ء میں وفات پائی۔ اس کا خلیفہ شیخ احمد شہرت اور ریاضت میں اپنے مرشد سے بھی بڑھ گیا اور اس نے سلسلۂ نقشبندیہ کی ایک نئی شاخ جاری کی جو مجددیہ کہلاتی ہے۔ شیخ احمد کا پورا لقب مجدد الف ثانی امام ربانی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ احمد اسلامی سنہ کے دوسرے ہزار کے سرے پر اسلام کا مجدد (یعنی اسلام کو تازہ کرنے والا) سمجھا جاتا ہے۔ ۱۶۲۴ء میں اس نے وفات پائی اور ریاست پٹیالہ کے مقام سرہند میں دفن ہوا۔

سلسلہ نقشبندیہ میں چند خاص امتیازی باتیں پائی جاتی ہیں۔ اس سلسلہ میں ذکر جلی کی تلقین نہیں کی جاتی بلکہ اس کے مرید صرف ذکر خفی کرتے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کل سلسلے علی کے بالواسطہ محمد صاحب تک پہنچتے ہیں لیکن یہ سلسلہ ابوبکر خلیفہ اول سے ہوتا ہوا محمد صاحب سے جا ملتا ہے۔ علاوہ اس کے اگرچہ اس سلسلہ کو ابتدائً ہندوستان میں اور دوسرے سلسلوں کے مقابل کامیابی کم حاصل ہوئی ہے تاہم پنجاب اور کشمیر میں اس سلسلہ نے زور پکڑنا شروع کیا ہے۔ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں اس سلسلہ کا رواج زیادہ ہے۔

ان چار خاص سلسلوں کے علاوہ ہندوستان میں ایسے بھی بہت سے سلسلے ہیں کہ جو بے شرع کہلاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو کسی خاص نظام کے ساتھ منسلک ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ جن کا انحصار محض فقیروں پر ہے جو جو ادھر ادھر پھرا کرتے ہیں۔

صوفیوں کی چند خاص امتیازی باتیں

(۱) اولیاء کے مدارج :-

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اسلام میں اولیاء کے مدارج پائے جاتے ہیں اور ہر ولی کو اس کی فضیلت کے موافق ولایت کا کوئی نہ کوئی درجہ حاصل ہوتا ہے۔ مدارج کے اس نظام کا تقرر خدا کی طرف سے ہوتا سمجھا جاتا ہے اور خدا ولی کو جو درجہ چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔

سب سے بڑا درجہ غوث کا ہے۔ اس کے لفظی معنی ہیں مددگارِ کائنات کسی ایک وقت میں ایک ہی غوث ہوتا ہے۔ دوسرے درجہ پر اقطاب ہیں کہ جن کے زیر اثر دنیا کی عظمت اور بڑائی کا ہونا مانا جاتا ہے یہ شمار میں ہمیشہ تین ہوتے ہیں۔ ان کے بعد پانچ عمد یعنی کائنات کے ستون کہلاتے ہیں اور پھر چالیس ابدال ہیں۔ ابدال کی وجہ تسمیہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ان کی انسانی فطرت روحانیت سے بالکل بدل جاتی ہے ان کے بعد ستر نجبا اور تین سو نقبا ہیں۔ اور آخر درجہ میں عام اولیاء اللہ ہیں۔

بعض کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان کے گناہ کی کثرت کے باعث دنیا کب کی فنا ہو جاتی مگر ان اولیاء اللہ کی دعاؤں اور نیکیوں کے سبب

کہ جن کو ولایت کے اعلیٰ مدارج حاصل ہیں یہ دنیا قائم ہے۔ غوث کی شفاعی دعائیں ہرگز بے کار نہیں جاتی ہیں یہ ممکن ہے کہ وہ اولیاء اللہ کہ جن کو ولایت کا ادنیٰ درجہ حاصل ہے۔ ان کی درخواستیں کبھی نہ بھی سنی جائیں

(۲) کرامت:۔

مسلمان مانتے ہیں کہ اسلام کے تمام اولیاء اللہ کو خرقِ عادت پر قدرت حاصل ہے تاہم صوفیوں کی تعلیم کے مطابق جس طرح نبی پر فرض ہے کہ اپنے عجیب وغریب کام کرنے کی الٰہی طاقت کو کھلے طور پر لوگوں میں دکھلائے۔ اسی طرح ولی پر فرض ہے کہ حتی المقدور اپنی کرامت کو چھپائے۔ خوارقِ عادت کے چار درجے ہیں۔

(۱) معجزہ۔ جو نبوت کا نشان ہے صرف نبی سے صادر ہوتا ہے

(۲) کرامت۔ اس خرقِ عادت کو کہتے ہیں کہ جس کا ظہور ولی سے ہو۔

(۳) معونت۔ وہ ہے جو کسی معمولی شخص سے بطور خرق عادت ظہور میں آئے۔

(۴) استدراج۔ وہ ہے جو کسی جادوگر سے جو مسلمان نہیں ہے خلاف عادت ظہور میں آئے۔

(۳) سماع یا قوّالی:۔

شریعت میں سنت کی تعلیم کے مطابق سماع یعنی گانا بجانا حرام ہے لیکن صوفیوں کے بعض سلسلوں میں چند شرائط کے تحت سماع جائز قرار دیا گیا ہے۔ گانے والے بچے نہ ہوں اور نہ ہی عورت ہوں بلکہ بڑی عمر کے آدمی ہوں اور سننے والے ایسے لوگ ہوں جو یادِ حق

سے خالی نہ ہوں۔ آلۂ سماع کے لئے محض بانسریوں کا استعمال جائز ہے دیگر قسم کے آلات موسیقی کا استعمال منع ہے۔ آج کل ان شرائط پر مجلس سماع میں پورے طور پر عمل نہیں کیا جاتا۔

شیخ فرید الدین عطار کا قول سماع کے متعلق ہے کہ "سماع سے سننے والوں کے دل حرکت کرنے لگتے ہیں اور مشتاقوں کے سینوں میں شوق کی آگ بھڑک اٹھتی ہے"۔ سماع کا مقصد سننے والے پر حالت وجد طاری کرنا ہے۔ جب سماع سننے والا وجد میں آجاتا ہے تو تنہا یا سب کے ساتھ مل کر رقص کرنے لگتا ہے۔ اس قسم کے رقص یعنی ناچنے کودنے کے متعلق نظام الدین اولیاء کا قول ہے کہ "درویش جب سماع میں تالی بجاتا ہے تو ہاتھوں کے گناہ زائل ہو جاتے ہیں اور جب نعرہ مارتا ہے۔ تو اندرونی خواہشات نکل جاتی ہیں۔" (سیر الاولیاء: در بیان رقص و تحریق ثواب) ایسے واقعات بھی پائے جاتے ہیں کہ جب بعض صوفیوں نے سماع سنتے وقت حالت وجد میں انتقال کیا ہے۔

مجلس سماع عام طور سے اولیاء کی قبروں پر ان کے عرس کی تقریب میں منعقد کی جاتی ہے۔

(۴) مرشد کی اطاعت:-

اگرچہ تصوف کا یہ دعوےٰ ہے کہ بغیر کسی وساطت کے الٰہی تجربہ کے حاصل کرنے کا یہ ایک طریقہ ہے تاہم اس کی عملی صورت میں کسی پیر یا مرشد کے وسیلہ کا اختیار کرنا ضروری مانا گیا ہے۔ پیر کی ہدایتوں کو اندھا دھند ماننا پڑتا ہے۔ درحقیقت مسلمان جس طرح پیغمبر عرب کے حکم کی فرماں برداری کرتے ہیں اسی طرح مرید اپنے پیر کی اطاعت کرتا

ہے۔ اس کی باتیں اگر ظاہراً احکام شریعت کے خلاف بھی معلوم ہوں تو بھی ان پر عمل کرنا ضروری ہے چنانچہ ایک صوفی کا قول ہے۔

بمے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا

یعنی اگر تیرا پیر تجھ سے کہے تو مصلے شراب سے رنگ کیونکہ جس راہ سے وہ تجھے لے جا رہا ہے اس کی راہ و رسم سے وہ واقف ہے بلکہ طریقت کی آخری منزل فنا فی اللہ تک کوئی نہیں پہنچ سکتا جب تک وہ فنا فی الشیخ کا مرتبہ حاصل نہ کر لے۔

(۵) زیارت :۔

پیر کی یہ تعظیم اس کی موت کے بعد بھی اس کے مریدوں اور معتقدوں میں قائم رہتی ہے۔ اس کی قبر پکی کر کے زیارت گاہ بنا دی جاتی ہے کہ جہاں عموماً ہر جمعرات کی شام کو لوگ ایک مٹی کا چراغ روشن کرتے اور پھول چڑھاتے ہیں۔ ایسی زیارت گاہیں مزار یا درگاہ کہلاتی ہیں۔ جو پیر ولی کا درجہ حاصل کر لیتا ہے اس کی قبر کی اور بھی زیادہ تعظیم کی جاتی ہے کہ جہاں لوگ دور دور سے اس کی زیارت کو آتے ہیں۔ زیارت سے مراد کسی ولی کی تعظیم کی غرض یا کسی دنیاوی اور دینی برکت حاصل کرنے کے لئے اس کی قبر پر جانا ہے۔ کسی ولی کی قبر پر پہنچ کر جو کچھ دعائیں وغیرہ پڑھی جاتی ہیں اسے فاتحہ کہتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ زیارت کرنے والا پہلے سورہ فاتحہ پھر سورہ اخلاص اور سورۃ الفلق اور سورۃ الناس پڑھ کر اس کا ثواب پیر یا ولی کی روح کو بخشتا ہے۔ اور تب اس ولی سے اپنے کسی خاص مقصد کے لئے دعا مانگتا ہے۔ عام طور پر ایسے موقع پر منت بھی مانی جاتی ہے جسے

دعا کے قبول ہونے پر زیارت کرنے والا پھر آکر پوری کرتا ہے۔ کبھی کبھی منت ماننے والا کپڑے کا ٹکڑا یا دھاگا قبر کے پاس کسی درخت کی ٹہنی یا یا جالی کے کسی سلاخ سے باندھ دیتا ہے تاکہ اُس قبر کے ولی کو اس کی درخواست یاد رہے۔

راسخ الاعتقاد مسلمان خاص کر وہابی اس قسم کی باتوں کو ناجائز قرار دیتے بلکہ شرک ٹھہراتے ہیں جو مسلمانوں کے نزدیک سب سے بڑا گناہ ہے کہ جس کی معافی مل نہیں سکتی۔

چوتھا باب

دُنیائے جدید میں اسلام کی حالت

پہلی فصل

مشرقِ ادنیٰ میں اسلام

اسلام ابتدا ہی سے ایک سیاسی اور مذہبی تحریک کی صورت میں رونما ہُوا۔ اور اس کی ساری تواریخ اور اس کے ضابطۂ قوانین میں مذہب اور سلطنت اس طرح متحد ہیں کہ یہ علیحدہ نہیں کئے جا سکتے اس لئے اگر ہم اسلام کے موجودہ حالات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ان ملکوں کے سیاسی حالات کا کہ جہاں مسلمان رہتے ہیں اور وہاں کے مسلمانوں کی مذہبی زندگی کا پتہ لگائیں۔

خارجی سیاسیات

گذشتہ صدی میں اسلام کو عظیم الشان تغیرات کا سامنا کرنا پڑا ہے سو سال قبل یا صحیح تاریخی الفاظ میں جسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ ۱۸۳۰ء کے پیشتر مسلمانوں کا بہت بڑا حصہ اسلامی سلطنت کی زیر حکومت رہتا تھا سلطنت عثمانیہ میں ترکوں کی جمہوری حکومت کے موجودہ علاقہ جات کے علاوہ مصر لیبیا۔ عرب۔ شام۔ عراق اور بلقان بھی شامل تھے۔ ۱۸۸۲ء کے آٹھ سال قبل یونان سلطنت عثمانیہ کا ایک حصہ تھا لیکن ۱۸۳۰ء میں اپنی آزادی کے لئے یہ جنگ کرتا ہوا پایا گیا۔ لیبیا سے مغربی جانب شمالی افریقہ کا باقی حصہ سب کا سب مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا اور کئی خود مختار ریاستیں اس میں قائم تھیں۔ گذشتہ صدی میں ایک طرف تو یورپین طاقتوں نے اسلامی ممالک پر پے در پے حملے کئے اور دوسری طرف جنگ آزادی کے ذریعہ ان ممالک نے اپنے آپ کو ترکوں سے آزاد کر لیا۔

۱۸۳۰ء میں فرانسیسیوں نے الجیریا پر حملہ کیا اور ۱۸۴۷ء میں ریگستان کے کنارے تک اپنی فتوحات کو بڑھا کر اس پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۷۸ء میں ترک اور روس کی جنگ کے بعد بلقانی ریاستوں کی خود مختاری تسلیم کر لی گئی یعنی سرویا۔ مونٹنگرو اور رومانیا کا خود مختار ہونا مان لیا گیا اور بلغاریہ کی خود مختاری اس حیثیت سے قبول کی گئی کہ یہ ترکوں کا باجگذار رہے دوسری یورپین سلطنتوں نے اس قسم کے معاہدہ پر اعتراض کیا اور تھوڑے ہی عرصہ بعد ان کی حد بندیوں اور دوسری اور باتوں میں کہ جس کا اثر خاص طور سے بلغاریہ پر پڑا۔ تبدیلیاں کی گئیں اور ساتھ ہی علاقہ جات بوسینا اور

ہرزوگوینا سلطنت اسٹریا سے ملحق کر دیئے گئے اور جزیرہ قبرس برطانیہ کو دے دیا گیا۔ ۱۸۷۸ء اور ۱۸۸۲ء کے درمیان فرانسیسیوں نے طونسیا پر اپنا تسلط جما کر اسے اپنی حفاظت میں لے لیا۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں فرانس۔ اسپین۔ جرمن اور برطانیہ عظمیٰ ہر ایک یہ کوشش کر رہا تھا کہ مراکش سے سیاسی تعلقات پیدا کرنے میں اپنے حریف سلطنت پر سبقت لے جائے اور ۱۹۰۶ء میں ان کی کوششوں نے ایسی خطرناک صورت اختیار کر لی کہ یورپ میں ایک جنگ عظیم ہوتے ہوتے رک گئی آخرکار ۱۹۱۲ء میں سلطنت فرانس کو مراکش کے سلطان کے ساتھ ایک ایسا معاہدہ کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی کہ جس کی رو سے مراکش اس کی زیر حفاظت آگیا اور اسپین کو محض شمالی ساحل پر ہی اپنا اثر قائم کر لینے پر قناعت کرنا پڑا۔ ۱۹۱۱ء میں جب اطالیہ نے لیبیا یعنی طرابلس پر حملہ کر کے اس کے دو صوبوں پر قبضہ کر لیا تو یہ گویا شمالی افریقہ میں یورپین سلطنتوں کے حملوں کے سلسلہ کی آخری کڑی تھی۔

ان پے در پے حملوں کا لازمی نتیجہ مزاحمت تھا۔ لیبیا میں اطالیہ کا مقابلہ کیا گیا لیکن یہ مقابلہ کرنے والے ترک نہیں بلکہ ریگستان کے سنوسی تھے کہ جنہوں نے اطالیہ کو اپنے ممالک مفتوحہ میں پورے طور پر جمنے سے روکنا چاہا۔ ۱۹۳۰ء میں سنوسیوں کے آخری ریگستان کے زرخیز مقام کفرا پر جو بالکل جنوب میں واقع ہے اطالیہ نے قبضہ کر لیا اور ۱۹۰۹ء میں جب ہسپانیہ نے مراکش کے ان مقامات پر قبضہ کرنا چاہا کہ جو ان کے دائرہ اثر میں تھے تو ریفی ان کے مزاحم ہوئے اور ۱۹۲۵ء میں ان کی یہ مخالفت ترقی کرتی ہوئی فرانسیسی علاقوں تک پہنچ گئی جنگ

عظیم کے ختم ہونے کے بعد جب اتحادی آپس میں ترقی کے شرائط صلح پر بحث کر رہے تھے یونانیوں نے شہر سمرنا پر قبضہ کر لینا چاہا۔ کیونکہ زیادہ تر اس میں یونانی بستے تھے۔ اور اتحادیوں نے اس موقع پر غیر دانشمندانہ کام یہ کیا کہ یونانیوں کو اس شرط پر سمرنا فتح کر لینے کی اجازت دے دی کہ وہ اپنی فتوحات کو سمرنا سے آگے نہ بڑھائیں لیکن اس شرط کے باوجود یونانی ملک کے اندر گھستے چلے گئے اور ایشیائے کوچک کی طرف جسے اناطولیہ کہتے ہیں آگے بڑھے۔ ترک اپنی سلطنت کے باہری علاقہ جات یعنی عرب۔ عراق۔ شام۔ فلسطین اور بلقان کے بہت بڑے حصہ کا اپنے قبضہ سے نکل جانا صبر سے برداشت کئے بیٹھے تھے لیکن خود ان کی اپنی سرزمین اناطولیہ کے قبضہ سے نکل جانے کے اندیشہ نے ان کے جذبات بھڑکا دیئے اور ان کے جنرل مصطفےٰ کمال پاشا نے موقعہ کے مطابق ہمت سے کام لے کر ترکوں کو یونانیوں پر فتح دلائی۔

اس دوران میں برطانیہ ہندوستان کی تحریک خلافت کی شورش کے باعث اور دیگر اتحادی آپس کی نااتفاقی کے سبب باہمی سیاسی تعلقات کے قائم کرنے میں ناکامیاب رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اتحادیوں کو مجبوراً ایک ذلیل معاہدہ پر دستخط کر کے شرمندگی کے ساتھ قسطنطنیہ سے لوٹنا پڑا اور یوں مصطفےٰ کمال اپنے ملک کا بچانے والا مانا گیا اور غازی کے لقب سے مشہور ہوا۔ اور اس نے وہ ہردلعزیزی حاصل کی کہ جس کے سبب ترکی میں وہ ایسی حیرت انگیز تبدیلیاں کر سکا کہ امان اللہ چند ہی برس بعد اپنے ملک افغانستان میں جن کے کرنے سے قاصر رہا اس طرح ترکی کے معاملات کی سیاسی حالت اب یہ ہے کہ اگرچہ

یہ چھوٹا سا ملک ہے لیکن ہے متحد اور قریب قریب سارے ملک میں ترکوں ہی کی آبادی ہے۔ رومانیہ، بلغاریہ، یوگوسلاویہ، البانیہ اور یونان میں جو پہلے ترکی حکومت میں شامل تھے اب خود مختاری کا اعلان سرکاری طور پر ۱۶ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو ہو چکا ہے۔ عرب غیر ملکی اثر سے بالکل آزاد ہے اور اس کے ایک بڑے حصہ پر ابن سعود کی حکومت ہے تاہم مجلس مابین ماوراء النہر اور شام پر اگرچہ برطانیہ اور فرانس کی حکومت ہے تاہم مجلس مابین الاقوام کے نمائندے کی حیثیت سے یہ ان ملکوں پر حکمران ہیں اور مجلس کے پاس اپنی حکومت کا ان کو اظہار دینا پڑتا ہے۔ شمالی افریقہ کی حکومت پوری کی پوری اب یورپین طاقتوں یعنی فرانس، اسپین اور اطالیہ کے ہاتھوں میں ہے اور یوں گزرے سو برسوں میں نہ صرف ترکی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے بلکہ ملک کے وسیع حصہ کی مسلمانی حکومت مسیحی عملداری سے بدل گئی ہے۔ خود ترکی کے اندر کی تبدیلی حیرت زا ہے۔ کچھ عرصہ سے ترکوں کی یہ امید تھی کہ اتحاد اسلامی کی وہ سب سے بڑی طاقت ثابت ہوں گے لیکن جنگ عظیم نے ان پر ثابت کر دیا کہ دوسرے ملکوں کے مسلمانوں پر وہ بھروسہ نہیں کر سکتے اور اس لئے انہوں نے اپنا رخ مغرب کی طرف کیا اور یورپین قوم کی حیثیت سے اپنا مستقبل بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

اب جب ہم ایران کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ایک صدی کی حالت کے بجائے دو صدیوں کی حالت پر غور کرنے کی ضرورت پڑتی ہے دو صدیوں سے روس رفتہ رفتہ شمال کی طرف دست اندازی کرتا رہا اور اس عرصہ میں اس قدر ملک کے حصہ پر کہ جس کا رقبہ خود پورے ایران سے بھی بڑا ہے قبضہ کر لیا کہ جس کے باعث اب مسلمانوں کی ایک بڑی

تعداد سوویٹ روس کی حکومت میں پائی جاتی ہے۔

اندرونی سیاسی تبدیلیاں

بہیترے اسلامی ممالک ہیں اب اسلام وہاں کا دستور الحکومت نہیں رہا۔ ایک اسلامی ملک، نے اسلامی طرز حکومت خود اپنی مرضی سے موقوف کر دیا۔ ۱۹۲۲ء میں ترکی نے جمہوری حکومت کا اعلان کیا اور ترکی کے غیر ملکیوں کو جو اپنے ملکوں کی قانونی پناہ حاصل تھی موقوف کر دیا۔ عرصہ دو سال تک سابق سلطان ترکی مسلمانوں کے مذہبی پیشوا ہونے کی حیثیت سے خلیفہ کہلاتا رہا لیکن ۱۹۲۴ء میں وہ ترکی سے نکال دیا گیا اور خلافت کا یوں خاتمہ ہو گیا۔ ۱۹۲۸ء میں ترکی نے جدید اصلاحات کرنے میں ایک قدم اور آگے بڑھایا یعنی اسلام کا سرکاری مذہب ہونا اٹھا دیا گیا اور اسی سال عربی رسم الخط کے بجائے جو اب تک ترکی زبان کے لئے مستعمل تھا رومن رسم الخط رائج کیا گیا۔ ان دونوں اصلاحوں سے یہ ظاہر ہو گیا کہ ترکی اپنا مستقبل مغربی تہذیب کے نمونہ پر بنانا چاہتا ہے۔

ایران میں بھی بڑی سیاسی تبدیلیاں ہو چکی تھیں کہ جس کے نتیجہ میں ایک نئے خاندان پہلوی نے ایران کی عنان سلطنت اپنے ہاتھ میں لی لیکن ترکی کے واقعات کی طرح ایران کی تبدیلیوں نے دنیا کی توجہ اپنی طرف مائل نہیں کی۔ ایران میں جمہوری سلطنت کے قائم کرنے کی غرض سے ایک تحریک ۱۹۲۴ء میں رونما ہوئی کہ جس کا ہادی رضا خاں تھا اور جو اپنی قابلیت کے باعث ایرانی فوج سے ترقی کرتا ہوا وزیر جنگ کے عہدہ تک پہنچ گیا تھا لیکن یہ دیکھ کر کہ ملک ابھی جمہوری حکومت کے لئے تیار نہیں ہے ۱۹۲۵ء میں رضا خاں نے

سلطان احمد کی جگہ جو معزول کیا جا چکا تھا خود شاہ ہونا منظور کر لیا۔ اس واقعہ کے صرف چار سال قبل سر پرسی سائکس لکھتے ہیں کہ" ایران میں بدنظمی اور قزاقی اس درجہ پہنچی ہوئی ہے کہ وہاں کے غیر ملکیوں کو جو حق حاصل ہے کہ اپنے ملکوں کی قانونی پناہ میں رہیں اس کا موقوف کر دینا بعید القیاس معلوم ہوتا ہے"۔ رضا خاں نے ملک کے اندر امن قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی اور تھوڑے ہی عرصہ میں ملک کو قزاقوں سے صاف کر دیا۔ قزاقوں کے خطرے کو ملک سے دور کرنے میں سڑک۔ ریل اور ہوائی راستہ کے آمد و رفت کے وسائل نے بہت کچھ مدد دی ہے۔ ۱۹۲۸ء میں غیر ملکیوں کو جو حق اپنے ملکوں کی قانونی پناہ میں رہنے کا حاصل تھا وہ موقوف کر دیا گیا۔ اور اسی سال ایک مشنری نے یہ لکھا کہ "جس وقت سے یہ قانون موقوف کر دیا گیا ہے غیر ملکیوں کے آرام و استحقاق میں ذرہ بھر بھی فرق نہیں آیا ہے۔" ترکی کی طرح ایران میں جمہوری اور پارلیمنٹری حکومت تو ہے لیکن اب تک ان دونوں میں سے کسی ایک ملک کو بھی حقیقی سیاسی آزادی حاصل نہیں ہے اور رائے دہندگان کو صرف سرکاری امیدواروں ہی کے لئے رائے دینے کی اجازت ہے۔

مذہبی تحریکات

ترکی میں اسلام کا سرکاری مذہب نہ رہنا اگرچہ یہ خیال پیدا کرتا ہے کہ اس ملک کو دوسرے اسلامی ملکوں کے مقابلہ میں زیادہ مذہبی آزادی حاصل ہوگی لیکن یہ حقیقت نہیں ہے کیونکہ اگرچہ ہر کسی کو تبدیلی مذہب کا حق قانونی کتاب کے رو سے حاصل ہے تاہم قسم قسم کی رکاوٹ تبلیغی کام میں حائل کی جاتی ہے۔ سوائے بائبل کے تقسیم کرنے کے اور کسی قسم کا بشارتی کام کھلے طور پر کرنا

ممکن نہیں فی الحال ترک مذہبی باتوں میں دلچسپی کم لیتے ہیں کیونکہ وہ اپنے جماعتی اور سیاسی لائحہ عمل کو پورا کرنے میں منہمک ہیں۔ درویشوں کے کل حلقے موقوف توکر دیئے گئے ہیں لیکن اور باتوں میں اسلام پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہے شہروں میں اسلام کی ظاہرا باتوں کی پابندی کم کی جاتی ہے۔ مذہبی تبلیغ پر قیود اس لئے عائد ہیں کہ ترکوں کے خیال میں مذاہب تفرقے پیدا کر کے قومی اتحاد میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ ترکی میں مذہبی بیداری کے فی الحال آثار نہیں پائے جاتے مصر میں جہاں پوری مذہبی آزادی ہے مذہب میں لوگ دلچسپی زیادہ لے رہے ہیں مسیحی جماعتیں بڑے زور وشور سے مسلمانوں اور قبطیوں میں بشارتی کام کر رہی ہیں۔ اور قبطی کلیسیا کے پادریوں کو بہتر تعلیم دے کر کلیسیائی اصلاح کی کوشش کرنے کے آثار نمایاں ہیں مسلمانوں نے بھی اسلام میں اصلاح کرنے کی سچی کوششیں کی ہیں لیکن ان کی یہ اصلاحیں اس حد تک نہیں ہیں کہ جس حد تک ہندوستان میں کی جاتی ہیں۔ دار العلوم الازہر جو راسخ الاعتقاد اسلام کی تعلیم کا مضبوط مرکز رہ چکا تھا اب جدید تعلیم کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اپنا نصاب آہستہ آہستہ بدل رہا ہے۔

فلسطین میں جو سب سے نمایاں بات نظر آرہی ہے وہ مسلمانوں اور یہودیوں کے مابین اقتصادی کش مکش ہے۔ اس ملک میں مسیحیت کی طرف نئے رجحان کی ایک قابل ذکر مثال ۱۹۲۷ء کا ایک واقعہ ہے کہ جب صوبہ گلیل کے کسی گاؤں میں تیس مسلمانوں نے مسیحیت قبول کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ سب کے سب اپنے ارادہ پر اگرچہ قائم نہیں رہے تاہم اس ملک کے مسلمانوں کے درمیان مسیحی بشارت کے کام کا یہ ایک نیا تجربہ تھا۔

عرب کا موجودہ فرماں روا ابن سعود فرقۂ وہابی سے ہے کہ جو سادگی

اور کٹر دینداری کے لحاظ سے شروع اسلام کے مانند ہے۔ اولیاء اللہ کی تعظیم اور تمباکو کا استعمال اس فرقہ کی تعلیم کی رُو سے داخلِ بدعت ہے اور اس لئے حرام سمجھے جاتے ہیں۔ مسیحیت کی تبلیغ کا کام خاص عرب کے باہر ہی باہر کناروں پر محدود ہے۔

فرانسیسی شمالی افریقہ میں وہاں کی سرکار فرانسیسیہ اس ملک کی بربر زبان کو اشاعت دینے کی ترغیب دے رہی ہے اور سلطنت فرانسیسیہ کا یہ عمل مسلمانوں کی نگاہ میں اسلام پر حملہ ہے۔

مسیحی تبلیغ کا کام اور جگہوں سے زیادہ کامیابی کے ساتھ غالباً ایران میں جاری ہے۔ حال ہی کے ایک مصنف کا بیان ہے کہ ایران کے اسلام میں اصلاح کی سچی کوشش کے بغیر تشتت پیدا ہوتا جا رہا ہے لیکن اس کا یہ بھی بیان ہے کہ ان میں احمدیہ عقاید کی تبلیغ شروع ہو گئی ہے۔ بہائی تحریک کہ جسے بابی تحریک بھی کہنی چاہئے۔ ان دعاوی کو پورا کر دکھانے میں قاصر رہی ہے جو اس نے بڑی شد و مد کے ساتھ کئے تھے اور اب ترقی کی طرف بہت کم بڑھتی نظر آ رہی ہے۔ قومیت کے نئے احساس نے بعض ایرانیوں کی توجہ مجوسیوں کے زرتشتی مذہب کی طرف منعطف کر دی ہے کہ جو ایران سے بالکل نیست نابود ہو گیا ہے۔ مسیحی تبلیغ کی اجازت ہے اور مختلف قیود کے عائد کئے جانے کے باوجود وہاں کی مسیحی کلیسیا نو مریدوں کی اچھی خاصی تعداد اپنے اندر شامل کر رہی ہے۔ کل بیانات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ایران کی مسیحی کلیسیا ایک سرگرم جماعت ہے جو تبلیغی کام میں منہمک ہے۔

عالم اسلام کا جو خلاصہ ہم نے پیش کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ دنیائے اسلام جن بڑے تغیرات سے گزر رہا ہے اس سے بہتیرے مسلمانوں

کے اندر ایک نیا جوش پیدا ہو گیا ہے اور وہ نئے خیالات کو قبول کرنے کے لئے پیشتر سے زیادہ مستعد پائے جاتے ہیں۔ پرانے زمانہ میں مسلمانوں کا یہ عقیدہ تھا کہ اسلامی فتوحات اس بات کی علامت ہے کہ خدا کو ان کا مذہب پسند ہے لیکن زمانہ حال میں ان کی سلطنت اور شہرت کی کمی نے بلاشبہ ان کے دلوں میں اسلام کی طرف سے شکوک پیدا کر دیئے ہیں۔ بہر حال ہم خود اس دلیل کو اسلام کے خلاف نہ لائیں۔ کیونکہ ہم واقف ہیں کہ دنیاوی کامیابی کسی شخص یا قوم کی راست بازی کا معیار نہیں ہو سکتا لیکن جہاں انسان کے دل میں شکوک پائے جاتے ہیں تو وہاں مسیحی تبلیغ کے لئے ایک بڑا موقعہ ہے اور یہ قابل غور بات ہے کہ ترکی جیسے ملکوں میں کہ جہاں مسیحی گواہی کمزور رہی ہے وہاں مادہ پرستی کی طرف رغبت کا لوگوں میں امکان زیادہ پایا جاتا ہے لیکن جہاں مسیحی شہادت پڑ رہی ہے وہاں یا تو کسی بہتر مذہب کی خاطر مسیحیت کی طرف میلان طبع لوگوں میں پایا گیا ہے یا کم از کم وہاں اسلام کی اصلاح کی کوشش کی جا رہی ہے۔

دوسری فصل

دسویں صدی سے ہندوستان میں اسلام

(۱) سلطنت دھلی

نوسو سال پیشتر ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے اس ملک کے عقاید دستورات اور رسوم کو کہ جنہیں زمانہ قدیم سے لوگ مانتے اور برتتے چلے آرہے تھے پے در پے سخت صدمے پہنچے اور دوران ایام میں ان میں کچھ ترمیم بھی ہوگئی۔ کیونکہ قریب آٹھ صدیوں تک یہاں کے مسلم فرماں روا اس ملک کی تواریخ کے صفحے اپنے کارناموں سے پوری طرح بھرتے رہے ہیں۔ لیکن ہندوستان کی پرانی زندگی اس مدت دراز کے طوفان کو جو بسا اوقات شدت کی آندھی کی طرح بھی چلی ہے جھیل گئی، اور اب تک برداشت کرتی رہی ہے مگر اس کے اثر سے بدلی بہت کم ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اکبر جیسے دلیر لوگوں کی کوششوں کے باوجود بھی ہندوؤں اور مسلمانوں میں سچی یادائمی اتحاد قائم نہیں ہوسکا۔

اگرچہ ابتدائی حملہ آور یعنی ترکی۔ فارسی۔ افغانی اور مغل غیر ملکی تھے۔ تاہم ہندو عورتوں کے ساتھ بیاہ شادی اور غلط ملط کے باعث ہندوستان کے موجودہ مسلمان ہندی ہونے کے لحاظ سے ہندوؤں سے کم نہیں ہیں۔

اس عہد کا یہ نہایت ہی مختصر خاکہ جو ہم مجبوراً دو مختصر فصلوں میں پیش

کرنا چاہتے ہیں لازمی طور پر بادشاہوں کے تاریخی سلسلہ اور ان کے دربار اور فتوحات کے رو کھے پھیکے بیان پر مشتمل ہوگا۔

ہندوستان کے مسلمان فاتحوں میں عربوں کا شمار نہیں ہے یہ سچ ہے کہ ہندوستان کی عیش وعشرت اور دولت کی کثرت کے بیانات سن کر اس طرف وہ متوجہ ہوئے اور ساتویں صدی میں مغربی ساحل پر سمندری علاقہ تک کئی حملے بھی کئے لیکن چونکہ ان کا مقصد محض لوٹ مار تھا لہذا انہوں نے اپنی فتحیابی کا کوئی دائمی نشان نہیں چھوڑا ان عربی حملوں میں زیادہ شاندار حملہ محمد ابن قاسم کا تھا۔ یہ سترہ برس کا جوشیلا نوجوان کلدیہ سے ایک منتخب سپاہیوں کی جماعت لے کر مکران کی راہ سے فارس کے ساحل سے ہوتا ہوا سندھ پہنچا اور ۷۱۲ء میں ملتان فتح کر لیا لیکن خلیفہ اس سے کسی بات پر ناراض ہوگیا اور اسے واپس بلاکر شاہی عتاب کے زیر حکم قتل کر ڈالا۔ اس ابتدائی حملہ کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

محمود غزنوی ۹۹۷ء سے ۱۰۳۰ء

عربوں سے جو کام نہ بن پڑا ترکوں نے اسے پورا کر دکھایا لیکن ہندوستان پر چڑھائی کرنے کا مقصد ترکوں کا یہ نہیں تھا کہ اس ملک میں اسلام پھیلایا جائے بلکہ یہ جس طرح ہوا ہم ذیل میں بتاتے ہیں۔

بغداد کے خلفاء عباسیہ نے لوگوں کی سازشوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لئے نوجوان اور مضبوط ترکوں کا دستہ اپنے پہرے کے لئے مقرر کیا۔ ان ترکوں نے آخر کار اپنے آقاؤں کو دبا لیا اور اس قدر با اثر ہوگئے کہ ان کی دیکھا دیکھی اور بھی ترک شمال سے نکل کر دولت کی تلاش میں وہاں پہنچ گئے۔

اس قسم کا ایک جانباز اور آوارہ گرد الپتگین شمالی ایران میں اپنے

آقا سے بھاگ کر افغانستان میں گھس آیا اور ایک چھوٹی سی سلطنت قائم کر لی کہ جس کا صدر مقام اس نے غزنی مقرر کیا یہ واقعہ سنہ ۹۶۲ء کا ہے۔

سبکتگین اس کا غلام جو اس کی جگہ تخت پر بیٹھا پہلا مسلمان بادشاہ ہے کہ جس نے شمال مغرب کے بلند پہاڑوں کی گھاٹیوں کی راہ سے ہندوستان پر چڑھائی کی کہ جن راستوں سے قدیم آرین قوم اور سکندر اعظم ملک ہند میں داخل ہوئے تھے اور اگرچہ سبکتگین نے پنجاب کے راجہ جے پال کو بار بار شکست دی لیکن اپنی ان فتحیابیوں سے فائدہ اٹھا کر آگے نہیں بڑھا۔

سنہ ۹۹۷ء میں سبکتگین کا بیٹا محمود اس کی جگہ بادشاہ ہوا کہ جس میں اپنے باپ کی جواں مردی اور سرگرمی کے علاوہ مذہبی جنون بھی پایا جاتا تھا تخت نشینی کے موقعہ پر جب خلیفہ نے مبارک بادی اور اپنی خوشنودی کا پیغام بھیجا تو وہ خوشی کے مارے پھولے نہ سمایا اور ہر سال ہندوستان کے بت پرستوں کے خلاف جہاد کرنے کی اس نے نیت باندھی اور اس کی یہ نیت قریباً پوری ہوتی ہوئی سمجھنی چاہئے۔ سنہ ۱۰۰۰ء اور سنہ ۱۰۲۶ء کے درمیان اس نے سترہ مرتبہ ہندوستان پر حملہ کیا اور دریائے سندھ اور گنگا کے درمیان کے تمام حصوں کو چھان ڈالا۔ یہ سچ ہے کہ ہماری تحقیقات کا مدار اسلامی تاریخ پر ہے اور یہ ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ محمود ظالم نہیں تھا اور کہ بیدردی کے ساتھ لوگوں کے قتل عام کا وہ روادار نہیں تھا اور تاہم انہیں کی کتابیں بتاتی ہیں کہ اس نے اپنی زندگی میں لاکھوں ہندوؤں کا قتل کیا اور ان کی ایک کثیر تعداد قید کر کے غلام بنا کر لے گیا۔ لوٹ مار کی حرص نے اس کے لوگوں کو اچھا سپاہی بنا دیا تھا ایک مرتبہ اس نے کانگڑہ کے قلعہ پر فوج کشی کی کہ جہاں ہندو رؤسا اپنی دولت محفوظ رکھتے تھے اور یوں دولت اور جواہرات کا بہت بڑا خزانہ یہاں

اس کے ہاتھ آیا۔ مسلم مورخوں کی مبالغہ آمیز باتیں اگر نہ بھی تسلیم کی جائیں پھر بھی یہ ماننا پڑے گا کہ وہ کثرت سے غنیمت کا مال ہندوستان سے غزنی لے گیا۔

غرض کہ وہ بار بار ہندوستان کے میدانوں میں اترتا اور بار بار بادشاہوں اور ان کے محلوں کو تاخت و تاراج کرتا مندروں کو ڈھاتا اور بتوں کو توڑتا واپس چلا جاتا۔ یہاں تک کہ سارے ملک میں اس کی دھاک بیٹھ گئی اور اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس نے اپنے لئے غازی اور بُت شکن کا خطاب حاصل کیا۔

ان غارت گر حملوں کے مقابلہ میں ہندوؤں نے یہ افسوس ناک مظاہرہ دکھایا کہ اگرچہ ان کا شمار مسلمانوں سے کہیں زیادہ تھا لیکن باہمی حسد اور پھوٹ کے باعث ان میں مسلمانوں کے مقابلہ کی تاب نہیں تھی۔ ہندوؤں کی فوج کا یہ حال تھا کہ ہر راجہ اپنے ہی سپاہیوں کا افسر ہوتا اور یوں ان کی فوج مختلف راجاؤں کی ماتحتی میں بٹی ہوتی کہ جو غنیم کے آنے پر عجلت کے ساتھ آپس میں اتحاد کر لیتے اور اس لئے شمال کے جوان مرد سپاہیوں کا مقابلہ کرنے کے یہ ناقابل تھیں کہ جو ایک ہی افسر کے زیر کمان متحد ہو کر لڑتے تھے۔ علاوہ اس کے محمود ہمیشہ اپنی سپاہ کے مذہبی جنون اور مالِ غنیمت کی حرص کو بھی ابھار سکتا تھا۔

اس کی سلطنت میں اب ایران کا صوبہ خراسان اور مغرب کی زرخیز زمین بھی شامل تھے یہاں تک کہ اس کی فتوحات اور اس کی دولت کی دھوم سارے مشرق میں مچ گئی۔ دریائے اٹک کے اس پار سے ہزاروں جنگی سپاہ آکر اس کی منت کرتے تھے کہ اسلام کی خاطر اس کی زیر سرداری ان کو لڑنے کا شرف بخشا جائے اور یوں اپنی فوجی طاقت بڑھا کر وہ ہندوستان آیا اور پنجاب کے ہر دریا کو پار کرتا ہوا ہندوؤں کی قدیم عبادت گاہ متھرا کی دیو اور

کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہاں کے مندروں کی سونے چاندی کی مورتوں کو توڑ کر بہت بڑا خزانہ اس نے حاصل کیا۔ اس حملہ میں مقام برن یعنی بلند شہر کے راجہ نے اس کی اطاعت قبول کر لی اور اپنی دس ہزار رعایا کے ساتھ مسلمان ہو گیا۔ اس کے بعد حملوں میں محمود نے قنوج۔ لاہور اور گوالیار پر چڑھائی کی۔

۱۰۲۵ء و ۱۰۲۶ء میں سب سے نمایاں فتح اس نے گجرات کے مندر سومنات پر قبضہ کر کے حاصل کی۔ کہتے ہیں کہ اس بیش قیمت مندر میں کہ جس کے ایک ہزار برہمن پجاری تھے۔ ایک لاکھ لوگ پوجا کرنے کی غرض سے جمع ہوا کرتے تھے۔ اس کی شہرت اور اس کے جواہرات کی کثرت نے محمود کو ملتان سے چل کر راجپوتانہ کے ریگستان کو سخت کوچ کی زحمت اٹھا کر پار کرنے پر راغب کیا اور وہاں پہنچ کر اس کے محافظوں کی حیرانی اور سراسیمگی کے درمیان اسے ڈھا دیا اور اپنے ساتھ اس کا مشہور پھاٹک اور کئی کروڑ کا خزانہ لے کر واپس غزنی گیا۔

سب سے بڑھ کر اس کے اس کام کے سبب فی زمانہ مسلمان محمود کو اسلام کا غازی سمجھ کر یاد کرتے اور اس کی عزت کرتے ہیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ اگرچہ اس نے پنجاب کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ تاہم ہندوستان پر قبضہ کر لینے کا کوئی دعوےٰ اس نے نہیں کیا۔ اور یہ اگر وہ چاہتا بھی تو اس کے لئے یہ کام آسان نہ تھا۔ اس کی لڑائیاں خود مختار راجاؤں سے تھیں۔ اس کا مقابلہ کسی ایسے راجا سے نہیں تھا کہ جس کی سرداری کے باقی سب راجہ قائل تھے۔ علاوہ اس کے ہر مہم کے بعد خود وہ اور اس کے ساتھی اپنے وطن کو لوٹنے کے لئے بے قرار ہوتے اور انہیں غزنی اور مغرب کی زرخیز زمین ہندوستان کے گرم میدانوں سے کہیں زیادہ مرغوب تھیں۔ یہ بہادر فاتح

اپنے غزنی کے دربار میں علم و ہنر کی سرپرستی کے لئے بھی مشہور ہے۔ اور جو صاحب کمال اس کی شہرت سن کر اس کے دربار میں حاضر ہوئے۔ ان میں مورخ البیرونی اور فردوسی مصنف شاہنامہ بھی شامل ہیں۔

خاندان غور ۱۱۷۵ء سے ۱۲۰۶ء تک

خاندان غزنی کا زمانہ جلد ختم ہو گیا اس کے زوال پکڑتے ہی مغرب کے دلیر اور جواں مرد حملہ آوروں نے اس کی رہی سہی طاقت اس پر فوج کشی کر کے اور بھی گھٹا دی۔ لیکن یہ حملہ آور ایران ہی میں رہے۔ آخر کار غزنی اور ہرات کے درمیانی مقام غور کے پہاڑی افغانوں نے ۱۱۵۵ء میں اس پر چڑھائی کی اور اپنے کسی انتقام کو پورا کرنے کے لئے غزنی غارت کر کے تمام مردوں کو تہ تیغ کیا اور اب وہاں سوائے محمود کی قبر کے سلطنت غزنی کی پرانی شان و شوکت کا نشان بہت کم پایا جاتا ہے۔

محمود غزنی کے حملوں کے بعد ہندوستان کی اس حالت کو کہ جسے صحیح معنوں میں حالت امن کہنا مشکل ہے پھر ایک صدمہ پہنچا جس شخص نے غزنی کو غارت کیا تھا اس کا بھتیجا معزالدین کہ جو محمد غوری کے نام سے مشہور ہے وہاں کا بادشاہ بن بیٹھا اور یہ بھی محمود غزنوی کی طرح تیس[۳۰] سال تک ہندوستان کے لئے ایک بلا ثابت ہوا۔

تخت پر بیٹھتے ہی اس نے ہندوستان کے ممالک مفتوحہ میں اپنی حکومت کو مستحکم بنانا اور یہاں کی حریف اسلامی ریاستوں کو زیر کرنا اپنا سب سے پہلا کام سمجھا اور چنانچہ اس غرض سے دریائے سندھ کے علاقہ کی قدیم عرب نو آبادی کو اپنے قابو میں کیا۔ ملتان پر قبضہ جمایا اور سندھ فتح کیا ۱۱۸۲ء

میں لاہور کے اضلاع کو اس نے پائمال کیا اور سیالکوٹ کی اس نے مورچہ بندی کی اور یوں سلطنت کی حالت کو مستحکم کرنے کے بعد وہ ہندوؤں کی طرف پھرا کہ جنہیں خود وہ اور مذہبی جنون سے بھرے ہوئے اس کے افغانی سپاہ "واصل جہنم" کرنے کے نہایت ہی خواہشمند تھے۔ بہر حال جب اس نے کوشش کی کہ سرہند پر قبضہ کر کے اپنی سپاہ وہاں رکھے تو جنگ جو راجپوتوں نے اس کا سخت مقابلہ کیا۔ ۱۱۹۱ء میں کرنال سے اُتر کی جانب دس میل کے فاصلہ پر پانی پت کے مشہور میدان جنگ کے قریب دونوں فوجیں آمنے سامنے آئیں۔ جنگی چال بازی کا مقابلہ جنگی چال بازی سے کیا گیا۔ لیکن مسلمانوں نے شکست کھائی۔ اور دریائے سندھ کے اس پار بھاگ کر پناہ لی۔

سلطان کے دل پر اس شکست سے بڑی چوٹ لگی اور انتقام کی قسم کھا کر دوسرے سال ایک لاکھ بیس ہزار سپاہیوں کی فوج لے کر جو افغان ترک اور ایرانیوں سے مرتب تھی ہندوستان کو لوٹا اور اس مرتبہ راجپوتوں نے شکست کھائی اور بڑی بے دردی سے وہ قتل کئے گئے۔ ان کے بہتیرے سردار مارے گئے اور ان کا راجہ بھی ان کے قول کے مطابق واصل جہنم کیا گیا۔ اس فتح سے اجمیر اور دیگر ریاستیں ۱۱۹۲ء میں اسلامی سلطنت میں شامل کر لی گئیں۔ قطب الدین جو محمد غوری کا غلام تھا ہندوستان میں اس کا وائسرائے مقرر ہوا کہ جس نے اپنے آقا کی موت پر سلطنت دہلی کی بنیاد ڈالی۔

اس دوران میں بہتیری اور لڑائیاں ہوئیں کہ جن میں سلطان اور قطب الدین دونوں نے ایک دوسرے کی مدد کی۔ انہوں نے شمالی ہند کے باقی حصہ پر بنارس تک قبضہ کر لیا اور بختیار خلجی مشرق کی طرف آگے کو بڑھتا ہوا چلا گیا یہاں تک کہ بنگالہ کو بھی اس نے مسلمانوں کے لئے دائمی طور پر فتح کر لیا۔

فتح کے جوش میں بھرے ہوئے محمود غزنی کی طرح محمد غوری نے بھی خراسان کی زرخیز زمین کو حریص نگاہ سے دیکھا لیکن جب وہاں سے ہزیمت کھا کر اپنے ملک کو لوٹا تو ساری سلطنت میں بغاوت اور شورش پھیلی ہوئی اس نے پائی۔ غزنی اور ملتان منحرف ہو گئے تھے۔ دشمنوں نے پنجاب کا تاخت و تاراج کر ڈالا تھا بہر حال وفادار قطب الدین کی مدد سے سلطنت کا بہت کچھ حصہ جو اس کے ہاتھ سے جاتا رہا تھا واپس لینے میں کامیاب تو ہو گیا مگر سنہ ۱۲۰۶ء میں مسلمانوں کے ایک بدبختی فرقہ ملاحدہ کے ہاتھوں مارا گیا۔

محمد غوری کو اگرچہ محمود غزنوی کے بہ نسبت شہرت کم حاصل ہے تاہم وہ ہندوستان میں اپنی فتحیابی کا دائمی نشان چھوڑ گیا اور ہندوستان میں خاص کر اپنا ایسا والسرائے اس نے چھوڑا کہ جو ان بہتیرے مسلمان بادشاہوں میں پہلا تھا کہ جنہوں نے دہلی سے ہندوستان پر سلطنت کی ہے۔

سلطنت دہلی سنہ ۱۲۰۶ء سے سنہ ۱۵۲۳ء تک

(۱) خاندان غلاماں سنہ ۱۲۰۶ء سے سنہ ۱۲۹۰ء تک

قطب الدین ان چونتیس بادشاہوں میں پہلا تھا کہ جنہوں نے سنہ ۱۲۰۶ء سے سنہ ۱۵۲۶ء یعنی بابر کے آنے تک دہلی میں سلطنت کی ہے۔ یہ تمام بادشاہ پانچ خاندانوں میں سے تھے کہ جن کی سلطنت یکے بعد دیگرے رہی ہے چونکہ محمد غوری کی کوئی اولاد نہیں تھی اس لئے اس کا غلام قطب الدین اس کی جگہ بادشاہ ہوا۔ اور خاندان غلاماں کی کہ جس میں سب کے سب ترک تھے بنا قائم کی بطور والسرائے اس نے قابل یادگار کارنامے کئے اور بادشاہ ہونے پر اس نے اپنی فتوحات

کو مستحکم کیا۔ مذہب کے اعتبار سے وہ کٹر مسلمان اور خدا کی راہ میں زبردست لڑنے والا تھا۔ اس نے ہر کام وسیع پیمانہ پر کیا اور وہ لاکھ بخش کے لقب سے مشہور تھا۔ اس کا ایک ہم عصر لکھتا ہے کہ "اس کی سخاوت لگا تار تھی اور یہی حال اس کے قتل کا تھا۔" بہرحال وہ بعض اعلےٰ عمارتیں اپنی یادگار میں چھوڑ گیا ہے کہ جو ہندوؤں کے مندروں کے پتھر سے بنے ہیں۔ دہلی کی جامع مسجد اور قطب مینار جو دنیا میں سب سے اونچا منار سمجھا جاتا ہے اس کی ہی یادگاریاں ہیں۔ ۱۲۱۰ء میں اس کی موت پر بڑی گڑبڑی پھیلی اس کا بیٹا تخت پر بیٹھنے کے لائق نہیں تھا اور مختلف غلام بادشاہ بن بیٹھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن التمش نے جو قطب الدین کا بڑا وفادار غلام تھا دہلی پر قبضہ کر لیا اور بڑی کشمکش کے بعد ۱۲۱۷ء میں لاہور کو ایک حریف کے پنجہ سے چھڑایا۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد ایک نیا خطرہ اچانک دریائے سندھ کے اس پار نمودار ہوا۔ یعنے چنگیز خاں ایک قہر کی صورت میں اپنے منگول خانہ بدوش لوگوں کی بڑی جمعیت کے ہمراہ نکل کھڑا ہوا، اور چین کا ایک بڑا حصہ اور وسط ایشیا کی مشہور سلطنتوں کو فتح کر کے آگ اور تلوار سے برباد کرتا ایران میں گھس کر غزنی پر اس نے قبضہ کر لیا۔ دور دور سے لوگ بھاگ کر پہاڑی دروں کی راہ سے ہندوستان میں پناہ گزین ہوئے اور خود ہندوستان کے لوگ اس کی دہشت سے کانپنے لگے لیکن چونکہ انہیں مغرب کی زرخیز زمین زیادہ مرغوب تھی اس لئے یہ بلا ہندوستان پر سے ٹل گئی۔ التمش اس مصیبت سے بچ نکلنے پر اور بھی زیادہ اب محفوظ تھا ۱۲۲۵ء میں حاکم بنگالہ نے اس سے اطاعت کا قول و اقرار کیا۔ ۱۲۳۴ء میں وندھیا پہاڑ کے شمال کا پورا حصہ اس کے قبضہ میں تھا۔ ۱۲۲۹ء میں خلیفہ بغداد نے اس کے سلطان ہونے پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا اور ایک سفارت اس

کے دربار میں بھیجی۔
۱۲۳۶ء میں التمش کا انتقال ہو گیا اور پھر کچھ عرصہ کے لئے ملک میں گڑبڑی پھیل گئی جس کا سبب یہ تھا کہ اس کے لڑکے جو اس کی جگہ بادشاہ بنتے اور جن میں سے بعض نے بادشاہ ہونے کی کوشش بھی کی لیکن وہ سلطنت کرنے کی قابلیت اپنے اندر نہیں رکھتے تھے اور ان کی حالت خراب تھی۔ ۱۲۳۷ء سے ۱۲۴۰ء تک یعنی تین سال تک اس کی ایک لڑکی رضیہ نے حکومت کی لیکن ترک جو ایک عورت کی اطاعت کرنا حقارت سمجھتے تھے اسے سلطنت سے برطرف کرنے میں آخر کار کامیاب ہوئے۔ اس عرصہ میں بلبن نے جو التمش کے چالیس تربیت یافتہ غلاموں میں سے تھا۔ التمش کے تیسرے بیٹے سلطان ناصرالدین کی فوج کا افسر اعلیٰ ہونے کے سبب بڑی ناموری حاصل کی۔ ناصرالدین برائے نام سلطان تھا۔ سلطنت کا سارا انتظام بلبن ہی کرتا تھا۔ بیس برس تک کہ جو زمانہ خوفناک منگولیوں کے حملوں کے اندیشوں اور بغاوت کے خدشوں سے بھرا تھا اس نے اپنے آقا کی خدمت اچھی طرح انجام دی۔ اس نے سرحد کو منگولیوں کے حملوں سے روکے اور ہندوؤں کی شورشوں کو دبائے رکھا اور فتنہ انگیز ترکی افسروں کو وہ قابو میں کئے رہا۔ ۱۲۶۶ء میں ناصرالدین کی موت پر بلبن کا اس کی جگہ بادشاہ ہونا ایک لازمی بات تھی اور ہوا بھی یہی۔ اس کا آقا نہایت رحم دل تھا لیکن بلبن جب اس کی جگہ بادشاہ ہوا تو نہایت سخت دل ثابت ہوا۔ اور تقاضائے وقت بھی یہی تھا کہ سختی کے ساتھ سلطنت کی جائے اس نے قزاقوں کے ساتھ بڑی بے رحمی کا سلوک کیا اور یوں سلطنت کو مستقل فائدے اس نے پہنچائے۔ لیکن سب سے بڑی فکر اُسے منگولیوں کی تھی کہ وہ مبادا سلطنت کے اندر گھس آئیں اور ان کی روک کے لئے قابل سپاہیوں کی ایک

فوج اس نے ترتیب دے رکھی تھی۔

اس عرصہ میں بلبن کا ایک غلام طغرل کہ جسے وہ نہایت عزیز سمجھتا تھا اور بنگالہ کا حاکم بنا دیا تھا۔ خود مختاری کا اچھا موقعہ سمجھ کر باغی بن بیٹھا۔ دونوں فوجیں اس کے مقابلہ پر بھیجی گئیں مگر وہ اس کے حواس درست نہ کر سکیں۔ اس لئے بلبن جو اب ضعیف ہو گیا تھا خود اس کی سرکوبی کو نکلا۔ اور لکھنوتی کے قریب اچانک اسے گھیر لیا۔ اور اس سے سخت بدلہ لیا۔ طغرل کے لڑکوں اور رشتہ داروں اور اس کے شخصی محافظوں کو قتل کرا کر ان کے جسموں کو سولیوں پر لٹکا چھوڑ دیا اور دو دن تک وہاں کے لوگوں کا قتل عام کرتا رہا اور پھر اپنے ایک بیٹے کو بنگالہ کا حاکم مقرر کیا کہ جس کی اولاد ۱۳۳۹ء تک وہاں سلطنت کرتی رہی ۱۲۸۷ء میں بلبن کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ اس کا پوتہ جو بد چلن تھا تخت سلطنت پر بیٹھا مگر ۱۲۹۰ء میں وہ قتل کر ڈالا گیا۔ اور یوں خاندان غلاماں کا خاتمہ ہو گیا۔

(ب) خاندان خلجی ۱۲۹۰ء سے ۱۳۲۱ء تک

بلبن کی موت کے بعد چند برسوں تک کسی زبردست سلطان کے نہ ہونے کے سبب بہت بد امنی پھیل گئی اور اس گڑبڑی کے درمیان ایک خاندان نے جو خلجی کہلاتا تھا زور پکڑا اور جلال الدین خلجی کو کسی حکمت عملی سے دہلی کے تخت پر بٹھا دیا۔ اس خاندان کے لوگ اگرچہ ترکی النسل تھے لیکن یہ افغانستان سے آئے تھے اور عادات و خصلت میں بھی افغانی تھے۔ اس سے اصل ترکوں کو اب زک پہنچی کہ جنہیں لوگ اب پسند نہیں کرتے تھے۔ جلال الدین ستر برس کا بوڑھا تھا اور قزاقوں اور باغیوں پر نہایت ہی مہربان تھا۔ ۱۲۹۶ء میں اس کے بھتیجے علاؤ الدین نے بڑی بے عزتی کے ساتھ اسے قتل کروا دیا اور اس کی جگہ

بادشاہ بن گیا۔ خلجی خاندان کے چھ بادشاہوں میں صرف علاؤالدین ہی نے ہندوستان پر حکومت کرنے کے قابل اپنے آپ کو ثابت کر دکھایا اور اپنی حکومت کے بیس برس کے عرصہ میں اس نے اپنی سلطنت بہت دور تک پھیلا دی تاہم جس طریقہ سے اس نے اپنے تمام حریفوں اور باغیوں کا خاتمہ کیا اس سے وہ ایک ظالم اور خونخوار وحشی معلوم پڑتا ہے۔ دکن پر چڑھائی کر کے جو بڑا خزانہ اس کے ہاتھ لگا تھا اسے فیاضی کے ساتھ انعام و اکرام میں صرف کر کے ایک بڑی فوج اپنے لئے تیار کر لی تھی۔

اس کے عہدِ سلطنت میں منگول کے خانہ بدوش لوگوں نے ۱۲۹۶ء سے ۱۳۰۵ء تک بار بار ہندوستان پر حملے کئے اور ان کی طرف سے وہ ہمیشہ فکرمند رہتا تھا۔

وہ جہاں کہیں جاتا تھا اس کا لشکر فتحیاب ہو کر لوٹتا تھا اور یوں اس کی دولت بہت بڑھ گئی تھی۔ لیکن لڑائیوں میں مالِ غنیمت کا بہت بڑا حصہ خود اپنے لئے لے کر اسلامی شریعت کی حکم عدولی کیا کرتا تھا۔ ایک ہم عصر اس کا لکھتا ہے کہ اس کا چال چلن اور باتوں میں خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو لیکن رحم دلی اس میں مطلق نہیں تھی کامیابی کے نشہ میں وہ اس قدر سرشار تھا کہ وہ اپنے آپ کو سکندر ثانی کہتا تھا۔ لیکن آخر کار اُسے دور دراز کی فتحیابیوں سے اپنی توجہ ہٹا کر اپنی سلطنت کی اندرونی حالت کی طرف اسے منعطف کرنی پڑی۔ اس نے دیکھا کہ اس کے خاندان کے اپنے ہی لوگ باغی ہو رہے تھے اس لئے پہلے ان کا جلد ہی خاتمہ کر ڈالنے کے بعد رعایا پر سختی کے ساتھ محاصل لگا کر ان کی حالت کمزور کر ڈالی اور خاص کر اس نے ہندوؤں کو تو اس قدر دبایا کہ وہ اس کے حکم پر چوہیوں کی طرح فوراً بل میں گھس پڑنے کو تیار رہتے تھے۔

۱۳۰۳ء میں منگولیوں نے دہلی پر حملہ کر کے عنقریب اسے فتح کر ہی لیا ہوتا
اس حملہ سے علاؤ الدین کو پتہ لگ گیا کہ اس کی سلطنت کی حفاظت کے وسائل
کس قدر کمزور ہیں اور فوراً فوجی اخراجات کے ترتیب دینے اور اپنے قلعہ اور اپنی
فوج کی از سر نو تنظیم میں مصروف ہو گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب دوسرے سال
پھر منگولیوں نے اس سے جنگ کی تو ان کا قتل عام کر کے ان کی طاقت اس نے
کچل دی اس موقعہ پر اتنا اور ذکر کر دینا چاہئے کہ منگولیوں کی ایک جماعت شروع
زمانہ ہی میں اسلام قبول کر کے دہلی کے قریب آباد ہو گئی تھی لیکن جس خستہ حالت میں
زندگی بسر کرنے پر یہ مجبور تھے اس سے تنگ آکر انہوں نے سلطنت کے خلاف
سازش کی۔ علاؤ الدین کو جب اس سازش کا پتہ لگا تو اس کے غضب کی کوئی
انتہا نہیں رہی۔ اس نے تمام مردوں کو جن کا شمار تیس ہزار تھا ایک ہی روز میں
قتل کر ڈالا۔ اور تمام عورتوں اور بچوں کو غصہ میں ان کے گھروں سے
باہر نکال دیا۔

اس طرح سازشوں کے خوف سے اور عنقریب میں منگولی حملوں کے اندیشوں
سے آزاد ہو کر علاؤ الدین نے ہندوؤں کی طاقت کو اور بھی ضعف پہنچانے کی
نیت سے رنتھنبور اور چتوڑ کے قلعوں کو راجپوتوں سے لڑ کر لے لیا لیکن اس لڑائی
میں اس کے بہتیرے سپاہی مارے گئے۔ لوگوں میں اب تک مشہور ہے کہ کس
طرح ان راجپوتوں نے میدان جنگ میں جا کر لڑ مرنے سے قبل اپنی عورتوں کی
بھینٹ چڑھائی تھی۔

جنوبی ہندوستان میں لشکر کشی کر کے اس کا دروازہ وہ پہلے کھول چکا تھا
اور اب مالک کافور کی سرکردگی میں اس نے ایک فوج دکن پر چڑھائی کرنے کی
غرض سے بھیجی۔ جس نے ۱۳۰۷ء میں پونا کے قریب مقام دیوا گری پر قبضہ

کر کے اس کے مندروں کو لوٹ لیا اور اس کے راجہ نے مسلمانوں کی اطاعت منظور کر لی۔ اس کے دوسرے سال کافور نے تلینگانہ کے مقام ورنگال پر قبضہ کر کے اس کے راجہ کو خراج دینے پر مجبور کیا۔ ان فتوحات کے ذریعہ بے شمار خزانہ سلطان کے دربار میں بھیجا گیا۔ جواب مقام سیری پر تھا۔ ۱۳۱۱ء میں کافور نے ساحل مالابار کے مقام دوارا سمدرا کو غارت کیا اور اس طرح دکن کا شمالی حصہ سلطنت دہلی کی زیر حکومت آ گیا۔

ان تمام برسوں میں علاؤ الدین نے سختی کے ساتھ حکومت کی اور مے خوری اور فضول خرچی تک کا شمار قابل سزا جرائم میں کیا گیا لیکن اس کی کامیابی اور اس کا غصہ اس کی بربادی کے باعث ہوئے۔ اس کے بیٹے شراب کے عادی بن گئے اور اس کے ارکین سلطنت آپس میں جھگڑنے لگے۔ وہ خود عرصہ تک بیماری میں مبتلا رہ کر ۱۳۱۶ء میں مر گیا اور پھر پانچ سال ہندوستان میں سخت بدامنی کا زمانہ رہا۔ اس کے ایک بیٹے مبارک نے جو نہایت ہی عیاش تھا اپنے بدنمونہ سے بے باکی کے ساتھ برائی کرنے کا زمانہ اپنی عہد حکومت میں شروع کیا۔ آخر کار اس کے ایک منہ لگے خادم نے جو نیچ ذات کے ہندوؤں سے تھا اسے قتل کر ڈالا اور خسرو خاں نام اختیار کر کے بادشاہ بن بیٹھا اور عیاشی اور ظلم میں اپنے آقا پر بھی سبقت لے گیا۔ اور تب چار مہینے تک بدترین مظالم ہوتے رہے کہ جن کی نظیر ہندوستان میں ملنی مشکل ہے۔ غازی ملک تغلق جو ایک کم رتبہ ترک تھا علاؤ الدین کی طرف سے پنجاب کی محافظت پر مقرر تھا۔ اس نے موقعہ کو قابو میں کر کے ۱۳۲۱ء میں خسرو کو قتل کر ڈالا۔

(ج) خاندان تغلق

غیاث الدین تغلق جو تغلق شاہ کے نام سے مشہور ہے بادشاہ ہوتے ہی اپنی سلطنت میں حالت امن قائم کرنے کی تدبیر میں لگ گیا۔ اس نے زمین کا لگان بہت ہی گھٹا دیا کہ جس سے ملک کی خوش حالی بحال ہو گئی۔ عرصہ سے دکن اور بنگالہ میں بغاوت اور شورش پھیلی ہوئی تھی اور ان کے فرو کرنے کے لئے اس نے شہزادہ جونا کو دکن کی مہم پر روانہ کیا کہ جو علاقے ہاتھ سے نکل گئے ہیں ان پر پھر قبضہ کرے۔ جونا جب دکن کی مہم سے کامیاب ہو کر لوٹا تو دہلی میں اسے اپنا نائب مقرر کر کے خود ایک فوج لے کر بنگالہ کی طرف روانہ ہوا جہاں ناصر الدین بلبن کے پوتے کا بیٹا حکمران تھا۔ غیاث الدین کے وہاں پہنچنے پر اس نے فوراً اطاعت منظور کر لی اور جب وہ دہلی واپس آیا تو ایک حادثہ کے سبب اس کا انتقال ہو گیا۔ یہ واقعہ ۱۳۲۵ء کا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ حادثہ جونا کی خود اپنی سازش کا نتیجہ تھا۔ غرض کہ جونا غیاث الدین کی موت پر سلطان محمد تغلق کے نام سے تخت سلطنت پر بادشاہ بن بیٹھا۔

اس نئے سلطان میں بڑے بڑے خیالات تھے۔ یہ ایک فاضل شخص کا سا تربیت یافتہ دماغ رکھتا تھا اور اپنے ارادے کا پکا تھا پھر بھی اپنی تیز مزاجی اور بے صبری کے سبب وہ بری طرح ناکامیاب رہا اور اگرچہ وہ انعام دینے میں فیاض اور حوصلہ کا بلند تھا تاہم اس کی رعایا کو اس سے نفرت تھی کہ جس کے عوض ان سے شیطانی انتقام اس نے لیا۔ مورخ ابن بطوطہ سلطان کی بے رحمیوں کا ذکر جو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ایسے الفاظ میں

کرتا ہے کہ جسے پڑھ کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اس کی فضول خرچی کی یہ حالت تھی کہ اس نے سلطنت کا خزانہ خالی کردیا۔ ایک مرتبہ اس نے ایک بڑا لشکر ایران اور چین فتح کرنے کے لئے تیار کیا اور اس کے اخراجات پورا کرنے کو لوگوں پر اسے سخت محاصل لگانے پڑے کہ جن سے تنگ آکر دوآبہ کی رعایا کہ جن میں زیادہ تر ہندو تھے اپنے اپنے کھیتوں کو چھوڑ کر جنگلوں میں بھاگ گئے لیکن سلطان کی فوج نے انہیں اس طرح گھیر کر کہ جس طرح جانوروں کو گھیر ہیں سب کو قتل کرڈالا۔

بادشاہ اور رعیت دونوں کی حالت اب بالکل خراب تھی اور اس موقعہ پر سلطان نے ایک نئی اور بڑی بات سوچی لیکن جیسے بے وقوفوں کی طرح اس نے پورا کرنا چاہا۔ اپنی وسیع سلطنت کا دارالحکومت ایک مرکزی مقام میں تبدیل کرنے کی غرض سے اس نے دیوگری کو دولت آباد کے نام سے بسا کر دارالحکومت قرار دینا چاہا۔ لیکن اس نے اس پر اصرار کیا کہ دہلی جیسے وسیع شہر کی پوری آبادی کو اس کے ساتھ اس نئے شہر میں جانا چاہئے۔ اب یہ سات سو میل کی مسافت کا طے کرنا کوئی آسان کام نہ تھا اور بہت سے لوگ یا تو بیماری سے یا مایوسی کے باعث راستہ ہی میں مرگئے۔ تغلق کو آخر کار اپنی غلطی کا احساس ہوا اور لوگوں کو دہلی واپس بلاکر ان کی حالت بحال کرنے کے لئے جو کچھ اس سے بن پڑا اس نے کیا لیکن پھر بھی دہلی کو آگے کی طرح بحال کرنے کے لئے دیگر مقامات سے لوگوں کو لاکر وہاں بسانا پڑا۔ ابن بطوطہ کو دہلی اس موقعہ پر اجڑا ہوا لگتا تھا۔

ان انسدادی تدبیروں سے پھر اس کا خزانہ خالی ہوگیا اور اس نے ایک اور بڑی تدبیر سوچی کہ جس پر عمل کرنے میں اس نے پھر عقل سے کام نہیں لیا یعنی

اس نے تانبہ کا سکہ چلایا مگر اس کے انجام کو نہ سوچا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر گھر ٹکسال بن گیا اور کروڑوں جعلی سکے چل پڑے اور تب جھنجلا کر اس نے یہ حکم منسوخ کر دیا اور تمام تانبے کے سکے واپس لے لئے اور انکے عوض لوگوں کو سونا اور چاندی اس نے دیا۔ اس قسم کی تلون مزاجی کے ساتھ اس کے تجربے نے اسے لوگوں میں بدنام کر دیا۔ اور جب اپنی سلطنت کے تمام حصوں میں بغاوتوں کے پھیلنے پر وہ نہایت برانگیختہ ہوا۔ اور بڑی بے دردی کے ساتھ ان کو کچل ڈالنا چاہا تو اس کی بدنامی اور بھی بڑھ گئی۔ پہلے اس کی سلطنت اس قدر وسیع تھی کہ اس سے پیشتر کسی اور مسلمان حکمران نے ہندوستان کے اس قدر بڑے حصے پر کبھی سلطنت نہیں کی تھی۔ اس وقت اسکی حکومت تیئیس صوبوں پر تھی جو دریائے سندھ سے لے کر بنگال کے مقام سونار گاؤں اور لاہور سے لے کر ساحل ملیبار کے مقام دوار اسمدرا تک پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن اب ایک ایک صوبہ خود مختار ہونے لگا اور سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ ان صوبوں میں بنگالہ نے اکبر کے عہد حکومت تک اپنی خود مختاری قائم رکھی۔ جب یہ خبطی سلطان گجرات میں بغاوت کے فرو کرنے میں مصروف تھا تو ۱۳۵۱ء میں بخار سے مر گیا۔

ارا کین سلطنت نے محمد شاہ تغلق کے ایک بھتیجے فیروز شاہ تغلق کو تخت سلطنت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ اس کی سینتیس ۳۷ سالہ عہد حکومت میں ایک مرتبہ بھی بغاوت نہیں ہوئی۔ فیروز شاہ اور محمد شاہ تغلق میں بہت بڑا فرق تھا۔ یہ نیا بادشاہ اس قدر رحم دل اور ہمدرد تھا کہ اس کی ساری رعایا اس سے خوش تھی۔ تاہم جو صوبے سلطنت دہلی کے قبضہ سے نکل چکے تھے ان کو دوبارہ حاصل کرنے کی غرض سے وہ عرصہ تک نہایت دشوار لڑائیوں کے باعث دار السلطنت سے باہر رہا کہ جن میں سے بہتیری لڑائیوں میں

اسے کامیابی ہوئی۔ اسی سلسلہ میں ۱۳۵۳ء میں اس نے بنگالہ پر چڑھائی کی کہ جہاں ایک بڑی لڑائی ہوئی کہ جس میں کہتے ہیں کہ ایک لاکھ اسی ہزار دشمن کے سپاہی مارے گئے۔ دہلی سے جب وہ غیر حاضر ہوتا تو اس کا وزیر خان جہاں جو ہندوؤں میں سے مسلمان ہوا تھا سلطنت کا کام اچھی طرح چلاتا تھا۔ بادشاہ کی صلح کن طرز حکومت کا سبب یہی خانِ جہاں ہی تھا۔ فیروز شاہ کو عمارتوں کے بنانے کا بہت شوق تھا اور اس نے کئی ایک نئے شہر بسائے چنانچہ اپنے بھانجے کی یادگار میں جو اس سے قبل بادشاہ تھا اس نے جونپور بسایا۔ اور ان کے علاوہ نہریں کھدوا کر اس نے اپنی رعایا پر بڑا ہی احسان کیا اور علماء کو بڑی فیاضی کے ساتھ اس نے عطیئے دئے۔ اور خدا پرستوں کے لئے بہت کچھ وقف کر دیا لیکن اپنے اراکین سلطنت کو زمین کے بہت بڑے قطعات دے کر اس نے غلطی کی۔ کیونکہ اس سے وہ رفتہ رفتہ خود مختار بن بیٹھے اور تخت سلطنت کے لئے خطرہ پیدا ہو گیا۔ اپنے ان جاگیرداروں سے سلطان غلاموں کی ایک بڑی تعداد کا مطالبہ کرتا تھا جو اسے دی جاتی تھی۔ کم از کم ایک لاکھ اسی ہزار ایسے غلام سرکار سے تنخواہ پاتے تھے۔ ۱۳۸۸ء میں فیروز شاہ نوّے برس کی عمر میں انتقال کر گیا۔

(د) صوبجاتی حکومتیں

فیروز شاہ کی موت پر عرصہ تک بدامنی پھیلی رہی۔ قدیم سلطانوں کی مطلق العنان حکومت کو فیروز شاہ کی نرم دلی کے باعث لوگ بھول گئے تھے اور ہر طرف خود مختاری کی روح پھیلی ہوئی تھی۔ سر چڑھے غلام کہ جن کے پاس جاگیریں تھیں پرانے ہندو سرداروں کو بغاوت پر اکسا رہے تھے۔ کیونکہ

ان میں سے بہتیرے غلاموں نے برائے نام ہندو مذہب ترک کر کے اسلام قبول کیا تھا۔ اور تب دس برس تک سلطنت پر نالائق اولاد حکمران رہی کہ جو محض پتلیوں کی طرح بادشاہ بنائے جاتے اور پھر اتار دیئے جاتے۔

سلطنت کی اس پریشان حالت کے درمیان تیمور جو سمرقند کا ایک ترک تھا چنگیز خاں کی مانند ایک بلا کی طرح ہندوستان پر ٹوٹ پڑا اور اس کا نام ایک ضرب مثل بن گیا۔ مذہب کا وہ مسلمان تھا مگر ظلم میں مجسّم بے رحم تھا۔ جو چیز اسے ہندوستان کھینچ لائی وہ یہاں کی دولت کی حرص ہی نہیں تھی بلکہ کافر ہندوؤں کو جہنم واصل کرنے اور اس ملک کو شرک کی گندگی سے پاک کرنے کا پختہ ارادہ تھا کہ جو ہزار ہزار گھوڑے کے بیانوے[92] رسالوں کے ساتھ ۱۳۹۸ء میں اسے یہاں لے آیا۔ اس کی بے رحمیوں کے دردناک واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ ایک گھنٹہ میں اس کے سپاہیوں نے دس ہزار ہندوؤں کو قتل کر ڈالا کہ جو بھاگ کر راجپوتوں کے قلعہ بھٹنیر میں پناہ گزین ہوئے تھے۔

پنجاب کے لوگ اس کی آمد پر خوف زدہ ہو کے اِدھر اُدھر بھاگ گئے ۱۷ دسمبر کو دہلی کے سامنے اپنا لشکر ڈال کر پڑ گیا یہاں فیصلہ کن لڑائی ہونے کے قبل اس نے کم از کم ایک لاکھ ہندوؤں کو جو فوج کی عقب میں قیدی تھے بیرحمی سے قتل کر ڈالا۔ دہلی کے سلطان کی فوج تیمور کے سپاہیوں کی تعداد اور اس کی اعلیٰ سپہ سالاری کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ تیمور نے جھوٹی خدا ترسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ترکی سپاہی اس کے قابو سے باہر تھے۔ تین دن تک دہلی قتل گاہ بنا رہا۔ صرف شہر کا وہ حصہ جہاں مسلمانوں کے مذہبی سردار رہتے تھے اس کی خون ریزی سے محفوظ رہا۔ پھر اس نے میرٹھ

کو غارت کیا اور تمام مردوں کو تہ تیغ کر کے عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا کر اور بے شمار غنیمت کا مال ساتھ لے کر ہردوار سے ہوتا ہوا ۱۳۹۹ء کے مارچ مہینہ میں ہندوستان سے نکلا۔ لاکھوں کافروں کو اپنے کہنے کے مطابق "واصلِ جہنم" کر کے اس نے اپنا عہد پورا کیا لیکن اپنے پیچھے قحط اور وبا چھوڑ گیا۔ شمالی ہندوستان میں ہر طرح کی حکومت کو اس نے اس طرح برباد کیا۔ کہ پچاس برس تک یہاں کوئی باقاعدہ سلطنت نہیں تھی۔ یہ سچ ہے کہ چند شہزادے جو محمد صاحب کی نسل سے ہونے کے مدعی تھے چھوٹی سی سلطنت پر یکے بعد دیگرے ۱۴۱۴ء سے ۱۴۵۱ء تک حکومت کرتے رہے لیکن انہوں نے سلطان کا خطاب کبھی اختیار نہیں کیا۔ یہ خاندان سید کہلاتا ہے۔

دہلی۔ خاندان لودی ۱۴۵۱ء سے ۱۵۲۶ء

آخر کار صوبۂ پنجاب کا حاکم ایک افغان بنام بہلول لودی ۱۴۵۱ء میں سلطان بن گیا۔ اس نے جونپور پر پھر قبضہ کیا کہ جو تیمور کے حملوں کے وقت خود مختار ہو گیا تھا اور اپنے ایک بیٹے باربک کو وہاں کا بادشاہ مقرر کیا۔ ۱۴۸۹ء میں بہلول کا چھوٹا بیٹا سکندر لودی بادشاہ ہوا اور اس نے جونپور کا الحاق سلطنت دہلی سے کر لیا وہ ایک نیک دل حکمران معلوم پڑتا ہے۔ پھر بھی ہندوؤں کے ساتھ اس کی دشمنی کا ہونا اس کی حکومت کی ایک خاص بات تھی اس نے آگرہ کو کہ جسے محمود نے برباد کیا تھا پھر بحال کیا اور اس کے قریب ہی ایک مقام کا نام اپنے نام پر سکندرہ رکھا۔ ۱۵۱۷ء میں اس کی جگہ ابراہیم لودی بادشاہ ہوا لیکن بہت ہی جلد افغانی ارالکین سلطنت کا اس سے جھگڑا ہو گیا کہ جنہوں نے اس کے برتاؤ سے تنگ آ کر کابل کے

بادشاہ بابر سے مدد طلب کی۔ بابر فوراً ان کی درخواست پر نکلا اور ۱۵۲۶ء میں پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودی کو شکست فاش دی۔

بنگالہ

ہندوستان کے دوسرے حصوں کی ریاستیں کہ جو دہلی کی حکومت سے آزاد ہوکر خود مختار ہوگئی تھیں ان میں سے صرف پانچ کا ذکر ہم مختصر طور پر کریں گے۔ صوبۂ بنگالہ عرصہ سے خود مختار تھا لیکن اس کی حکومت حریف بادشاہوں پر بٹی تھی۔ ایک مشرقی بنگالہ میں ڈھاکہ کے قریب سنار گاؤں میں حکمران تھا اور دوسرا ہگلی کے نزدیک سات گاؤں میں حکومت کرتا تھا لیکن ۱۳۵۲ء میں یہ دونوں ریاستیں ایک ہوگئیں۔ ۱۴۴۲ء میں اس متحدہ حکومت کا دارالسلطنت لکھنوتی قرار پایا۔ کہ جس کا نام گوڑ اور بعد میں جنت آباد رکھا گیا۔ اس سلطنت میں بہار کا کچھ حصہ۔ اڑیسہ۔ تپرہ۔ کامروپ اور چٹا گاؤں شامل تھے لیکن ۱۲۰۲ء سے یعنی محمد غوری کے عہد حکومت سے لے کر اکبر کے فتح بنگالہ یعنی ۱۵۷۶ء تک جو فرماں روا یہاں یکے بعد دیگرے ہوتے رہے ان کے حالات کا کم پتہ لگتا ہے۔

جونپور

جونپور کی ریاست جو "مشرقی بادشاہوں" کی عملداری کہلاتی تھی۔ اپنی عمارتی یادگاروں کے سبب کل ریاستوں میں زیادہ مشہور تھی اور اپنی وسعت کے لحاظ سے گنگا کے شمال میں دہلی سے لے کر صوبۂ بنگالہ کی سرحد یعنی بنارس تک پھیلی تھی۔ اسلامی تواریخ کے نقطۂ نگاہ سے اس ریاست

کی اہمیت اس بات میں تھی کہ یہ ہندو مذہب کے مرکز میں قائم تھی۔ ابراہیم شاہ حبشی کی حکومت ۱۴۰۱ء سے ۱۴۴۰ء تک رہی۔ اپنی عمدہ عملداری کے سبب خیر خواہ حکمران مانا گیا۔ اور صنعت و حرفت اور فنِ معماری کی سرپرستی کے لئے مشہور ہوا۔ جونپور میں اٹالہ دیوی کی مسجد اس کی صنعت معماری کا کمال ہے۔

مالوہ

یہ ریاست جو اب وسط ہندوستان کی ریاستوں کا ایک حصہ ہے تیمور کے حملوں کی گڑبڑی کے وقت قائم ہوئی۔ فیروز شاہ کا ایک جاگیردار دلاور خاں جو محمد غوری کی نسل سے تھا ۱۴۰۱ء میں خود مختار بن گیا اور اپنی عملداری کو اس قدر وسعت دی کہ ہندوؤں کی قدیم سلطنت مالوہ اس میں شامل ہو گئی دہلی۔ جونپور اور گجرات کی حملہ آور سلطنتوں سے گھرے ہونے کے سبب یہ ریاست جنگ میں بہت مصروف رہی اور خاص کر چتوڑ کے راجپوت راجاؤں سے یہ بہت لڑی۔ ۱۴۴۰ء میں آخر کار چتوڑ کے ایک راجہ نے اسے شکست فاش دی اور اس وقت سے راجپوت مالوہ پر حکمران رہے یہاں تک کہ ۱۵۳۱ء میں یہ گجرات میں شامل کر دی گئی۔

گجرات

گجرات کی زرخیز ریاست شمال میں ریگستان اور مشرق میں وندھیا پہاڑیوں کے ذریعہ محفوظ ہونے کے سبب عرصہ تک مسلمانوں کے حملوں

کا مقابلہ کرتی رہی۔ ہم پڑھ چکے ہیں کہ ۱۰۲۴ء میں محمود غزنوی نے اس پر چڑھائی کی اور سومنات کے مندر کو لوٹا لیکن دہلی کے ساتھ اس کا الحاق ۱۲۹۷ء میں ہوا۔ ایک خود مختار اسلامی ریاست کی حیثیت میں اس کے ظاہر ہونے کا سبب ۱۳۹۶ء میں ظفر خاں کی بغاوت ہے کہ جو راجپوت سے مسلمان ہوا تھا اور جسے فیروز شاہ نے جاگیر عطا کی تھی۔ اس نے رفتہ رفتہ اپنی ریاست کو بڑھا لیا۔ اس کا بیٹا احمد شاہ ۱۴۱۱ء سے ۱۴۴۱ء تک حکمران رہا۔ اور اسی نے درحقیقت احمد نگر اور احمد آباد بسا کر یہ سلطنت قائم کی۔ گجرات کے بادشاہوں کے پاس ان کی بندرگاہوں کی حفاظت کے لئے جہازوں کا ایک بیڑا بھی تھا اور پرتگیزوں سے ان کا ہمیشہ مقابلہ ہوتا رہتا تھا۔ مصر کے سلطان نے گجرات کے بادشاہ کی مدد کے لئے جہاز بھیجے تھے کیونکہ ہندوستان اور مصر کے تجارتی تعلقات کو پرتگیزوں سے سخت خطرہ تھا۔ آخر کار پرتگیزی فتحیاب ہوئے اور گوا اور دوسرے مقامات پر انہوں نے اپنا قبضہ کر لیا۔

دکن

محمد تغلق کی حکومت کے آخری برسوں میں جب کہ عام بغاوت پھیل رہی تھی۔ ایک افغان بنام حسن گنگو نے جو جنوبی ہندوستان کی اسلامی فوج میں ترقی کرتا ہوا اعلیٰ عہدے تک پہنچ گیا تھا۔ سلطان کے سپاہیوں کو شکست دی اور ۱۳۴۷ء میں خود دکن کا بادشاہ بن بیٹھا۔ اس نے بہمنی سلطنت قائم کی جس میں محمد تغلق کے وہ مقبوضات بھی شامل تھے جو اس نے ہندوؤں سے فتح کئے تھے۔ اس کے جنوب میں وجیانگر کی وسیع سلطنت

پھیلی ہوئی تھی جو ہندو مذہب کی آخری پناہ تھی۔ اس سلطنت سے حسن گنگو اور اس کے جانشینوں کی برابر لڑائی رہی۔ مسلمانوں نے اپنے دشمنوں کو زمین کے کسی حصہ پر قبضہ کرنے نہیں دیا۔ بلکہ اس کے برعکس ہندوؤں کے ہر حملہ کا وہ پورا انتقام لیتے رہے۔ حسن گنگو کے بیٹے محمد اوّل نے ایک مرتبہ ساحل کرناٹک پر حملہ کیا اور قریب پانچ لاکھ ہندوؤں کو ہلاک کر کے اس مقام کو اجاڑ کر ڈالا۔ آخر کار پندرھویں صدی کے آخر میں حکومت کا ایک نظامت کی تحت نہ ہونے کے سبب اور کسی زبردست حکمران کے نہ ہونے کے باعث سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے شروع ہو گئے۔ مختلف حکمرانوں نے شاہ کا خطاب اختیار کر کے بیجاپور۔ گولکنڈہ۔ بیدر۔ احمدنگر اور برار پر سلطنت کرنی شروع کی۔ یہ چھوٹی سلطنتیں مغلوں کی آمد تک قائم رہیں۔

تیسری فصل

دسویں صدی سے ہندوستان میں اسلام

(۲) سلطنت مغلیہ ۱۵۲۶ء سے ۱۷۶۴ء

بابر ۱۵۲۶ء سے ۱۵۳۰ء

کابل کا شہنشاہ بابر جب ہندوستان پر چڑھائی کرنے کو بلایا گیا تو اسکی طبیعت یہ دعوت بخوشی قبول کرنے کو راغب تھی۔ شروع ہی سے وہ عالی حوصلہ تو تھا مگر اس کا حوصلہ پورا نہیں ہوتا تھا۔ اس کی رگوں میں چنگیز خاں منگولی (کہ جس سے لفظ مغل نکلا ہے) اور تیمور ترکی کا خون دوڑ رہا تھا کہ جس کے باعث اس کی فطرت میں عجیب وغریب ہمت پائی جاتی تھی۔ وہ اپنی اعلیٰ ذہنیت اور فنون کی سرپرستی کے لئے بھی مشہور تھا۔

اگرچہ دور سمرقند میں تیمور کے تخت سلطنت کا بابر حقدار تھا۔ تاہم بار بار وہاں سے نکالا گیا تھا۔ اور اب کچھ برسوں سے کابل کی چھوٹی سی سلطنت پر اس نے قناعت اختیار کر لی تھی۔ ۱۵۱۲ء میں اس نے اپنی نظر مشرق کی طرف کی اور ہندوستان میں اپنے بلند حوصلوں کو پورا کرنے کا اسے وسیع میدان نظر آیا۔ ۱۵۲۴ء میں پنجاب پر وہاں کے

لوگوں کو سزا دینے کی غرض سے چڑھائی کرنے کے بعد آخر کار ۱۵۲۵ء
کے نومبر مہینہ میں اپنی فوج لے کر ہندوستان میں داخل ہوا۔ اور ۱۵۲۶ء
کے اکیس اپریل کو پانی پت کے مشہور میدان میں وہ سلطان ابراہیم لودی
کے لشکر سے کہ جن کی سپاہ کا شمار اس کے اپنے سپاہیوں سے کہیں زیادہ تھا
فیصلہ کن لڑائی لڑا۔ ابراہیم لودی کو جسے اپنی کامیابی پر بہت ہی بھروسہ
تھا۔ بڑی خونریزی کے ساتھ شکست کھا کر بھاگنا پڑا اور بابر فوراً دہلی اور
آگرہ پر قبضہ کر کے ایک نئے خاندان کا پہلا شہنشاہ بنا۔

مال غنیمت جو کثرت کے ساتھ اس کے ہاتھ لگا تھا نہایت ہی
فیاضانہ طور سے اپنے ہر سپاہی پر اس نے تقسیم کر دیا اور سب سے
بڑا حصہ اپنے بیٹے ہمایوں کو دیا۔ پھر بھی اس کے لوگ ہندوستان میں اکتا
گئے اور کابل واپس جانا چاہتے تھے۔ لیکن بابر نے ہندوستان میں ہی رہنے
کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں عجیب طور سے لوگ اس کی
حمایت پر متحد ہو گئے۔ یہاں تک کہ افغانیوں نے بھی جو ہندوستان
میں اس کی آمد سے ناخوش تھے اس کا ساتھ دینا منظور کر لیا۔ بابر کو
اپنے لوگوں کی مدد عین وقت پر ملی۔ کیونکہ چتوڑ کا رانا بہادر راجپوتوں کی
متحدہ فوج لے کر اس کے مقابلہ کو چڑھا چلا آرہا تھا۔ بابر نے مقام
سیکری کے قریب جو اب فتحپور سیکری کہلاتا ہے نہایت وسیع پیمانہ پر
کافروں سے جہاد کرنے کی تیاری کی۔ راجپوت گھوڑ سواروں کے حملوں
نے مسلمانی سپاہ کے چھکے چھڑا دیئے۔ بابر ایک خاص چال چلا اور عقب
سے ان پر حملہ کر کے اُن کی سخت خونریزی کی اور ان پر فتحیاب ہوا۔ راجپوت

قوم کے بڑے بڑے بہادر میدانِ جنگ میں مارے گئے۔

بہرحال شہنشاہ کو اودھ اور بہار میں افغانی دشمنوں سے اور تکلیف اٹھانی باقی تھی۔ قنوج کے قریب کامیابی کے ساتھ دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے بعد جونپور کے پاس ابراہیم لودی کے بھائی محمود لودی کی ایک بڑی فوج سے لڑنے کو وہ آگے بڑھا لیکن اس کی آمد پر دشمن کی فوج تتر بتر ہو گئی۔ بعض سپہ سالاروں نے اس کی اطاعت منظور کر لی اور بعض اپنی سپاہ کو لے کر بنگالہ کی فوجی طاقت بڑھانے کے لئے وہاں بھاگ گئے۔ گنگا پار کر کے سخت مزاحمت کا مقابلہ کرتے ہوئے بابر کی سپاہ نے دشمن کی فوج کو آگے پیچھے اور دونوں طرف سے گھیر کر ان پر حملہ کیا اور دوسری فیصلہ کن فتح ان پر حاصل کی کہ جس سے افغانیوں کی طاقت مزاحمت بالکل ٹوٹ گئی۔ اپنی زندگی کا آخری سال اپنی سلطنت کے استحکام اور اپنے روزنامچہ تزک بابری کے لکھنے میں اس نے صرف کیا۔ بابر اگرچہ ہمیشہ سے جسم کا مضبوط تھا پھر بھی مسلسل لڑائیوں کے دباؤ اور شراب و افیون کی بری علت کے اثر سے اس کی صحت بگڑ گئی اور ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء کو آگرہ میں انتقال کیا اور اس کی اپنی مرضی کے مطابق اس کا جسم اس کے عزیز کابل کی پہاڑیوں میں سپردِ خاک کیا گیا۔

ہمایوں سنہ ۱۵۳۰ء سے سنہ ۱۵۵۶ء

بابر کے بعد اس کا بڑا بیٹا ہمایوں بادشاہ ہوا۔ یہ تھا تو رحم دل لیکن کمزور اور تلون مزاج ہونے کے باعث سلطنت کے مختلف حصوں کو سنبھالے رکھنے کے ناقابل تھا کہ درحقیقت جنہیں اس کے باپ نے ابھی تک پوری طرح فتح نہیں کیا تھا۔ اس کے اپنے بھائی اس سے بے وفائی

کر رہے تھے۔ کامران نے جو عمر میں اس سے چھوٹا تھا پنجاب پر قبضہ کر لیا تھا اگرچہ سلطان کے نام وہاں حکومت کرنے کا مدعی تھا اور پھر اس کے دشمن صرف اس کے بھائی ہی نہ تھے۔ مشرق میں افغان محمود لودی کے ماتحت پھر آمادۂ جنگ تھے اور جنوب میں گجرات و مالوہ کا بادشاہ بہادر شاہ آگرہ کی طرف بڑھا چلا آرہا تھا۔ خطرہ کے ایسے موقعہ پر ہمایوں جو چال چلا اس سے اس کی حکمرانی کی ذاتی کمزوری ظاہر ہو گئی۔ پہلے تو وہ محمود سے لڑا اور ۱۵۳۱ء میں لکھنؤ کے قریب اسے شکست فاش دی تب اس خوف سے کہ مبادا اس کی عدم موجودگی میں دشمن دارالسلطنت پر حملہ نہ کر دیں اس نے دشمن کا پیچھا کرنا چھوڑ دیا اور اس دوسرے اندیشہ کا تدارک کرنے کے لئے واپس لوٹنا چاہا اور مالوہ کی طرف بڑھ کر اس نے اس کے بادشاہ پر پوری فتح حاصل کی۔

لیکن پھر اس نے دشمن کا تعاقب نہ کر کے انہیں قابو میں نہ لایا۔ اور اس لئے جوں ہی اس نے اپنی پیٹھ پھیری وہ اس کی اطاعت سے پھر گئے۔ اس دوران میں شیر شاہ جو ایک مقتدر افغانی رئیس تھا بنگالہ کی سرحدوں پر مالک بن بیٹھا اور محمد سلطان نے قنوج میں بادشاہ کا لقب اختیار کر لیا۔ یہ ساری باتیں شہنشاہ کی کوششوں کا ماحصل تھا۔

سال بھر آگرہ میں عیش و عشرت منانے کے بعد شہنشاہ کو بہار میں باغیوں کے ساتھ لڑائی لڑنے کا آخر کار خیال آیا۔ ان باغیوں کا سردار شیر شاہ بنگالہ کے فتح کرنے میں مصروف تھا کہ جس کی اسے مدت سے آرزو تھی۔ شہنشاہ کے بنگالہ پہنچنے سے قبل شیر شاہ نے اپنا تمام خزانہ اور اپنے لوگوں کو وہاں سے ہندوؤں کے قلعہ روہتاس میں فوراً منتقل کر لیا۔ جب ہمایوں بنگالہ پہنچا تو اس نے اس مقام کو افغانیوں کے ہاتھ تباہ اور ویران کیا ہوا پایا۔ اور

اور اس نے چھ مہینے اپنے درباریوں اور فوجوں کے ساتھ رنگ رلیاں منانے میں ضائع کئے۔

اس دوران میں شیر شاہ نے بنگالہ کے ہر راستہ کی ناکہ بندی کر کے ہمایوں کے لئے مراجعت کرنا نہایت مشکل کر دیا۔ اگرچہ ہمایوں کے بھائیوں کو اس کی اس حالت کا علم تھا مگر وہ اس کی مدد کو نہیں آئے۔ بلکہ اپنی اپنی خود مختاری کے اعلان کرنے کا اسے موقعہ سمجھا اور یوں مجبوراً ہمایوں نے شیر شاہ کو بنگالہ اور بہار کا ایک حصہ دے کر اس سے صلح کر لی کہ جس کے بعد دغاباز افغانی اچانک مغلوں پر ٹوٹ پڑے اور ان کے ایک ایک آدمی کو قتل کر ڈالا صرف ہمایوں اور چند لوگ جان بچا کر بھاگ سکے۔ ایک سال بعد مئی ۱۵۴۰ء کو ہمایوں نے پھر شیر شاہ کے ساتھ لڑنا چاہا مگر اس کی کم ہمت اور بے ترتیب سپاہ بغیر لڑے بھاگ کھڑی ہوئی اور پھر ہمایوں صرف اپنی جان بچا کر بھاگ نکلا۔

اس جنگ کے بعد ہمایوں پندرہ برس تک ادھر ادھر پھرتا رہا اور انہی دنوں میں اس کا مشہور بیٹا اکبر ۱۵۴۲ء میں پیدا ہوا۔ ۱۵۴۷ء میں ہمایوں نے اپنے بھائی کامران سے جو مخالفت پر تلا ہوا تھا کابل جیت لیا اور اسی دوران میں شیر شاہ نے اپنے آپ کو ہندوستان کا ایک لائق اور ہر دلعزیز حکمران ثابت کر دکھایا۔ ہندوؤں کے ساتھ اس کا عمدہ سلوک کرنا زمانہ بعد میں اکبر کی اصلاحوں کا پیش خیمہ تھا۔ ۱۵۴۵ء کو جب کالنجر میں راجپوتوں کی بغاوت کے فرو کرنے میں وہ مصروف تھا اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی موت پر پھر بدامنی کا زمانہ شروع ہوا جس سے فائدہ اٹھا کر ۱۵۵۵ء میں ہمایوں اکبر کے ساتھ ہندوستان واپس آیا اور سرہند پر فتح حاصل کر کے

اس نے ہندوستان میں اپنے آنے کی خبر کو شہرت دی۔ چھ مہینہ بعد اپنے محل کی سنگ مرمر کی سیڑھیوں سے گر کر اور پچاس برس کی عمر میں اس نے وفات پائی۔ اس کے متعلق کسی نے کہا ہے کہ وہ زندگی بھر گرتا رہا اور آخرکار زندگی سے گرتا ہوا نکل گیا۔

اکبر ۱۵۵۶ء سے ۱۶۰۵ء

اکبر جب اپنے باپ کی جگہ بادشاہ ہوا تو صرف تیرہ سال کی عمر کا تھا۔ اپنی حکومت کی ابتدا میں صرف پنجاب اور دہلی ہی کو اپنا کہہ سکتا تھا۔ اور بیس برس کی سخت جنگ و جدل کے بعد اس نے ایسی سلطنت حاصل کی کہ جس میں علاقہ جات اجمیر۔ گوالیار۔ چتوڑ۔ مالوہ۔ گجرات۔ اودھ اور بنگالہ شامل تھے اور بتیس برس کے بعد اوڑیسہ۔ کشمیر اور سندھ اس کے قبضہ میں آئے دکن پر قبضہ کرنے میں وہ ناکامیاب رہا۔

اس نوجوان شہزادے کے دربار کے بعض مصاحبوں نے دشمنوں کی فوج ارد گرد کے مقامات میں دیکھ کر کابل چلے جانے کی اُسے صلاح دی۔ لیکن بیرم ترکمان نے جو نائب السلطنت تھا اور ملک کی پریشان حالت سے بخوبی واقف تھا دلیرانہ روش اختیار کی۔ پھر بھی شروع ہی میں ہیمو نام ایک ہندو قسمت باز کے دہلی پر قبضہ کر لینے کے سبب کہ جس نے بنگالہ میں اپنی عملداری قائم کر لی تھی نومبر ۱۵۵۶ء کو پانی پت کے میدان میں ایک سخت لڑائی لڑنی پڑی۔ اکبر کی فوج اس جنگ میں فتحیاب ہوئی اور اس وقت سے وہ ہمیشہ حملہ کرنے والا ہی رہا اور کبھی کسی نے اُس پر حملہ نہیں کیا۔ دہلی اور آگرہ نے اسے بخوشی قبول کیا اور جلد ہندوستان کا شمالی مغربی

حصہ اس کی زیر حکومت آگیا۔

سنہ ۱۵۶۲ء میں کہ اکبر اب بچہ نہیں تھا عنان سلطنت اس نے خود اپنے ہاتھ میں لی۔ اور کچھ ہی عرصہ بعد نائب السلطنت کو استقلال کے ساتھ موقوف کر دیا۔ اور جو بے جا مداخلت کرنے والے محل میں تھے ان سے آزاد ہونے کی تدبیر نکالی۔ اپنی عہد حکومت کے ابتدائی برسوں میں قانون کو ماننے والوں کے ساتھ اس کا سلوک رحم دلی اور انصاف پسندی کا تھا اس کا یہ طرزِ عمل مستقبل کے لئے نیک فال تھا لیکن باغیوں کو سزا دینے میں وہ خوفناک بھی تھا۔ حرم کی عیش و عشرت کی زندگی اسے پسند نہیں تھی۔ لکھا ہے کہ وہ باقاعدہ اور پرہیزگار زندگی بسر کرتا تھا اور کہ دلیرانہ کھیلوں میں مثلاً پولو اور شکار میں اسے کمال حاصل تھا۔ لڑائی کے موقعوں پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تھکتا ہی نہیں اور اکثر اپنی شخصی دلیری کا اثر اپنی سپاہ پر بھی ڈالتا تھا۔

ہندو سرداروں کے ساتھ اکبر کا دوستانہ برتاؤ اس کے اثر اور طاقت کی مستقل ترقی کا ایک خاص سبب تھا۔ ان ہندو سرداروں کی وفاداری اور سرکش مسلمانوں کے برتاؤ میں اکثر بہت بڑا فرق پایا جاتا تھا۔ ایک راجپوت شہزادی کے ساتھ شادی کرنے پر سب کے ساتھ برابری کے برتاؤ کرنے کے ارادہ میں وہ اور بھی پکا ہو گیا۔ فی الحقیقت اس کے حرم میں ہندو۔ ایرانی اور مغلانی بیویوں اور ایک آرمینی مسیحی بیوی کی موجودگی سے اس کے مذہبی جنونی بن جانے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا بلکہ اس کے برعکس جزیہ یعنی وہ اسلامی محاصل جو کافروں اور ہندو جاتریوں سے لئے جاتے تھے اور جن سے ہندوؤں کو نفرت تھی موقوف کر کے اس نے اپنی ہر دلعزیزی

ہندوؤں میں اور بھی بڑھالی تھی۔

یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس کی اس مصالحانہ روش سے سب کے سب ہندو اس کے طرفدار ہو گئے تھے۔ خاص کر چتوڑ کے راجپوت غرور سے بھرے ہوئے اڑے تھے اور صرف بڑے عرصہ تک اور جان توڑ کوششوں کے ساتھ محاصرہ کرنے کے بعد ۱۵۶۸ء میں یہ مشہور قلعہ بہت سے لوگوں کے مارے جانے پر فتح ہوا۔ لیکن اس وقت سے قریب قریب تمام راجپوتوں نے اس غیر مغلوب اور نہایت ہی معزز سپاہی کی اطاعت منظور کرلی تھی۔ یوں وفادار ہندو شہزادوں کی پوری اور دلی استقامت کے وسیلہ اکبر نے اپنی سلطنت پورے شمالی ہندوستان میں پھیلالی تھی جو دکن میں دریائے نربدا تک پہنچ گئی تھی۔

سب سے زیادہ مشہور ہندو اکبر کے دربار میں ٹوڈرمل نامی ایک راجپوت تھا۔ جس نے ایک لائق فوجی سپہ سالار ہونے کے علاوہ اپنے آپ کو محکمۂ مالیات کا نہایت دانا مہتمم کر دکھایا تھا۔ ۱۵۸۲ء میں اکبر نے اسے محکمۂ مالیات کا وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ چونکہ شہنشاہ نے کئی ایک محاصل جو لوگوں کو پسند نہیں تھے موقوف کر دیئے تھے اس لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ زمین کے لگان سے اس قدر آمدنی وصول کی جائے جو سلطنت کے اخراجات کو پوری کرنے کے لئے کافی ہو اور ساتھ ہی جس کا وصول کرنا کسانوں کے حق میں بے انصافی بھی نہ ہو۔ ٹوڈرمل نے تمام زمین کی پیمائش کر کے لگان کا ایک ایسا طریقہ نکالا کہ جو واجبی تھا اور لوگوں میں پسندیدہ بھی تھا۔ لیکن جب اس نے مطالبہ کیا کہ کل سرکاری حساب و کتاب بجائے ہندی میں لکھے جانے کے جیسا کہ اب تک دستور چلا آتا تھا فارسی میں لکھا جائے تو

زیادہ متعصب مسلمان اس سے ناخوش ہو گئے۔ اس دستورِ جدید نے ہندوؤں کو فارسی پڑھنے پر مجبور کر دیا۔ اور کچھ ہی عرصہ میں سرکاری ملازمت کے مقابلہ کے لئے ہندو بھی مسلمانوں کے ساتھ برابری کے درجہ تک پہنچ گئے۔

شہنشاہ اکبر کی مذہبی "آزادی" پر جو ترقی کر رہی تھی شیخ الاعتقاد مسلمان اظہار نفرت میں سر ہلانے لگے۔ اس نے نہ صرف ہندوؤں کے ساتھ وہی برتاؤ کیا جو "مومنین" کے ساتھ کرتا تھا۔ بلکہ اس کے خیالات بھی مذہبی معاملات میں بڑے وسیع تھے اور خاص کر ابوالفضل آزاد خیال نے جو دربار میں اس کا مقرب تھا اس کے مذہبی خیالات پر بڑا اثر ڈال رکھا تھا۔

اکبر اس امید پر کہ اس کے کوئی بیٹا ہو جو تختِ سلطنت کا وارث بنے متبرک مقامات کی زیارت کیا کرتا تھا اور اسی سلسلہ میں آگرہ کے قریب سیکری میں شیخ سلیم چشتی کے پاس جانا اس واقعہ سے خاص تعلق رکھتا ہے۔ سیکری کے اس ولی کے مطابق اکبر کے گھر جب ایک لڑکا پیدا ہوا تو اس کا نام بھی سلیم رکھا۔ اکبر سیکری میں برابر جایا کرتا تھا اور وہاں کی پر تکلف ماحول کی فضا میں اس نے ایک عالمگیر مذہب کا خواب دیکھا اور وہاں مختلف مذاہب کے نمائندے اس کے سامنے بڑی لمبی بحث آپس میں کرتے۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ اسلام سے اس کی تشفی اب نہیں ہوتی تھی اور رفتہ رفتہ اس نے رعایا پر ایسا اختیار جمایا جو صرف قرآن کے دوسرے درجہ پر تھا اور اس کے دربار میں ایسے مضحکہ کرنے والے بھی موجود تھے کہ جنہوں نے کہا کہ اللہ اکبر کا مطلب اب یہ ہے کہ اکبر اللہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کا ذہن طرح طرح کے مذہبی خیالات سے متاثر ہونے لگا اور اس نے مختلف مذاہب کی باتوں کو لے کر ایک

مذہب ہمہ اوست جاری کیا۔ اس نے برہمن پنڈتوں اور پرتگیز پادریوں سے خیالات یکساں طور سے لئے۔ اس کے نرالے عقیدے سے بہت کم لوگوں کو اتفاق تھا مگر ایسے مسلمان بھی تھے جو سخت ناراض تھے اور گو کہ ان کا شمار کم نہیں تھا تاہم ان کی مجال نہیں تھی کہ اس کے خلاف اس کے منہ پر کچھ بولیں۔ بہر حال چونکہ اس کے مقربین جو اس کے صلاح دینے والے تھے وہ نہایت لائق اور ذہین تھے اسے اطمینان تھا۔ ابوالفضل اس کے دربار کا تاریخ نویس تھا اور اس کے ساتھ اس کا بھائی فیضی بھی درباریوں میں تھا جو ہندوستان کے بہترین شاعروں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے لیکن اس نیک دل بادشاہ کے آخری ایام اس کی اپنی خانگی باتوں کے سبب غم سے بھرے تھے۔ اس کے دو بیٹے شراب پی کر مر گئے اور شہزادہ سلیم نے جو بعد میں جہانگیر کے نام سے مشہور ہوا جلن کے مارے اس کے معتبر دوست ابوالفضل کو قتل کروا ڈالا۔ ان صدموں نے اکبر پر ایسا اثر کیا کہ اس کی حالت پھر نہیں سنبھلی اور اکتوبر ۱۶۰۵ء کو انتقال کر گیا اور آگرہ کے قریب سکندرہ میں دفن ہوا۔

جہانگیر ۱۶۰۵ء سے ۱۶۲۷ء

یہ نیا بادشاہ بچپن میں چونکہ باپ کا لاڈلا اور پیارا بیٹا رہ چکا تھا اس لئے بڑا ہو کر ضدی اور نفس پرست نکلا۔ کئی مرتبہ اکبر کے خلاف بغاوت کر بیٹھا۔ وہ غصہ میں تیز اور شراب کا سخت عادی تھا۔ سلطنت کی خوش قسمتی تھی کہ سینتیس ۳۷ سال کی عمر میں جب بادشاہ ہوا تو اس کی عادتیں کچھ سدھر گئی تھیں۔ اس کے چال چلن کے سدھارنے میں اس کی خوب صورت اور قابل

ملکہ نورجہاں کے زبردست دباؤ کا بہت کچھ اثر تھا۔

جب بادشاہ ہوا تو اس میں آسان پسندی کی طبیعت اور درستی سے سمجھنے کی قابلیت ظاہر ہوئی۔ ان خوبیوں کے باعث وہ اپنے باپ کے مفید کاموں کو جاری رکھ سکا اور اگرچہ وہ اکبر سے زیادہ پکّا مسلمان تھا تاہم وہ ہندوؤں اور مسیحیوں کے ساتھ اکبر کی دوستانہ روش کو اس نے قائم رکھا اور ہر ظلم اور تعصب کے قصور کی سزا کہ جس کا ثبوت اسے مل جاتا۔ سختی سے دیتا اس طرح نظام سلطنت کا جو طریقہ اس کے باپ نے قائم کیا۔ اسے جاری رکھا۔

جہانگیر کے چال چلن اور اس کے دربار کی کیفیت کی معلومات کے لئے ہم مسلم مورخین ہی پر پورا بھروسہ رکھنے کے لئے مجبور نہیں ہیں۔ اکبر کی شہرت دربار مغلیہ میں یورپین سیاحوں کو سترھویں صدی کے آغاز میں کھینچ لائی اور خاص کر دو انگریزوں سے یعنی ہاکنس جو بحری کپتان تھا اور سر ٹامس رو جو شہنشاہ جیمس کا سفیر ہو کر آیا تھا۔ بہتیری معتبر باتوں کا پتہ لگتا ہے۔

یہ لوگ جو ہندوستان کے ساتھ تجارتی تعلقات پیدا کرنے کی کوشش میں تھے باری باری سے جہانگیر کے سامنے پیش کئے گئے۔ اہل پرتگال جو ساحل گوا اور دوسرے مقامات پر اپنا قبضہ کئے ہوئے تھے اور دربار کے جسوئیٹ پادری ان کی موجودگی پر سخت ناراض ہوئے اور انہوں نے جہانگیر کو ان سے بدظن کرنے کی سخت کوشش کی۔ آخر کار سورت میں ایک انگریزی کارخانہ کی پکی طور پر بنیاد ڈالنے میں سر ٹامس رو کامیاب ہوا اور ہاکنس کو اجازت مل گئی کہ وہاں کارخانہ کھولے۔

ان سیاحوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر کا چال چلن قابلِ تحسین نہیں تھا۔ پہلی بات اس میں یہ تھی کہ وہ بے حد دولت مند تھا۔ ہاکنس کے اندازے کے مطابق اس کی آمدنی پچھتر کروڑ تھی۔ سر طامس رو نے تحقیق کی کہ پٹنہ کے حاکم کی تنخواہ بارہ لاکھ روپے سالانہ تھی کہ جو برطانوی والسرائے سے قریب چار گنا زیادہ ہے۔ ہم یہ بھی پاتے ہیں کہ جہانگیر کے پاس خدمت گاروں کی اتنی بڑی تعداد تھی کہ جن کا شمار چھتیس ہزار تھا دربار کا روزانہ خرچ پچاس ہزار روپے تھا اور ان کے علاوہ حرم سرا کا خرچ تیس ہزار روزانہ تھا۔

رعایا اسے پسند نہیں کرتی تھی بلکہ اس سے ڈرتی تھی۔ شکار اور جانوروں کے لڑانے میں جس قدر وہ حد سے زیادہ ظالم تھا اسی قدر سزا دینے میں بھی۔ اس کی روزانہ اخلاقی زندگی بھی اچھی نہیں تھی۔ صبح کی نماز اور تسبیح کے بعد مغل شہنشاہوں کے دستور کے مطابق وہ لوگوں کو اپنا درشن دیتا۔ یعنی اپنا چہرہ دکھاتا۔ اور ان کا سلام لیتا لیکن دن کے زیادہ گھنٹے اور رات کا پہلا حصہ کھانے پینے کی ضیافت اور حرم سرا کی عیش و عشرت میں صرف کرتا۔ خاص کر طامس رو اسے نشہ میں چور پا کر اکثر اس سے متنفر ہو جاتا۔

ان حالات کے تحت اس کی وسیع سلطنت کی حکمران در حقیقت اس کی لائق ملکہ نور جہاں تھی۔ ایک مسلمان تاریخ نگار محمد ہادی کا بیان ہے کہ جب تک اسے شراب کی بوتل خوشی منانے کو ملتی رہتی وہ سلطنت کے معاملات نور جہاں پر چھوڑ دینے کو راضی تھا۔ جہانگیر نے اپنے نام کے ساتھ نور جہاں کا نام سکہ پر کھدوا کر علانیہ اس کی قابلیت کا اعتراف

کیا۔ نور جہاں عرصہ تک کشادہ دل اور انصاف پسند رہی مگر وسیع اختیارات نے اسے بگاڑ دیا۔ اور بعد میں اس کی حرص اور پاس داری کے باعث حسد اور جھگڑے پیدا ہو گئے کہ جس سے اس کی حکومت کے آخری آیام بُرے گزرے۔ جہانگیر کے بیٹوں نے علیحدہ علیحدہ بغاوت کی۔ شہزادہ خرم اپنے بڑے بھائی خسرو کو جس نے اپنے آپ کو فتنہ انگیز اور باغی ثابت کیا تھا اپنے سامنے سے ہٹا کر اپنے لئے سلطنت کا راستہ صاف کرنے میں کامیاب ہوا۔ خرم لائق بھی تھا اور سرکش بھی تاہم نور جہاں کو اس سے سخت نفرت تھی اور اس سے ایک اور چھوٹے بیٹے سے جو جہانگیر کی کسی ان دوسری بیوی سے پیدا ہوا تھا وہ محبت کرتی تھی۔ آخر کار خرم جس نے شاہجہان کا خطاب اختیار کیا تھا اپنے باپ سے علانیہ بغاوت کر بیٹھا۔ قصہ کوتاہ نور جہاں نے فوج کو اپنی طرف کر لینے کی جان توڑ کوشش کی مگر ناکامیاب رہی اور جب اس کا خاوند جہانگیر مر گیا تو اس نے تنہائی اختیار کر لی۔ اور شاہجہان بادشاہ بن گیا۔ ۱۶۴۵ء میں وہ مر گئی اور لاہور کے قریب شاہدرہ میں کہ جس کا فاصلہ جہانگیر کی قبر سے زیادہ نہیں ہے دفن ہوئی۔

شاہجہان ۱۶۲۸ء سے ۱۶۵۸ء

اپنے باپ کی طرح شاہجہان بھی کسی راجپوتنی شہزادی سے پیدا ہوا تھا اور درحقیقت اس کی رگوں میں مغلیہ خون سے زیادہ ہندوستانی خون دوڑ رہا تھا۔ اپنے مقابل کے کل حریفوں کا خاتمہ کر دینے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بڑی تبدیلی آ گئی۔ کیونکہ سارے بیانات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ تمام شاہان مغلیہ میں وہ سب سے زیادہ ہر دلعزیز

تھا۔ اس لئے اس کی حکومت کی کامیابی بھی بے نظیر ہے اس کی چہیتی بیوی ارجمند بانو نے جو ممتاز محل کے نام سے مشہور ہے اسے دین اسلام کی پابندی زیادہ سختی کے ساتھ کرنے کی ترغیب دی تھی اس لئے ہندوؤں سے وہ کچھ تعصب کرتا تھا لیکن لوگوں کے چال چلن کی جانچ کی اسے اچھی سمجھ حاصل تھی اور اس کے تعصبات خواہ وہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں بہتیرے ہندوؤں کو سپہ سالاری کے معتمد عہدوں پر معزز کرنے سے اسے باز نہیں رکھا۔

شاہان مغلیہ نے یہ دستور قائم کیا تھا کہ ارا کین اور عہدے داران سلطنت کی موت پر کہ جن کے پاس جاگیریں ہیں اور جو سود مند عہدوں پر فائز ہیں ان کی کل جائداد اور تمام مال و متاع بحق سلطنت کو مل جایا کرے اور اس دستور کے سبب شاہی خزانہ ہمیشہ بھر پور رہتا تھا۔ شاہجہان کے عہد میں ایک یورپین سیاح نے جو آگرہ آیا تھا یہ تخمینہ لگایا کہ قلعہ کے اندر شاہی محل کے خزانہ میں چار سو پچاس کروڑ سے زیادہ روپے جمع ہیں اسی واقعہ نویس نے ان دنوں میں آگرہ کی وسعت اور شان و شوکت اور بادشاہ کی فوج کا بھی بیان کیا ہے۔ اس کے لشکر کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ صرف گھوڑ سواروں کا شمار ایک لاکھ چوالیس ہزار تھا۔

شاہجہان کو عمارتوں کے بنوانے کا بڑا شوق تھا۔ آگرہ کی بہتیری خوبصورت عمارتیں آج تک اس کی پر تکلف حکومت کی یادگاریں ہیں لیکن فن عمارت کا سب سے بڑا نمونہ جو اس نے تعمیر کروایا وہ تاج ہے جو اس کی غیر متغیر محبت کی یادگار ہے جو ممتاز محل کے ساتھ اسے تھی۔ ممتاز محل چودہ بچوں کی ماں تھی۔ تاج ۱۶۴۸ء میں ختم ہوا۔ بیس ہزار کاریگر روزانہ کئی سال تک اس کے بنانے میں لگے رہے۔ تاہم اس کی بہتیری عمارتیں اس کے محل کے سامنے جو اپنے

لئے دہلی میں تعمیر کروایا تھا پھیکی پڑ گئیں اور فن تعمیر کے بہتیرے یورپین ماہروں کی رائے میں دنیا بھر کے شاہی محلوں میں یہ سب سے زیادہ شاندار ہے۔

شاہجہان اپنی ضعیفی کے دنوں میں اس عالیشان محل میں رہنے لگا۔ دولت کی کثرت اور ہر طرح کی بے اعتدالی نے اسے جو کبھی طاقتور تھا کمزور کر ڈالا۔ بہرحال ابھی تک اس کی بے اعتدالی قائم تھی اور وہ انعام و اکرام دینے میں بڑا فضول خرچ تھا۔ شاہانِ مغلیہ کے قدیم دستور کے مطابق وہ اپنی تاجپوشی کی سالگرہ کے موقعہ پر ایک بڑے ترازو کے پلڑے میں سونا چاندی اور ہر طرح کے جواہرات کو اپنے برابر وزن کرا کر لوگوں میں تقسیم کر دیتا۔ لیکن اس کے اپنے بیٹے نے اُسے قابو میں کیا۔ یہ خیال کر کے کہ مبادا اس کے بیٹے اپنے باہمی حسد اور جھگڑوں سے اسے زک پہنچائیں اس نے اپنی حکومت اس طرح ان چاروں کے سپرد کر دی کہ ہر ایک کو کسی دور کے صوبے کا حاکم بنا کر بھیج دیا لیکن اس سے مشکلات اور بھی بڑھ گئیں۔

اورنگ زیب نے جو شاہجہان کا تیسرا بیٹا تھا اپنے آپ کو ایک دلیر سپاہی ثابت کر دکھایا تھا اور اسے دکن کی حکومت ملی کہ جہاں بڑی گڑبڑی رہتی تھی وہاں میر جملہ کی مدد سے جو ایک لائق ایرانی سپہ سالار تھا اس نے بیدر اور گلبرگہ پر قبضہ کیا اور بیجاپور فتح کرنے ہی کو تھا کہ اپنے باپ کی سخت بیماری کی خبر سنتے ہی فوراً شمال کو چل پڑا اور اب چاروں بھائیوں میں تخت سلطنت کے لئے سخت لڑائی شروع ہوئی۔

شاہ شجاع حاکم بنگالہ ایک بڑی فوج لے کر تیزی سے بہار کی طرف بڑھا دارالشکوہ نے جو اپنے باپ کا پیارا بیٹا تھا یکایک اس پر بنارس میں حملہ کر کے اس کی فوج تتر بتر کر دی اور اورنگ زیب اور مراد بخش کی متحدہ

فوج کا مقابلہ کرنے کے لئے سموگڈھ کی طرف پھرا۔ ایک خونریز جنگ ہوئی کہ جس میں تینوں بھائیوں نے حیرت انگیز بہادری دکھائی اور جس میں دارا اور اس کی فوج کو شکست فاش ملی۔ دوران جنگ میں دارا نے اپنے اونچے ہاتھی سے اتر کر احمقانہ غلطی کی کہ جس سے اس کی سپاہ کو دھوکا ہوا کہ وہ قتل ہو گیا ہے۔ اورنگ زیب نے اب تیزی اور عیاری سے کام لیا۔ پہلے اس نے اپنے ضعیف باپ کو آگرہ کے محل میں قید کر دیا اور تب مراد بخش کے ساتھ اس نے دارا کا تعاقب کیا۔ راستہ میں مراد کو اس نے شراب پلائی اور قید کر کے دور بھیج دیا اور آخر کار جب اس نے دارا کو گرفتار کیا تو اس کے ساتھ شرمناک برتاؤ کر کے اور اسے مرتد قرار دے کر قتل کر ڈالا۔ دارا کا صوفی ہونا اور سلسلۂ قادریہ میں اس کا مرید ہونا ہم پہلے بیان کر چکے ہیں (دیکھو صفحہ ۲۱۸) شجاع اراکان کی پہاڑیوں میں بھاگ گیا اور یوں اورنگ زیب اکیلا تخت کا دعوے دار رہ گیا۔

اورنگ زیب ۱۶۵۹ء سے ۱۷۰۷ء

سب سے پہلی بات قابل غور اس نئے بادشاہ میں یہ ہے کہ وہ کٹر سنی تھا۔ اس کے پہلے کے بادشاہوں نے اس قسم کی مذہبی باریکی کو سلطنت کے کام میں دخل دینے نہیں دیا تھا۔ بلکہ درحقیقت اکبر کے زمانہ سے لے کر کل بادشاہوں کی عام پسندی اور کامیابی کا سبب ان کی وسیع الخیالی تھی کہ جس سے وہ تمام مذاہب کے لوگوں کے ساتھ پیش آتے تھے۔ لیکن اورنگ زیب کے لئے مذہب ایک جذبہ تھا اور سلطنت کے انتظامات کا اسلامی معیار کے مطابق ہونا اس کا اصول عمل تھا۔ اس

مغل بادشاہ کے حالات کی صحیح معلومات کے لئے بھی ہم یورپین واقعہ نویسوں کے احسان مند ہیں اور یہ تذکرہ نویس دو فرانسیسی ٹاورنیر اور برنیر ہیں جو بادشاہ سے اچھی طرح واقف تھے۔ اپنی شخصی زندگی میں اورنگ زیب قریباً فقیرانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ جیسا کہ اپنی جوانی کے دنوں میں اس نے اس قسم کی زندگی اختیار کرنے کی کبھی خواہش بھی کی تھی۔ وہ گوشت نہیں کھاتا تھا اور صرف سادہ پانی پیا کرتا تھا۔ وہ قران کا حافظ تھا۔ اور اس نے دو مرتبہ پورے قران کو اپنے ہاتھ سے عمدہ خط میں نقل کر کے ان مزین نسخوں کو مکہ اور مدینہ بھیج دیا تھا۔ ایک اسلامی فرض کو اس نے پورا نہیں کیا اور نہ اس کے پورا کرنے کی اس میں ہمت تھی کہ اپنا تخت چھوڑ کر مکہ کو جائے اور کعبہ کا حج کرے۔

اس کی حکومت کی تواریخ بالکل مختلف ہوتی اگر وہ اس طرز حکومت پر عمل کرتا کہ جسے اس کے باپ دادوں نے مناسب سمجھا تھا۔ اس کی عمر اب چالیس سال کی تھی اور اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ جو راہ اس نے اختیار کی ہے۔ اس سے اس کے دوست مخالف بن جائیں گے اور دشمنی پھیل پڑیگی لیکن وہ نہایت ہی دلیر اور اپنے ارادے کا نہایت ہی پکا تھا۔ ایک کام جو وہ کر نہیں سکتا تھا اور جسے وہ کرنا نہیں چاہتا تھا وہ یہ تھا کہ وہ اپنے مذہب کو دھوکا دے۔

اور پھر بھی اپنی بے شمار رعایا کی بہبودی کے کام کو ترقی دینا وہ اپنا سب سے اعلےٰ فرض سمجھتا تھا۔ اورنگ زیب پر عیب لگانے والوں میں کوئی بھی ایسا الزام اس پر نہیں لگا سکا جو اسلامی شریعت کی روشنی میں بے انصافی ہو۔ کم از کم اپنی حکومت کے ابتدائی دنوں میں یہ کٹر مسلمان

نرم دل حکمران تھا اور ہر ایک کی اس تک رسائی تھی لیکن سارے اختیارات اُس نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھے کیونکہ طبعاً وہ نہایت ہی شکی تھا۔ اسے اپنے شاہی خاندان کے اور لوگوں کی طرح یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں اسے کوئی زہر دے کر ہلاک نہ کر دے اور مسلمانوں کی اُس تعریف کے خلاف جو وہ اس سب سے اوّل درجہ کے مسلمان کے حق میں کہیں گے اس قدر ضرور کہہ دینا چاہیئے کہ اس کے اہل دربار اور حکام اس کا ڈر مانتے تھے۔ اور سب اس کی عزت بھی کرتے تھے مگر کوئی اس سے محبت نہیں کرتا تھا۔ اس کے اپنے شخصی تجربہ نے اسے عقلمند بنا دیا تھا کہ اس نے اپنے بیٹوں کو قید کر دیا۔ ایک کو زندگی بھر کے لئے اور ایک کو چھ سال کے لئے کیونکہ وہ ڈرتا تھا کہ مبادا وہ باغی ہو جائیں۔

اورنگ زیب اگرچہ ارغوانی شراب سے پرہیز کرتا تھا اور ان عیش پرستی کے مناظر کا روادار نہ تھا کہ جن سے کئی بادشاہوں کی خانگی زندگی ذلیل ہو چکی تھی پھر بھی وہ مغل بادشاہ تھا اور اس نے دربار کی شان اور اس کی زینت کو قائم رکھا۔ دلی جو شاہجہان کا شہر تھا اس کا مرغوب دارالسلطنت تھا۔ برنیر جو چار سال دلی میں رہا اس کی شان اور عظمت کا کافی ثبوت چھوڑ گیا ہے۔ وہاں کے محل کے خوبصورت اور مشہور دیوان خاص میں ایسے حیرت زا اور بھڑکیلے مناظر دیکھنے میں آئے ہوں گے کہ جن کے باعث یہ عبارت جو وہاں کندہ ہے ان پر صادق آتی ہے:۔

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است وہمین است وہمین است

یعنی اگر زمین پر کوئی فردوس ہے تو وہ یہی ہے۔ یہی ہے۔ یہی ہے۔

مشہور تخت طاؤس جسے شاہجہان نے بنوایا تھا غالباً نہایت ہی دلکش طور پر مزین ہوگا۔ ٹورنیر نے اس کی قیمت کا اندازہ نو کروڑ روپے لگایا ہے یہ چھ بڑے اور بھاری پایوں پر قائم تھا۔ جن کے لئے مشہور ہے کہ خالص سونے کے بنے تھے۔ اس میں قیمتی جواہرات لعل۔ زبرجد اور ہیرے جڑے تھے جو ایسا خزانہ تھا کہ کئی لڑائیوں سے حبیت کر جمع ہوتا رہا تھا۔

اورنگ زیب کو زیادہ فکر ایک قابل اور مستقل فوج رکھنے کی تھی اور اس کا کافی سبب بھی تھا۔ بہر حال اس نے اپنے لئے قسمت باز لوگوں کی ایک جماعت اکٹھی کر لی تھی جنہیں جاگیریں دے کر دولت مندی اور ذی اثر مرتبہ تک پہنچا دیا تھا۔ یہ اپنے مرتبہ کو قائم رکھنے اور خزانہ شاہی کی معززہ رقم ادا کرنے کی غرض سے ان بے چارے کسانوں سے جو ان کی زمین پر کھیتی کرتے تھے جتنا ان سے بن پڑتا تھا سختی سے وصول کرتے تھے۔ فی الحقیقت بادشاہ کے اس دعوے میں کہ اسے رعایائی بہبودی کا خیال ہے یہ کمی رہ گئی تھی کہ وہ ان بیچارے مظلوموں کی فریاد سننے سے قاصر رہا۔

اس کے عہد کی سب سے مشہور مہم مشرقی بنگال میں اراکان کے سمندری ڈاکوؤں کے خلاف بھیجی گئی جن کو خفیہ طور سے پرتگیز مدد پہنچا رہے تھے ورنہ اس کے دور حکومت میں کوئی اور ایسی لڑائی نہیں ہوئی۔ شاہ اراکان کے حکم پر قزاق دور دور سے چٹگاؤں میں جمع ہو کر ملک کے اندر دور تک لوٹ مار کرنے میں مصروف ہوئے۔ ۱۶۶۶ء میں اورنگ زیب کا ماموں شائستہ خان ان کی طاقت کو کچل ڈالنے میں کامیاب ہوا۔ اور چٹگاؤں پر قبضہ کر کے اس کا نام اسلام آباد رکھا۔

بیس برس کی حکومت کے بعد اورنگ زیب نے اپنے آپ کو اس

مذہبی رواداری کی مخالفت پر آمادہ کیا کہ جس کی رواداری کی طبیعت اس میں کبھی نہیں تھی اور جس کی مخالفت کو وہ کسی حد تک چھپائے تھا۔ بنارس کے برہمنوں سے اشتعال پاکر اس نے وشنو کے مندر کو ڈھا دیا۔ اور متھرا کے ایک مندر کو مسمار کر کے اس کی جگہ ایک مسجد تعمیر کروا دی اور ان مندروں کے بتوں کو آگرہ لے جا کر وہاں کسی مسجد کی سیڑھیوں میں دفن کروا دیا تاکہ مسلمان محسوس کریں کہ وہ بتوں کو پامال کر رہے ہیں۔ ہندوؤں کا غصہ بھڑک اٹھا اور وہ آخر کار بغاوت کر بیٹھے لیکن سخت خونریزی کے ساتھ وہ کچل ڈالے گئے اور تب بے دھڑک بادشاہ اس بعید القیاس حماقت کا مرتکب ہوا۔ اور وہاں دیدہ و دانستہ اس نے یہ حرکت کی اور پھر جزیہ مقرر کر دیا۔ اس سے کل ہندوؤں کی کہ جن میں راجپوت بھی شامل تھے بلاسبب ذلت کی گئی۔ راجپوتوں کو ایک اور سبب سے بھی غصہ آیا کہ اس نے ان کے معزز سردار جسونت سنگھ سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے دونوں بیٹوں کو دہلی بھیج دے کہ اس کی زیر نگرانی وہ تعلیم پائیں جسونت سنگھ کا خشم ناک انکار اورنگ زیب کو اس کے مقابلہ پر میدان جنگ میں لے آیا۔ راجپوت اس جنگ میں لڑائی تو ہار گئے مگر ہمت نہیں ہارے۔ یہ جنگ عرصہ تک جاری رہی اور کوئی فیصلہ ہوتا نظر نہیں آتا تھا لیکن اورنگ زیب نے یہ محسوس نہیں کیا کہ روز بروز اس کے ان بہترین مددگاروں کی دوستی زیادہ بہ زیادہ ہمیشہ کے لئے مخالفت سے بدلتی جا رہی ہے۔

اورنگ زیب کو اب دکن کا خیال آیا جو اب تک فتح نہیں ہوا تھا اور سزا دینے کی غرض سے جنوب کی طرف حملہ کرنے کو پھرا۔ اس کے دشمن کافی تھے لیکن اب ایک ایسا دشمن اٹھ کھڑا ہوا کہ جس کا وہم و گمان بھی نہ تھا یہ کوکن اور مغربی گھاٹ کی مرہٹہ قوم تھی۔ بیشتر یہ لوگ بیجاپور کے بادشاہ کی فوج میں

بھرتی ہو کر لڑا کرتے تھے اب یہ شودر ذات کے ہندو چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں ہو کر دشمنوں پر ادھر ادھر سے حملہ کر کے بن تھگے لڑنے والے سپاہیوں کی حیثیت میں نمودار ہوئے۔ ان کا سردار شیواجی اپنی عملداری کو دکن میں قائم کر لینے کے بعد خود بادشاہ کے مقابلہ پر حملہ آور ہوا۔ اگرچہ کئی مرتبہ وہ کامیاب ہوا کہ جس میں اورنگ زیب کو زک اٹھانی پڑی مگر آخر کار شیواجی اس کے ساتھ عہد و پیمان کرنے پر مجبور رہا۔ اورنگ زیب نے اس کے ساتھ ذلت کا برتاؤ کر کے اسے اپنا سخت دشمن بنا لیا۔ ۱۶۸۰ء میں شیواجی مرگیا مگر جو طبیعت اس نے اپنی قوم میں پیدا کی تھی قائم رہی۔

اورنگ زیب کو اپنے سپہ سالاروں پر بھروسہ نہیں رہا۔ اور اب فوج کی کمان خود اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس نے مرہٹوں کو کچل ڈالنے کی کئی مرتبہ بے سود کوششیں کیں مگر جب وہ واپس لوٹتا مرہٹے اس کی فوج کے اطراف پر حملہ کر کے انہیں تنگ کر ڈالتے۔ چونکہ اسے علم تھا کہ دکن کی سلطنتوں کے ساتھ ان مرہٹوں کا اتحاد ہے اس لئے گولکنڈہ اور بیجاپور کی ریاستوں کو برباد کر کے مرہٹوں کی رسد کو روک دینے کی غرض سے وہ مرہٹوں کو چھوڑ کر ان کی طرف چل پڑا۔ ایک سال بیجاپور کا محاصرہ کر کے اس کے سپاہیوں کو فاقہ سے لاچار کر دیا۔ لیکن گولکنڈہ پر قبضہ کر لینا اس قدر آسان نہیں تھا اور جب ساری تدبیریں گولکنڈہ کو فتح کرنے کی باطل گئیں تو اس نے رشوت سے کام نکالا۔ لیکن بادشاہ اپنے آپ کو اس دھوکے میں نہ رکھ سکا کہ اس نے دکن فتح کر لیا ہے۔ شکست خوردہ فوجوں کے ایک بڑے شمار کو اس کی ملازمت پسند نہیں تھی اور وہ مرہٹوں کی فوج میں شامل ہو گئے۔ اس کی فوجی طاقتوں کی ناکامی کے خاص اسباب یہ تھے کہ ان کی مدد پر اب راجپوت نہیں رہے اور

اس کے سپہ سالاروں میں وہ تیزی نہیں پائی جاتی تھی جو ان سپاہیوں میں موجود تھی جنہوں نے بابر کی ماتحتی میں ہندوستان کا تاخت و تاراج کیا تھا۔

آخیر میں یہ ضعیف بادشاہ اداس اور تنہا نظر آتا ہے۔ وہ احمد نگر لوٹ کر آیا جہاں انتقال کر گیا۔ اس کا سرگرم ایمان بھی اسے آنے والی خوفناک گھڑی سے نہ بچا سکا۔ اپنے آخری خطوں میں جو اس نے اپنے بیٹوں کو لکھے ہیں جنہیں اگرچہ وہ مشکوک نگاہ سے دیکھتا تھا مگر جن سے اسے محبت تھی وہ اپنی ناکامی کا اعتراف کر گیا ہے۔ لیکن کم از کم وہ ایک معاملہ میں ناکام نہ رہا یعنی زندگی کے آخر تک وہ اسلام کا وفادار رہا۔ وہ بڑی سادگی جو اس کی زندگی میں پائی جاتی تھی اس کے مزار پر اب بھی موجود ہے جو اورنگ آباد کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں روضہ میں ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ تمام شاہان مغلیہ میں سب سے زبردست بادشاہ تھا۔ ان میں سے کسی نے بھی اتنی بڑی فوج کی افسری نہیں کی اور نہ اس قدر وسیع سلطنت پر کسی نے عملداری کی، اور اس نے یہ سب کچھ اپنی اٹل مرضی کے ساتھ کیا۔ اس کے مرتے ہی سپاہی بے قابو ہو گئے اور ملک میں فوراً گڑبڑی پھیل گئی۔ اس کے بڑے بیٹے معظم نے اپنے بھائیوں کا فیصلہ کر کے اپنے لئے تخت سلطنت کا راستہ صاف کیا اور بہادر شاہ کے نام سے بادشاہ بن بیٹھا۔ مگر اس نے دیکھا کہ مرہٹے۔ راجپوت۔ سکھ۔ جاٹ اور جو سب سے پر معنی بات تھی کہ انگریزی فوج اس کی مخالفت میں تھے۔

بعد میں جو گڑبڑی ہندوستان میں ہوئی وہ دو مرتبہ دہلی کی تباہی کا باعث ہوئی۔ ایک مرتبہ ۱۷۳۹ء میں جب کہ ایرانی تخت طاؤس اور بیشمار خزانہ لے گئے اور پھر ۱۷۵۶ء میں جب کہ افغانیوں نے اسے لوٹا۔ ۱۷۶۱ء

میں مرہٹے بڑی دلیری سے لڑے کہ ہندوستان ہندوؤں کے لئے جیت لیں مگر بڑی خونریزی کے ساتھ انہیں پسپا ہونا پڑا۔ آخر کار ۱۷۶۴ء کو بکسر کے میدان میں برطانیوں کی ایک فیصلہ کن فتح نے مغلوں کی رہی سہی طاقت کو شمالی ہندوستان میں بالکل گھٹا دی۔

چوتھی فصل

ہندوستان کی اصلاحی تحریکات

وہابیت کا اثر

اٹھارہویں صدی میں عربستان کے صوبہ نجد میں ایک کٹر و راسخ مسلمان محمد ابن عبدالوہاب اٹھ کھڑا ہوا جو ۱۷۰۳ء سے ۱۷۹۱ء تک رہا۔ جس کی تعلیم اور نمونہ کا بڑا گہرا اثر جلد ہندوستان پر پڑنے کو تھا۔ مذہب حنبلی کا پیرو ہونے کے باعث اس کی کوشش یہ تھی کہ پیغمبر عرب اور ان کے صحابہ کا عہد زرین بحال ہو اور اس غرض سے وہ اسلام کی صرف دو اصل کو مانتا تھا یعنی قرآن اور سنت۔ علاوہ اس کے اصل اجماع کو ایک خاص زمانہ تک اس نے رد کر دیا اور پھر اجتہاد کے ذریعہ کہ جس کے باعث اسلام دنیا کی بدلتی ہوئی حالتوں کے ساتھ موافقت کر سکتا جو کچھ بدعتیں یعنی نئی باتیں

نکلی ہیں ان کو مٹانے کے درپے ہوا۔ اس نے خاص کر مدینہ میں محمد صاحب کی قبر کی زیارت اور مجلس میلاد کو ناپسند کیا اور صوفیوں کے شغل اور ان کی تعلیم کی بھی مخالفت کی۔

اس کی موت کے بعد اس کے پیروؤں نے نجف اور کربلا میں شیعوں کے متبرک مقامات کو لوٹا اور پھر ۱۸۰۴-۱۸۰۳ء میں انہوں نے مکہ و مدینہ پر قبضہ کر لیا یہاں تک کہ محمد صاحب کے مقبرے پر جو خزانہ محفوظ تھا اسے بھی لوٹ لیا اور برسوں حاجیوں کو لوٹتے رہے کہ جس کے باعث حج موقوف ہو گیا الغرض آخر کار مصر کے حاکم محمد علی پاشا نے اُن کی طاقت کو کچل ڈالا۔ زمانہ حال میں ان کے جانشینوں نے ابن مسعود والئے نجد کی ماتحتی میں اکتوبر ۱۹۲۴ء کو پھر مکہ پر قبضہ کر لیا۔ مگر وہاں کے قدیم متبرک مقامات کے ساتھ اس دفعہ زیادہ تعظیم کے ساتھ پیش آئے۔

ہندوستان میں وہابی خیالات کی موجودگی کی پہلی علامتیں ۱۸۰۴ء میں مشرقی بنگالہ کے فرید پور ضلع میں ظاہر ہوئیں۔ اس سال بہادر پور کے حاجی شریعت اللہ نے فرقہ فرائضی یعنی اسلام کے فرائض کو پورا کرنے والوں کی جماعت قائم کی۔ اس نے اسلام کو ان کل توہمات اور غلط عقیدوں سے صاف کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا جو عرصہ دراز سے ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کے باعث اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ اس نے ہندوستان کو بوجہ غیر اسلامی حکومت کے تابع ہونے کے دارالحرب قرار دیا۔

اس کے بیٹے دودھو میاں نے اسی ضلع میں اس کے کام کو جاری رکھا کہ جہاں وسیع پیمانہ پر اس کی تنظیم کی۔ کسانوں میں اسے خاص طور پر کامیابی

ہوئی جن کی حمایت پر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ فرقۂ فرائضی کا ذکر اب سننے میں نہیں آتا لیکن اس کی تعلیم فرقہ اہل حدیث میں اب تک پائی جاتی ہے۔
وہابی خیالات کا دوسرا سرگرم حامی سید احمد ہے جو رائے بریلی میں ہو گزرا ہے۔ ۱۸۱۹ء میں اس نے ان برائیوں کی مذمت کرنی شروع کی جو اسلام کے دین و ایمان میں داخل ہو گئی تھیں اور جلد اس نے اپنے شاگردوں کی ایک جماعت اکٹھی کر لی جو اسے مجدد وقت مان کر اس کا احترام کرتی تھی۔ اس نے پٹنہ کو اپنا مرکز قرار دیا لیکن کلکتہ میں بھی اس کے پیروؤں کی بڑی تعداد تھی۔ مکہ کا حج کر کے لوٹنے کے بعد وہ اور بھی سرگرم بن گیا اور چونکہ ہندوستان اس کے خیال میں دار الحرب تھا اس نے جہاد کا اعلان کیا۔ اس وقت سے راسخ الاعتقاد مسلمان دو گروہوں میں بٹ گئے اور اب تک ان میں یہ جدائی پائی جاتی ہے۔ پرانے راسخ الاعتقاد مولویوں نے اس فرقہ کی سخت اصلاحات کا کہ جسے سید احمد نے طریقۂ محمدیہ کا نام دے رکھا تھا مخالفت کی۔ اور چڑانے کے لئے ان کا نام وہابی رکھ دیا۔ اس نے اس کے عوض تمام لوگوں کو جو اس کی مخالفت کرتے تھے مشرک قرار دیا۔ سید احمد کی سرگرمی نے سکھوں کے خلاف جہاد کرنے پر اُسے آمادہ کیا اور جب ان سے لڑ رہا تھا تو پشاور کے قریب ۱۸۳۱ء میں اس نے وفات پائی۔ اس تحریک کے قائم رہنے کا سبب یہ ہے کہ اس نے اپنے پیروؤں میں ایسے اسلام کی روح پھونک دی تھی کہ جو اصلاح شدہ اور آزاد ہو۔ صرف یہی نہیں بلکہ بے شمار دولت اور وسیع انتظام کہ جس کے سبب اس کے ایلچی ہندوستان کے بڑے حصہ پر چھا گئے ہندوستان کے مسلمانوں پر اس کی اصلاحات اور دائمی اثر کے قائم رکھنے میں بڑی مدد دی۔ اس کا محمد صاحب کی نسل سے ہونا اس کی کامیابی کا ایک بڑا سبب تھا۔ اسکے پیرو اس کا نہایت ہی احترام کرتے تھے کیونکہ وہ اسے آنے والا امام مہدی

مانتے تھے کہ جس کے ہاتھ سے دجال ہلاک کیا جائے گا۔ سید احمد کے کام کو جونپور کے مولوی کرامت علی نے جاری رکھا مگر جہاد کی تعلیم پر اسے اپنے استاد سے اتفاق نہیں تھا۔ ۱۸۲۴ء سے قبل کسی وقت کرامت علی سید احمد کے نہایت سرگرم شاگردوں میں شامل ہو گیا تھا لیکن اس نے اپنی مصروفتیں مشرقی بنگالہ کے اسلام کو محض ہندو مذہب کی باتوں سے جو اس میں داخل ہو گئی تھیں۔ امن اور اعتدال کے ساتھ صاف کرنے کے کام میں محدود رکھیں اور اپنے استاد اور دیگر وہابی پیشواؤں کے برعکس اس نے پیری اور مریدی کے رشتہ کو ترقی دی۔ ۱۸۷۳ء میں اس نے انتقال کیا اور مرنے سے قبل بہتیرے گاؤں میں لوگ اس کے شاگرد ہو گئے تھے۔ اس کے خاندان کے لوگ اب تک امن کے ساتھ ان اضلاع میں اس کی تعلیم کو پھیلا رہے ہیں اور بے شمار لوگوں کو اپنا پیرو کرنے کے مدعی ہیں۔

ان ہندوستانی وہابیوں کے خیالات اور کاموں کے سبب دو اور فرقے پیدا ہو گئے ہیں یعنی اہل حدیث اور اہل قرآن۔ ان میں سے کسی کے بھی پیروؤں کا شمار بہت نہیں ہے۔ اہل حدیث وہابیوں کے ساتھ کسی قسم کے تعلق کے ہونے کا انکار کرتے ہیں تاہم ان کے مقاصد ایک ہی ہیں۔ چنانچہ ان کے اعلان کا یہ اظہار ہے کہ "جو کچھ محمد صاحب نے قرآن میں اور مستند حدیثوں میں سکھایا ہے صرف انہیں باتوں پر اس مذہب کی بنیاد ہے جو اہل حدیث کے نام سے مشہور ہیں۔" وہ اولیاء کی تعظیم کے دستور کے مخالف ہیں اور سنت جماعت کے چاروں مذاہب کی تقلید کو رد کرتے ہیں اور زور دیتے ہیں کہ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے بلکہ ہر زمانہ کے علماء کا فرض ہے کہ قرآن اور حدیث سے اپنے زمانہ کی ضرورت کے موافق اجتہاد کے ذریعہ مسئلے نکالیں۔ یہ مصلحین بھی اپنے متقدمین کے مانند آج کل کے اسلام کو خارجی رسوم اور توہمات سے صاف کرنے کی کوشش

[illegible] ہیں۔

اہل قرآن ان [illegible] کل اصول کو رد کر کے صرف قرآن ہی کو تمام معاملات میں اپنا واحد رہنما خیال کرتے ہیں۔ اس فرقہ کو ۱۹۰۲ء میں مولوی عبداللہ چکڑالوی نے لاہور میں قائم کیا جس نے اپنے لوگوں کے لئے ایک خاص مسجد بھی تعمیر کروائی۔ اس فرقہ کا زیادہ اثر نہیں پایا جاتا۔

سر سیّد احمد خاں ۱۸۱۷ء سے ۱۸۹۸ء

سر سید احمد خاں کا نام گزری صدی کے وسط میں ہمیں لے جاتا ہے۔ یہ شخص اپنی وضع اور نقطۂ خیال میں وہابی مصلحین سے بہت مختلف تھا۔ اگرچہ محمد صاحب کی زندگی اور قرآن کی اصل کی پیروی کرنے میں وہ وہابی مصلحین سے کم نہیں تھا تاہم بڑی دلیری کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کو ایک نئے طرزِ عمل کے اختیار کرنے کی اس نے ترغیب دی۔ اپنے لوگوں کی خراب حالت دیکھ کر اسے دکھ اور افسوس ہوا۔ لیکن اس کا یقین تھا کہ ان کی بہبودی سلطنت برطانیہ کی طرف ان کے نئے رجحان اور مغرب کے تغیر انگیز تاثرات میں ہے۔

۱۸۵۷ء کے غدر کے نازک دنوں میں وہ برطانیہ کا وفادار رہا۔ اور اس کی طرح اور بھی بہتیرے مسلمان وفاداری میں ثابت رہے اور جب غدر کا طوفان ختم ہو گیا تو اس نے سرکار برطانیہ کو مسلمانوں کا ہمدرد بنانے کی کوشش کی جن کی حقیقی وفاداری کا وہ گواہ تھا۔ مسلمانوں کے لئے اور ان کی ترقی کے کام میں اس کی وقعت کا اندازہ ان مقاصد سے عام طور پر لگ سکتا ہے کہ جن کو پورا کرنے کا اس نے ارادہ کیا تھا۔

(۱) اس نے مسلمانوں سے اس مضر خیال کو کہ ہندوستان دار الحرب

سے دور کرنے کی کوشش کی بلکہ اس نے زور دیا کہ چونکہ سلطنت برطانیہ میں مسلمانوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہے ۔ اس لئے یہ دارالاسلام ہے ۔

(۲) اس کا یقین تھا کہ مسلمانوں کے مذہبی نقطۂ نگاہ میں تبدیلی کی ضرورت ہے ۔ اس نے تعلیم دی کہ ہر شخص نہ صرف اس معاملہ میں آزاد ہے بلکہ اسلامی مذہب کے معاملات میں ہر شخص کا یہ سنجیدہ فرض ہے کہ اپنی عقل کو استعمال کرے ۔ وہ عقل کو سب سے اوّل جگہ دینے کا حامی تھا اور اس نے اس پرانے مذہب کی کہ جس کی یہ تعلیم تھی کہ پرانے طریقہ کی اندھی تقلید کی جائے سخت مخالفت کی ۔ اس کا یہ دعویٰ تھا کہ موجودہ اسلام محمد صاحب کے وقت کا خالص اسلام نہیں رہا بلکہ اسلام فطرت ہے اور فطرت اسلام ہے ۔ علاوہ اس کے مسیحیت کا مطالعہ کر کے اس نے اسلام اور مسیحیت میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس نے خصوصاً دونو مذاہب کے پیروؤں کو زیادہ ہمدردانہ روش اختیار کرنے کی ترغیب دی ۔ اس نے کتاب مقدس کی اسلامی تفسیر لکھنے کی کوشش میں بڑی ہمت اور اولوالعزمی سے کام لیا ۔ ۱۸۶۲ء سے ۱۸۶۵ء تک وہ اس کے لکھنے میں مصروف رہا مگر پیدائش کی کتاب کے صرف چند بابوں سے وہ آگے نہ بڑھنے پایا ۔

(۳) تعلیم کے نئے طریقوں کا وہ پکا حامی تھا ۔ وہ صفائی سے جانتا تھا کہ اسلامی تعلیم کے پرانے طریقے کافی نہیں ہیں ۔ بہتیرے مسلمانوں کی طرح اس کو اس بات کا ڈر نہیں تھا کہ نئی سائنس اسلامی عقائد کے لئے خطرناک ثابت ہوگی ۔ ۱۸۶۹ء میں اس نے انگلستان کا سفر کیا اور وہاں عرصہ تک رہ کر وہاں کے طریقۂ تعلیم کا جو وہاں جاری تھا اس نے مطالعہ کیا اور وہاں سے یہ شوق

لے کر لوٹا کہ ہندوستان کی سرزمین میں وہ ایک کالج قائم کرے جس میں آکسفورڈ کی زندگی پائی جائے۔ یہاں اس مقصد کی کٹر مسلمانوں کے پیشواؤں نے سخت مخالفت کی اور اسے کافر قرار دیا۔ بہرحال اپنے ہم خیال لوگوں کی تائید سے ۱۸۷۵ء میں مشہور علی گڑھ کالج قائم کرنے کی اسے خوشی حاصل ہوئی۔ ۱۹۲۰ء میں اس کالج کو مسلم یونیورسٹی ہونے کی سند عطا ہوئی۔

(۴) ساتھ ہی ساتھ اس نے چند جماعتی اصلاحات کے لئے بھی سخت کوشش کی اور خصوصاً اس نے ان دور اُنج الوقت خیالوں کی مخالفت کی کہ پردہ مسلمان عورتوں کی سب سے بڑی ضرورت ہے مگر تعلیم ضروری نہیں ہے آج کل علی گڑھ میں مسلمان لڑکیوں کے لئے ایک انٹرمیڈیئیٹ کالج کہ یونیورسٹی کے ساتھ جس کا خاص تعلق ہے چل رہا ہے۔

سر سید احمد نے جن آزاد خیال اور ترقی کرنے والی باتوں کی بنیاد ڈالی تھی اسکے ہم خیال لوگوں نے اس کی موت کے بعد انہیں قائم رکھا پھر بھی ہم آگے چل کر دیکھینگے کہ اسلام کے قدیم خیالات اور اسکی طرز زندگی کو قائم رکھنے کے لئے مدافعانہ تحریک جاری کی گئی۔

مولوی چراغ علی اور لندن کے مرحوم سید امیر علی کی طرح کے لوگ ایسے اعتراضوں کے جواب ہیں جو ان کے خیال میں اسلام پر مسیحی مصنفین کے غیر واجب حملے ہیں۔ سر سید کی طرح سختی سے یہ دعوے کرتے ہیں کہ جو اصلاحیں اسلامی جماعت میں مختلف مغربی تاثرات کے سبب عمل میں آرہی ہیں نہ تو اسلام کی روح کے خلاف ہیں اور نہ اس کی بہبودی کے لئے خطرناک ہیں۔ اسی طرح ہمارے زمانہ کے مشہور علماء نے مثلاً کلکتہ کے مرحوم صلاح الدین خدا بخش اور لاہور کے سر محمد اقبال جو یورپ کے سربرآوردہ مستشرقین کی تصنیفات پر حاوی ہیں برابر

یہ دعویٰ کیا ہے کہ آج کل کا اسلام محمد صاحب کے زمانہ کا اسلام نہیں رہا۔ اور یہ مسلمانوں کو چاہئے کہ اس اسلام کی طرف پھریں اور اس خیال کی موافقت میں جو حدیث یا شرعی مسئلہ ان کے سدِ راہ ہوتا ہے بڑی صاف دلی اور آزادی کے ساتھ اسے رد کر دیتے ہیں۔ مرحوم مسٹر خدا بخش نے آج کل کی اسلامی جماعت کی برائیوں کو بڑی بے باکی سے ظاہر کیا ہے۔ مثلاً حالتِ جہالت کہ جس میں بہتیری مسلمان عورتیں مبتلا ہیں۔ امیروں کی برائیاں۔ بچوں سے لاپروائی۔ کثیر ازدواجی کی شرعی اجازت اور طلاق کا آسان اور سنگدل طریقہ۔ ان کا بیان ہے کہ "ایسے دستور العمل کی موجودگی میں کہ جو چار بیویوں کی اجازت دیتا ہے ہم طبقۂ نسواں کی بہت زیادہ قدر نہیں کر سکتے۔ کثیر ازدواجی خاندانی امن اور جماعتی پاکیزگی دونوں کی بربادی کا باعث ہے۔" اب اس خیال کا مقابلہ مسلمانوں کے غیر تعلیم یافتہ قدامت پسندوں کے خیالات سے کرنے کی غرض سے اسی مصنف کا ایک اور اقتباس ہم اس جگہ پیش کرتے ہیں۔ "ہم انسانی ترقی سے مایوس نہیں ہیں اور نہ ہماری ہمدردی اس طبقہ کے لوگوں سے ہے اور بدقسمتی سے ہماری جماعت کے زیادہ لوگ اسی طبقہ کے ہیں کہ جنہوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ ہمارے مذہب اور جماعتی طریقہ میں اصلاح کی گنجائش نہیں ہے اور نہ ان میں ترقی کی ضرورت ہے۔ ایسا خیال کل ترقی کو مسمار کر دینے والا ہے۔ اگر ہم یہ دعویٰ کریں کہ تیرہ سو برس پیشتر جو مذہبی اور جماعتی طریقہ ہمارے سپرد کیا گیا تھا اسے بالکل جیسے کا تیسا بغیر کسی ادنےٰ سی تبدیلی یا تغیر کے ہم کو قبول کر لینا چاہئے تو یہ محض بناوٹی بات ہوگی۔"

اس کے برعکس ۱۸۹۰ء کو لکھنؤ میں ایک راسخ الاعتقاد گروہ نے ایک جماعت قائم کی جو ندوۃ العلماء کے نام سے مشہور ہے اور علانیہ جن کا مقصد

یہ ہے کہ مسلمانوں کی پرانی تعلیم کی حفاظت کی جائے اور نصاب میں صرف اسی قدر تبدیلی کی جائے جو ان کی نگاہ میں درست ہو۔ ۱۸۹۵ء میں انہوں نے دارالعلوم قائم کیا کہ جس میں مولوی اور مذہبی پیشوا بننے کی تعلیم دی جاتی ہے۔

اسلامی جماعت کی حالت کو سدھارنے اور بہتر بنانے میں سر سیّد احمد کے شوق اور اس کی شخصی خدمت کا اثر بہت دور تک پڑا ہے۔ ایک طرف تو اس نے جنوبی ہندوستان میں ایک دلچسپ اور اہم کام کا ہونا ممکن کر دیا یعنی وہاں اعلیحضرت نظام حیدر آباد دکن کے زیر فرمان ۱۹۱۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کھولی گئی۔ اس دارالعلوم کی دو باتیں خاص طور پر قابل غور ہیں۔ یہ علوم کی مختلف شاخوں کی جدید ترین تصنیفات کو پورے طور پر استعمال میں لاتی ہیں اور کہ یہ اردو زبان کے ذریعہ جو ہندوستان کے مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے علمی مضامین کی تعلیم دیتی ہے۔ دوسری طرف اس کی کوششوں کے باعث اسلام کے پیشواؤں میں مسلمانوں کی بہبودی کے لئے ایک نئی فکر پیدا ہوگئی ہے جیسا کہ ان انجمنوں سے ظاہر ہے جو اسلامی تعلیم کی ترقی اور جماعت کے عام فائدے کی خاطر جگہ بہ جگہ کھولی گئی ہیں۔ ان میں سے بعض کا آغاز خود سر سید احمد نے کیا تھا۔ ۱۸۸۶ء میں اس نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی کہ جس کا مقصد مسلمانوں میں مغربی تعلیم کو پھیلانا ہے۔ اس کے زمانہ کے بعد ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ قائم کی گئی کہ جس کا قیام ان لوگوں نے کیا کہ جن کو یہ احساس ہوا کہ سر سید سے ایک قدم اور آگے بڑھ کر مسلمانوں کے سیاسی فوائد میں اپنے آپ کو لگانا چاہئے۔ علاوہ ان کے کئی ایک اور جماعتیں ہیں کہ جن کا مقصد ہندوستان میں اسلام کو مستحکم بنانا اور اس کی تبلیغ کرنا ہے۔

احمدیہ جماعت

ایک اور جماعت کے پیدا ہونے کے تفصیلی بیان کو ہم اب تک روکے رہے ہیں۔ اس جماعت کے ظہور کا سبب بے شک کچھ تو خیالات کا وہ انقلاب ہے کہ جس کا آغاز پچھتر برس پیشتر مسیحیوں کے ساتھ مباحثہ کے باعث ہُوا اور جس میں علی گڑھ کے مصلحین کی نہایت ہی دلیرانہ روش کے الٹے اثر کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

احمدیہ جماعت کا بانی مرزا غلام احمد ۱۸۳۹ء میں شمالی پنجاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں قادیان میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے اسلامی علوم اور زبانوں کی اچھی تعلیم حاصل کی تھی۔ ۱۸۸۰ء کے قریب وہ اس نتیجہ پہ پہنچا کہ خدا نے اسے خاص مقصد کے ساتھ برپا کیا ہے اور ۱۸۸۹ء میں اس نے علانیہ اعلان کیا کہ خدا کی وحی اس پر اترتی ہے اور کہ اُسے لوگوں کو مرید بنانے کا اختیار ملا ہے۔ اور اس وقت سے نئی تعلیمات لوگوں کو اس نے سکھانا شروع کیں۔ اسے بھی اپنے خیال کو آگے بڑھانے اور اپنی تعلیمات کے لیے مصالحہ بہم پہنچانے میں ان اسلامی پیشین گوئیوں میں جو امام مہدی کے متعلق ہیں بہت کچھ ملا اور اس مہدی کی پیشین گوئی کے ساتھ آمد مسیح کو بھی کہ جس کے مسلمان منتظر ہیں اس نے شامل کر دیا۔ آخر کار اس نے دعویٰ کیا کہ مجوسیوں۔ ہندوؤں اور بدھ مت والوں کی مذہبی کتابوں میں ایک عالمگیر استاد کے آنے کی خبر پائی جاتی ہے اور اس نے اعلان کیا کہ قوموں کی یہ امیدیں مجھ میں پوری ہوتی ہیں۔ اس نے یہ بھی دعوےٰ کیا کہ میں اس زمانہ کا مجدد ہوں کہ جسے خدا نے اسلام کو بحال کرنے کے لئے بھیجا ہے۔ یوں اس نے مسیح موعود

اور مہدی ہونے کا دعوے کیا لیکن مسیح ہونے کے دعوے سے خود مسیح کا آنا نہیں بلکہ مسیح کی روح میں آنے کا مدعی تھا۔

اپنے مسیح ہونے کے دعوے کو ثابت کرنے کے لئے اسے مسیح کی آمد ثانی کے اس خیال کا مقابلہ کرنا پڑا جو مسلمانوں اور مسیحیوں میں رائج ہے۔ اس مقصد کے لئے اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مسیح صلیب پر نہیں مرے بلکہ بے ہوش ہو گئے تھے اور پھر ایک مرہم کے لگانے سے کہ جس کا نام مرہم عیسیٰ ہے تندرست ہو گئے۔ مرزا صاحب کا بیان ہے کہ اس کے بعد مسیح کشمیر گئے کہ جہاں تبلیغ کرنے کے بعد وہ مر گئے اور دفن ہوئے۔ مرزا غلام احمد نے پھر یہ دعویٰ کرنے کی شرمناک جرأت کی کہ اس نے سرینگر میں مسیح کی قبر دریافت کی ہے۔ کہتے ہیں یہ قبر یوسس آسف نام کسی شخص کی ہے۔ اور مسلمان اب تک کسی ولی کی قبر اسے مانتے آئے ہیں۔ غرضیکہ اس سے مرزا کو جھٹ اطمینان ہو گیا کہ اپنے مسیح ہونے کے دعوے کی ایک بڑی رکاوٹ اب دور ہو گئی۔

اسی طرح اس خیال پر کہ خدا وقتاً فوقتاً اسلام کے لئے ایک مجدد بھیجتا رہتا ہے۔ اس نے دعویٰ کیا کہ مہدی کی حیثیت میں اس کا آنا محمد صاحب کی آمد ثانی ہے بلکہ در حقیقت وہ محمد صاحب کی صورت ہے لیکن یہاں بھی اسے ایک دقّت کا سامنا کرنا پڑا۔ راسخ الاعتقاد مسلمانوں کے خیال کے مطابق مہدی جنگ کرنے والا امام ہوگا کہ جس کی شاہراہ کافروں کے خون سے سرخ ہوگی۔ مرزا غلام احمد نے اس کے برعکس صاحب امن ہونے کا دعوے کیا اور اس لئے جس جہاد کا اس نے اعلان کیا وہ روحانی جنگ تھی اور حالات حاضرہ کے تحت صرف اسی قسم کی جنگ کا اعلان کرنا

ممکن بھی تھا کہ جس میں سلطنت برطانیہ کے ساتھ وفاداری اور آل انڈیا مسلم لیگ کی سیاسی کارروائیوں سے احتراز کرنا بھی شامل ہو۔

اپنے دعاوی کے بیان کرنے میں اس نے اس قسم کے جملے اپنے متعلق استعمال کئے ہیں "خدا نے مجھ سے نہ صرف ایک مرتبہ بلکہ بار بار کہا ہے کہ میں ہندوؤں کے لئے کرشن اور مسلمانوں اور مسیحیوں کے لئے مسیح موعود ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ روحانی معنوں میں مسیح موعود اور کرشن ایک ہی ہیں" اس نے یہ بھی کہا کہ وحی کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے اور کہ خدا اپنے نیک بندوں پر اپنا پیغام اب بھی بھیجتا ہے۔ اس عقیدہ کی بنا پر مرزا غلام احمد نے صاحب وحی ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس نے ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو کسی نہ کسی معنی میں نبی سمجھا بلکہ یہاں تک غلو کیا کہ اس نے مسیح سے افضل ہونے کا دعوےٰ کیا۔

مرزا غلام احمد کے خلاف مسلمان بھڑک اٹھے۔ وہ برابر ملاؤں کی ملامت کرتا رہا جن پر اس نے یہ الزام لگایا کہ وہ عوام کو توہمات کی تاریکی اور غلامی میں رکھتے ہیں اور نہ وہ اس قسم کے عقل پرستوں کا روادار تھا کہ جن میں سید امیر علی اور خدا بخش کا شمار ہے کہ جنہوں نے قرآن اور اسلام کی بہتیری باتوں کو اسلام سے قبل کے عربی مذہب۔ یہودیت اور مسیحیت سے ماخوذ ہونا بتایا ہے۔ کہ جس سے قرآن کا دعویٰ اور اختیار کمزور پڑ گیا ہے لیکن جماعتی اصلاحات کے معاملہ میں اس نے قدامت پسندوں کا ساتھ دیا۔ اس نے پردہ کی رسم کو موقوف کر دینے کی مخالفت کی اور کثیر ازدواجی اور طلاق کے اسلامی قانون کی حمایت کی۔

بہرحال راسخ الاعتقاد جماعت نے جن کی اصلاح کا وہ مدعی تھا

اسے بدعتی۔ کفر بکنے والا۔ دشمن ایمان اور دغاباز کہہ کر بدنام کیا اور وہ اسلام سے خارج کیا گیا اور عام مسلمانوں کی مسجد میں اس کے پیرو نماز پڑھنے سے روک دیئے گئے۔ بعد ازاں کئی قادیانی مبلغوں کو افغانستان میں بدعتی ہونے کے جرم میں سزائے موت بھگتنی پڑی۔ جن میں سے تین ۱۹۲۴ء میں مارے گئے۔ اس موقعہ پر ہندوستان کے راسخ الاعتقاد فرقہ کے پیشواؤں نے امیر افغانستان کے پاس تار بھیج کر اس کے اس طرزِ عمل پر جو اس نے اسلام کے فائدہ کی خاطر اختیار کیا تھا پسندیدگی کا اظہار کیا۔

قادیانی مبلغین جس وسیع پیمانہ پر اپنی تبلیغ کر رہے ہیں وہ اس جماعت کی امتیازِ خصوصی ہے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس کے پیروؤں کا شمار پانچ لاکھ ہے جو ہندوستان کے سارے حصوں میں اور برما۔ لنکا۔ افغانستان۔ عرب۔ مصر افریقہ۔ ماریشس۔ اسٹریلیا۔ چین۔ انگلستان۔ فرانس۔ جرمنی اور امریکہ میں پائے جاتے ہیں۔ یہ سارا کام مع تعلیمی لائحہ عمل کے ایک وسیع تنظیم کے ساتھ چلایا جا رہا ہے کہ جن کا صدر مقام قادیان ہے جہاں ہر سال دسمبر میں سالانہ جلسہ کے موقعہ پر اس جماعت کے لوگوں کی ایک کثیر تعداد جمع ہوتی ہے۔

احمدی تفرقہ

۱۹۰۸ء میں مرزا غلام احمد کا انتقال ہو گیا اور اس کا ایک مرید حکیم نور الدین اس کی جگہ خلیفہ مقرر ہوا جو مرزا غلام احمد سے کم قابلیت کا شخص تھا مگر پھر بھی اس نے چند سال کامیابی کے ساتھ جماعت کو چلایا۔ ۱۹۱۴ء میں اس کا انتقال ہو گیا مگر اس سے قبل ہی بڑے آثار نمودار

ہو رہے تھے کہ جن سے سخت جھگڑے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ آخر کار عہدۂ خلافت کے لئے مرزا غلام احمد کے بیٹے مرزا البشیر الدین محمود کے انتخاب کے وقت یہ جھگڑا ٹوٹ ہی پڑا۔ یہ سچ ہے کہ جماعت کے زیادہ ذی اثر لوگوں میں نا اتفاقی کے اور بھی اسباب موجود تھے مگر ٹھوکر کی جس چٹان سے ٹکرا کر جماعت کا یہ اہم تفرقہ ظہور میں آیا وہ مرزا البشیر الدین اور اس کے ساتھیوں کا یہ اصرار تھا کہ بانی جماعت مرزا غلام احمد کو ایک نبی ماننا چاہیئے۔ ہم پڑھ چکے ہیں کہ مرزا نے کسی معنی میں خود نبی ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔

جماعت کا یہ دوسرا گروہ خواجہ کمال الدین اور محمد علی جیسے تعلیم یافتہ لوگوں کی پیشوائی میں صدائے احتجاج بلند کرتا ہوا اور یہ مانتا ہوا کہ مرزا غلام احمد صرف اپنے زمانہ کا مجدد تھا علیحدہ ہو گیا اور لاہور اپنا صدر مقام ٹھہرا کر جماعت احمدیہ کی دوسری شاخ اس نے قائم کر دی تاکہ جماعت کے دونوں فریقوں میں بہ آسانی امتیاز ہو سکے۔ مناسب طور پر مرزا غلام احمد کے مریدوں کی پرانی جماعت قادیانی اور کبھی مرزائی کہلاتی ہے اور لاہوری جماعت کے لوگ احمدی یا ممبر کاءِ احمدیہ انجمن کہلاتے ہیں۔ مثلاً حال ہی میں خواجہ کمال الدین کے متعلق کسی سوال کے جواب میں اخبار لائٹ مورخہ ۸ اگست ۱۹۳۱ء میں ذیل کا بیان شائع ہوا ہے۔ "قادیانی وہ ہے جو مرزا غلام احمد بانیٔ جماعت احمدیہ کو نبی مانتا ہے اور ان تمام لوگوں کو جو اسے نبی نہیں مانتے ہیں اسلام سے خارج سمجھتا ہے۔ خواجہ کمال الدین لاہور کی احمدیہ جماعت کے شریک ہیں کہ جس کی تعلیم کے مطابق محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں اور آپ کے بعد کوئی دوسرا نبی نہیں آئے گا اور یہ جماعت ہر کلمہ گو مسلمان کو خواہ وہ کسی فرقہ کا ہو اپنا بھائی سمجھتی ہے۔" لاہوری جماعت پیغمبر عرب کے کم مشہور نام احمد پہ

اپنے آپ کو احمدیہ کہتی ہے اور قادیانیوں کی طرح اپنی جماعت کے بانی کے نام کی طرف اپنے آپ کو منسوب نہیں کرتی۔ ان کا بیان ہے کہ پیغمبر عرب کا نام ان کی رسالت کے ابتدائی دنوں میں جب کہ ان کی زندگی کا زمانہ پست تھا اور وہ ایذا اٹھا رہے تھے احمد تھا اور یوں لاہور کی جماعت نے اس مشکل گھڑی کو ظاہر کرنے کے لئے کہ جس سے اسلام آج کل گزر رہا ہے یہ نام احمدیہ اختیار کیا ہے۔

لاہور کی جماعت کا پورا نام احمدیہ انجمن اشاعت اسلام ہے کہ جس کے سردار مولانا محمد علی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی ہیں۔ قادیانی جماعت کی طرح یہ جماعت بھی ایک وسیع پیمانہ پر سارے ہندوستان اور ممالک غیر میں تبلیغ کا کام کر رہی ہے۔ مرحوم خواجہ کمال الدین انگلستان میں اس جماعت کے تبلیغی کاموں کو برسوں تک اپنے زیر نگرانی چلاتے رہتے تھے۔ اس کا صدر مقام ووکنگ علاقہ سری میں ہے کہ جہاں اُن کی ایک چھوٹی سی مسجد بھی ہے۔ ان دونو پیشواؤں نے ایسی کتابیں تصنیف کی ہیں کہ جن کا مقصد مغرب کے لوگوں میں اسلام پیش کرنا ہے اور مسیحیت کے خلاف کچھ بحثی کتابیں بھی انہوں نے لکھی ہیں۔ ان میں قرآن کا انگریزی ترجمہ مع تفسیر جو مولانا محمد علی نے کیا ہے۔ خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ یہ ترجمہ اسلامی معلومات کے بہترین نتائج کو پیش کرنے کا مدعی ہے لیکن مسیحیت کے خلاف اس کا تعصبانہ طرز تحریر صریحاً ظاہر ہے۔ احمدیہ جماعت کے یہ دونو فریق بڑی تیزی سے طباعت و اشاعت کے کام میں مصروف ہیں اور انگریزی اور اُردو رسالوں کے ذریعہ اپنے خیالات بڑی وسعت کے ساتھ ہر طرف پھیلا رہے ہیں۔

حال ہی میں لاہوری جماعت نے اپنے اغراض و مقاصد کا خلاصہ اپنے ہفتہ وار رسالہ "لائٹ" میں شائع کیا تھا۔ جس میں بتایا گیا تھا کہ ذیل کی باتیں جماعت کا نصب العین ہے۔

(۱) غیر متعصب اسلام :۔ اس جماعت کا عقیدہ ہے کہ دنیا کے کل مذاہب کی اصل خدا کی طرف سے ہے۔

(۲) متحد اسلام :۔ اس کا دعویٰ ہے کہ مسلمانوں کے فرقوں میں کوئی حقیقی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ اسلام کی ضروری باتوں پر سب متفق ہیں۔ سب مقررہ وقتوں پر پنجگانہ نماز مقررہ رکعتوں کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ سبھی روزہ رکھتے زکوٰۃ دیتے اور حج کرتے ہیں۔ ہاں بیشک اس سبھی میں ملاؤں کا گروہ شامل نہیں ہے۔

(۳) معقول اسلام :۔ شریعت کی کتابیں نہیں بلکہ قرآن ان کا رہنما ہے۔ ان کے نرسنگے کی آواز ہے کہ "قران کی طرف لوٹ چلو۔" وہ عقل کے آزادانہ استعمال اور دنیا کے نئے حالات کی روشنی میں قرآن کی آزادانہ تفسیر کی ترغیب دیتے ہیں۔

(۴) آزاد اسلام :۔ جس طرح سے بن پڑے ملاؤں کے جوؤں کو اتار پھینکنا ہے۔

(۵) کامل اسلام :۔ اس طرح مسیح یا مہدی کی آمد ثانی کی ضرورت نہیں رہتی۔ مسلمان خود اپنے اوپر بھروسہ رکھنے کی طبیعت پیدا کر سکتے ہیں اور ان کو ضرور کرنا چاہئے۔ خود اسلام میں ایسا روحانی فضل موجود ہے کہ جس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔

(۶) فتحمند اسلام :۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ اسلام

کو دنیا کی انتہاؤں تک لے جائیں۔ وہ کہتے ہیں کہ لاکھوں تک ابھی پہنچنا باقی ہے اور اسلام کی روشنی کے لئے ضرور ہے کہ دور دراز تک یہ پھیلائی جائے اور کہ اسلام کو کل مذاہب پر غلبہ پانا ہے۔ لوگوں کو اسلام میں ضرور داخل کرنا ہے۔ مسیحی ممالک میں مسجدوں کا تعمیر کرانا ضرور ہے۔ اور تثلیث کے ملکوں میں توحید کا اعلان لازمی ہے۔

موجودہ حالتِ اسلام کی چند قابلِ غور باتیں

آخر میں اسلام کی موجودہ حالت کی چند خاص باتوں کا مختصر ذکر ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

(۱) بیان مذکورہ سے یہ صفائی کے ساتھ ظاہر ہو گیا ہوگا کہ پرانی قدامت پسندی اور آج کل کی جدت پسندی کے درمیان ایک سخت کشمکش ہو رہی ہے۔ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد ان نئے خیالات کو پسند نہیں کرتی اور ان نئی تعلیمات کے نکالنے والوں کو کافر قرار دیتی ہے ہمیں دونو فریق کے ساتھ ہمدردی کرنی چاہئیے۔ جب کہ ہم اس جہالت اور تعصب پر افسوس کرتے ہیں کہ جن میں قدیم مسلمان الجھے ہوئے ہیں۔ ہمیں اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ ان میں خدا پرستی کی روح نئے طبقہ کے مسلمانوں سے زیادہ پائی جاتی ہے اور کہ وہ مسیح کے نام کی اب تک تعظیم کرتے ہیں۔ دوسری طرف اس جدت پسند طبقہ کے لوگوں سے اگرچہ بعض اوقات درشتی اور تنگ دلی کی طبیعت کا اظہار ہوتا ہے۔ تاہم وہ پرانی پابندیوں کو اتار پھینکنے کی سچی کوشش اور تعلیم اور اصلاح کی ترقی کے کاموں میں مصروف ہیں۔

(۲) گزرے پچاس سال کے عرصہ میں مسلمان مغرب سے استفادہ کرتے رہے ہیں اور اپنے جرائد و رسائل کو ترقی دینے میں انہوں نے بہت بڑا قدم آگے بڑھایا ہے۔ آج صرف ہندوستان میں ان کے دوسو تیس رسالے جاری ہیں جو دس زبانوں میں نکلتے ہیں اور ساٹھ سے زیادہ چھاپے خانے جو ہندوستان میں ادھر اُدھر پھیلے ہوئے ہیں اُن کی طباعت کے کام میں مصروف ہیں۔ ان رسالوں میں پچاس سے زیادہ صرف لاہور ہی سے نکلتے ہیں۔ ان کے رسائل اسلامی خیال و عمل کے ہر پہلو پر حاوی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ کھلے طور پر جماعتی ہیں اور انکا جاذب توجہ مقصد صرف ایک ہی ہے یعنی اسلام کی حمایت و اشاعت۔

(۳) زیادہ تعلیم یافتہ مسلمان عورتیں ہندوستان کی اسلامی جماعت کی اصلاح کے کام کو ترقی دینے میں جلد اپنے آپ کو با اثر ثابت کر دکھائیں گی۔ ۱۹۳۱ء میں ہندوستان بھر کی عورتوں کی تعلیمی کانفرنس کے موقعہ پر جو لاہور میں فراہم ہوئی تھی یہ دیکھا گیا کہ بحث کرنے میں ان عورتوں نے بہت نمایاں حصہ لیا۔ اور یہ صاف ظاہر ہے کہ جس طریقہ سے یہ مسلمان عورتیں کہ جن کی خاموشی کو گویا ان کی اپنی مرضی پر محمول کر کے جو جاہل رکھی گئی ہیں اب وہ اس کی روادار نہیں ہیں اور اپنی جماعت کی لڑکیوں کی تعلیم کے لئے جو تجاویز پیش ہیں بڑی مستعدی سے ان کی حمایت پر ہیں۔

مسلمان عورتوں کا جو رجحان پردہ کی طرف ہے وہ قابل غور ہے۔ مقابلتہً کم عورتیں اسے قطعاً موقوف کر دینا پسند کریں گی۔ اور ان کی زیادہ تعداد کو تو اس کا خیال تک بھی نہیں ہے مگر جب کہ بعض عورتیں مذہبی وجوہات کے سبب اس کے موقوف کر دینے کے سخت مخالف ہیں۔

بعض اور عورتیں پردہ میں کچھ ایسی ترمیم چاہتی ہیں کہ اپنے دوستوں کی ملاقات کو نکل سکیں اور مردوں کی جماعت میں انہیں ملنا بھی نہ پڑے۔

ایسی عورتیں بہت کم ہیں جنہوں نے پردہ قطعاً ترک کر دیا ہے لیکن ایسی بہتیری عورتیں ہیں جو پرانے دستور کے مطابق پردہ میں نہیں رہتی ہیں۔ یہ پردہ دار عورتوں کے جلسوں میں جواب اکثر ہوا کرتے ہیں نکل کر جاتی ہیں۔ پھر کچھ اور عورتیں ایسی ہیں کہ جب باہر نکلتی ہیں تو برقعہ نہیں پہنتی ہیں مگر کسی مرد کو آتا دیکھ کر اپنی چھتری منہ کے سامنے کر لیتی ہیں۔ طلاق کے معاملہ میں یہ رائے ظاہر کی جاتی ہے کہ قانون کا اطلاق مساوی طور پر کیا جاوے۔ سارڈا ایکٹ کی حمایت میں قریباً سب کی سب متفق الرائے ہیں کہ جس ایکٹ کے مطابق شادی کی رضامندی کی عمر بڑھادی گئی ہے۔ فی الحال بہت کم ہیں جو کثیر ازدواجی اور طلاق کے خلاف سختی سے بول رہی ہیں۔ تاہم کثیر ازدواجی کی رسم اب اس قدر عام نہیں ہے جیسے کہ بیشتر لوگوں کا خیال تھا۔ یہ ایسی عشرت پرستی ہے کہ جس کے اخراجات کو صرف امیر شخص ہی برداشت کر سکتا ہے اور کسی خوش حال کسان کے لئے کھیت میں ایک اور مددگار کا اس سے اضافہ ہو جاتا ہے۔

تعلیم یافتہ عورتیں اپنے مذہب پر فخر کرتی ہیں اور اپنے نبی کی وفادار ہیں۔ وہ ہمیشہ بحث کرنے کو تیار ہیں کہ اسلام کل مذاہب کی تکمیل ہے اور درحقیقت دیگر مذاہب کی سچائیوں کی اصلیت کے یہ خلاف نہیں ہیں۔

(۴) غالباً سب سے زیادہ پُر معنیٰ اضافہ اسلامی خیالات میں سر محمد اقبال کی طرف سے ہو رہا ہے جو لاہور کے شاعر و فیلسوف ہیں۔

انہوں نے مغرب میں فلسفہ کا مطالعہ کیا اور وہ قرآن کی تعلیم کو مغرب کے مختلف فلسفیانہ عقائد کے ساتھ ملا دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کی تعلیم کا نقطۂ خیال یہ ہے کہ جس کا آغاز جرمن کے مشہور فلاسفر نٹشے سے ہوتا ہے کہ شخصیت کو اس طرح ترقی دی جائے کہ اس کا نصب العین فوق الانسان ہو۔ ایک طرف تو ان صوفیوں کی تعلیم و عمل کو وہ رد کرتے ہیں کہ جو ترکِ دنیا کی تائید میں ہیں۔ اور دوسری طرف ایثار نفسی اور انتقام نہ لینے کے اصول کا غیر واضح زبان میں مذاق اڑاتے ہیں۔ اس قسم کی تعلیم کہ حلیم زمین کے وارث ہوں گے وہ ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال کی تعلیم میں بہت کچھ ایسی باتیں ہیں کہ جو آج کل کے تعلیم یافتہ لوگوں کے دلوں کو بڑے زور سے موثر کرتی ہیں۔ لیکن یہ بھی بعید الفہم نہیں ہے کہ ان کے بہتیرے خیالات اس قدر دقیق ہیں کہ بہت سے لوگ انہیں نہیں سمجھ سکتے۔ سیاسیات میں انہوں نے ہندوستان کے شمالی و مشرقی حصہ میں ایک ایسی اسلامی ریاست کے قیام کا خیال حال ہی میں پیش کیا ہے کہ جس میں کئی ایک ایسے اضلاع شامل ہوں کہ جن میں مسلمانوں کا شمار بہت زیادہ ہے۔

پانچویں فصل

اسلام کی نئی حمایت

اسلام کو بحال کرنے اور ہندوستان کی اسلامی جماعت کی اصلاح کرنے کے لئے جو تدابیر عمل میں لائی جا رہی ہیں ہم ان کا ذکر پڑھ چکے ہیں۔ اس فصل میں اختصار کے ساتھ ہم اس بات پر غور کریں گے کہ آج کل کے مسلمان اسلام کی حمایت میں کیا کچھ پیش کر رہے ہیں۔ اسلام کے پرانے عقیدہ کے مطابق تعلیم پائے ہوئے مسلمانوں کے ذہن پر جو تباہ کن اثر مغربی سائنس کا پڑ رہا ہے وہ اس کی متقاضی ہے۔ کہ اسلام کے معقولی دلائل میں تبدیلی کی جائے۔ یورپ کی تہذیب کے ساتھ مسلمانوں کے اختلاط نے بھی ان کی تپست حالی کو عام طور پر ظاہر کر دیا ہے اور آخر میں جیسا کہ ہم آنے والے باب میں دیکھیں گے کہ گزری صدی میں مسیحیت کے زبردست معلموں کے ساتھ ان کے تعلق اور مباحثہ نے اسلام کی کئی ایک کمزور باتوں کو ظاہر کر دیا۔

اور یوں ایسا ہوا کہ چند تعلیم یافتہ لوگوں نے جو خود بہت حد تک مغربی تعلیم کے احسان مند تھے اسلام کی نئی تشریح اور اس کے بانی کی حمایت نئے طور پر کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ اسلام اور محمد صاحب غلط رنگ میں پیش کئے گئے ہیں اور لہذا ان کے سمجھنے میں لوگوں نے غلطی کھائی ہے۔ اس قسم کے دلائل کے

پیش کرنے والوں کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ اس کا ذمہ وار نہ صرف یورپین مصنفوں اور مسیحی مشنریوں کو ٹھہراتے ہیں بلکہ خاص کر اس کا الزام اپنے کٹر ملاؤں پر بھی لگاتے ہیں کہ جن کو وہ غصہ میں سخت ملامت کرتے ہیں۔

اسلام کی نئی تشریح

یہ دعویٰ کیا جاتا ہے اور اس میں بہت کچھ سچائی بھی ہے کہ اسلام کے جدید خیالات کا پہلا مرکز ہندوستان ہے اور سر سیّد احمد خاں کی مانند اور کوئی ایسا نہیں گزرا ہے کہ جس نے اسلام کی نئی تشریح کرنے میں پیشوائی کی ہو۔ اسلام کی اصولی سچائی کو مانتے ہوئے پھر بھی وہ اس بات کا قائل تھا کہ اس کے پیش کرنے کے طریقہ میں پوری تبدیلی کی ضرورت ہے۔

اس نے لوگوں کو ترغیب دی کہ اس میں خالص اسلام کی طرف جو محمد صاحب کے زمانہ کا ہے اور جو قرآن میں لکھا ہے لوٹ چلو۔ اُس کی اس ہدایت پر مسلمانوں کے تمام جدت پسند لوگوں کا اتفاق ہے۔ جن اصولوں کے مطابق اس نے عمل کیا ان سے ظاہر ہے کہ وہ پکا عقل پرست تھا۔ بلکہ بعض مصنفوں نے اسے اور اس کے ہم خیال لوگوں کو نئے معتزلہ کا خطاب دیا ہے۔ یہ لوگ بڑے جوش کے ساتھ اس خیال کا انکار کرتے ہیں کہ اجتہاد کا دروازہ اب ہمیشہ کے لئے بند ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اسلام کا یہ خاص اصول ہے کہ قرآن سے ہر زمانہ اور ہر موقعہ کے لئے ہدایت حاصل کی جائے۔ زمانہ ماضی نے اس کی لفظی باتوں پر زور دے کر اور کمتر درجہ کی تفصیلی باتوں کو اس کی صفت مطلق قرار دے کر غلطی کی ہے۔ اس خیال کے حامیوں کا دعویٰ ہے کہ دنیا کے سارے

مذاہب میں اسلام ہی انسانی فطرت کے عین مطابق ہے خود سر سید نے اسلام اور فطرت کے باہمی موافقت پر اس قدر زور دیا کہ وہ اور اس کے پیرو نیچری کہلائے۔

علاوہ اس کے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ درحقیقت اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے کہ بنی نوع انسان کے کل انبیاء جس کا اعلان کرتے ہیں اور اس لئے ہر جگہ لوگوں کو یہ مذہب پیش کرتا ہے۔ اس خیال کا ایک مصنف اس پر زور دیتا ہوا لکھتا ہے کہ "جب کبھی اسلام اور مسیحیت کے اقوال و اعمال سیدھے سادے طریقہ پر صحیح طور سے دیکھے اور سمجھے جائیں تو ان میں کوئی اصلی مخالفت نہیں پائی جائے گی۔ محمد صاحب یہ برابر کہتے رہے کہ وہ مسیح اور آپ سے پیشتر کے انبیاء کے کام کو جو اس کی طرح خدا کے پیغمبر تھے پورا کرنے اور اس کی گواہی دینے آئے تھے۔ انسانی چال چلن کا سب سے بڑا اور بہترین قانون جو مسیح نے وضع کیا وہ یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنی مانند پیار کر۔ یہ انسانی فطرت کے بالکل موافق ہے اور نوع انسان کے لئے ایسا جامع قانون کسی نے کبھی نہیں سکھایا۔ میری عقل میں مسیحیت اور اسلام کی روح کے ایک ہونے کا اس سے بڑا اور کوئی ثبوت نظر نہیں آتا کہ خود محمد صاحب نے مسیح کے اس حکم کی یہ کہہ کر تائید کی ہے کہ کوئی سچا مسلمان ہو نہیں سکتا جب تک کہ وہ اپنے پڑوسی کو اپنی مانند پیار نہ کرے۔ اس لئے میرا یقین ہے کہ ان دونوں مذاہب سے اگر وہ فلسفیانہ تعلیمات جو اس میں داخل کردی گئی ہیں خارج کردی جائیں تو ان میں کوئی فرق نہیں رہے گا اور یوں اسلام اصل مسیحیت کا اختصار ہے۔ دونوں مذاہب مانتے ہیں کہ نیکی کا سرچشمہ محبت ہے۔ (اقتباس

از سر احمد حسین کی کتاب "نوٹس اون اسلام")

مرحوم سید امیر علی نے بھی اپنے خیال کو اس مسئلہ پر ان الفاظ میں واضح طور پر بیان کیا ہے "مسیح کی ابنیت کے تصور کے سوا مسیحیت اور اسلام میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے۔" یہی وہ رائے ہے کہ موجودہ زمانہ میں جس کا اظہار عام طور سے مسلمان کر رہے ہیں

محمد صاحب کی زندگی پر نئی روشنی

محمد صاحب کی حقیقی زندگی کے چال چلن کی گہری تحقیقات سے جو مغرب کے نقادوں اور مسیحی مبلغوں نے کی تھی زمانہ حال کے مسلمان ناخوش ہو کر اور جس طرح سے کہ ان کے اخلاقی نقائص کو لوگوں نے ظاہر کیا تھا اس سے برانگیختہ ہو کر اپنے نبی کی زندگی کی نئے طور سے حمایت کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ محمد صاحب کی زندگی کی یہ نئی حمایت کی کوشش مختلف سیرتوں اور جرائد و رسائل کے اکثر مضامین کے ذریعہ سے کی گئی ہے۔ اس نئی طرز کی کتابیں زیادہ تر مغرب میں یورپین لوگوں کے لئے شائع کی گئی ہیں۔ لیکن ان کی اشاعت ہندوستان میں بھی ہے کہ جہاں محمد صاحب کے چال چلن پر ہندوؤں نے حملہ کیا ہے۔

یہ ایک غور طلب حقیقت ہے کہ جب یہ مصنفین محمد صاحب کی سیرت پر تبصرہ کرتے ہیں تو عام طور سے محمد صاحب کا مقابلہ خداوند مسیح کے ساتھ کر کے ہر بات میں اپنے نبی کی فضیلت کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور بے شک اس میں ان کی تعریف ہے کہ آخر کار وہ سمجھنے لگ گئے ہیں کہ حقیقی فیصلہ کا انحصار کس بات پر ہے۔ اب ان

کے لئے اِس کتاب یا اُس کتاب کا سوال اس قدر نہیں رہا اور نہ اِس عقیدہ یا اُس عقیدہ کی بحث ہے بلکہ سب سے اہم سوال مسیح یا محمد کا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق محمد صاحب مقدس نبی۔ کامل نبی۔ کامل سیرت کا نمونہ۔ کامل اُستاد ہیں۔ اور محمد صاحب کی اس تعریف سے ان کا مقصد یہ ہے کہ خداوند مسیح کی عزت گھٹ جائے۔

لیکن محمد صاحب کے اس درجہ کو قائم رکھنے کے لئے اس خیال مذکورہ کے مؤیدوں کو ضرورت پڑی کہ بہت سی احادیث اور تاریخی واقعات جو قریب ہزار برس سے مسلمانوں میں رائج ہیں جعلی قرار دے کر رد کر دیں۔ ان احادیث میں ایسی بھی ہیں کہ جو ان کی سیرت کو کامل ہونے سے بہت گھٹا دیتی ہیں تاہم ان کی زندگی کے بعض واقعات کو جو اکثر یہ ظاہر کرنے کی غرض سے پیش کئے گئے ہیں کہ ان کا ایسے شخص کی زندگی میں ہونا کہ جو نبوت کا دعوےٰ کرے سخت معیوب ہے۔ ان جدید حامیانِ اسلام نے دلیری سے قائم رکھا ورنہ ان کی تاویل کردی یا علانیہ ان پر پسندیدگی کا اظہار کر دیا۔ یہاں ہم صرف ایسے دو واقعات کا ذکر پیش کرتے ہیں۔

(۱) چونکہ وہ اس کا انکار کر نہیں سکتے کہ محمد صاحب کے پاس بہت سی بیویاں تھیں۔ وہ اس کے انکار کی کوشش نہیں کرتے۔ ایک وقت میں محمد صاحب کے پاس باندیوں کے علاوہ نو بیویاں تھیں۔ قرآن سے ظاہر ہوتا ہے کہ گویا خدا نے اور زیادہ بیویاں کرنے سے محمد صاحب کو منع کر دیا تھا (اے پیغمبر اس وقت کے) بعد سے (دوسری عورتیں تم کو درست نہیں اور نہ یہ (درست ہے) کہ ان کو بدل کر دوسری

بیویاں کرلو، گو ان کا حسن (صورت) تم کو (کتنا ہی) اچھا (کیوں نہ) لگے۔ مگر اپنے ہاتھ کے مال (یعنی لونڈیوں کا مضائقہ نہیں، اور اللہ ہر چیز کا نگرانِ حال) ہے (سورۃ الاحزاب آیت ۵۲)

محمد صاحب کی اس کثیر ازدواجی کو جائز ٹھہرانے کے لئے وہ کہتے ہیں کہ سوائے عائشہ کے ان کی تمام بیویاں بیوہ تھیں کہ جن کو اسلام کے ابتدائی ایام کی مصیبت کے زمانہ میں محمد صاحب نے اپنی پناہ میں لے لیا تھا اور پھر جب قرآن کے اس صریح حکم کا ان کو سامنا کرنا پڑتا ہے کہ کسی مسلمان کو چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت نہیں (دیکھو سورۃ النساء آیت ۳) تو وہ کہتے ہیں کہ اس حکم کے جاری ہونے سے پیشتر محمد صاحب نے اس قدر زیادہ بیویاں کی تھیں۔

(۲) محمد صاحب کی لڑائیوں سے بھی خاص کر جو انہوں نے اپنے پہلے ہم وطن اہل مکہ کے خلاف وہ لڑے اسلام کے جدید حامیوں کو پریشانی محسوس ہوتی ہے۔ سید امیر علی اس کی نسبت لکھتے ہیں "محمد صاحب کا خدا سے اس کے دشمنوں کے خلاف جنگ کرنے کا حکم پانے سے قبل قریش کی فوج میدان جنگ میں موجود تھی" اور آخر کار یہ شخص "کہ جس نے کبھی اپنی زندگی میں ہتھیار کا استعمال نہیں کیا تھا اور جسے انسانی تکالیف کو دیکھ کر سخت درد محسوس ہوتا اور ترس آتا تھا۔ اپنی مرضی کے برعکس مجبور ہوا کہ دشمن کے حملوں کو اپنی جنگی قوتوں سے روکے اور مجبوراً دشمنوں کی دغا بازی اور اچانک خون ریزیوں کا خیال کر کے اکثر اسے مہم بھیجنی پڑی۔"

اور باقی باتوں میں ان مصنفوں نے یہ بتانے کی بڑی کوشش کی ہے

کہ محمد صاحب انسانوں میں سب سے عظیم الشان اور بہترین ہستی تھے۔ اس کی ذات نے ان تمام بہترین خوبیوں کو کہ انسانی فطرت میں جن کی قابلیت ہے کامل طور پر ظاہر کیا ہے۔ (دی آئیڈیل پرافٹ از خواجہ کمال الدین) لیکن کوئی غیر متعصب شخص محمد صاحب کی زندگی کی قدیم ترین کتابوں کو پڑھ کر اس نتیجہ پر نہیں پہنچے گا۔ یہاں تک کہ قرآن بھی ان کے متعلق بتاتا ہے کہ ان کو حکم ہوا کہ اپنے گناہوں کی معافی مانگیں (دیکھو سورۃ المومن آیت ۵۷ اور سورۃ المجد آیت ۲۱) خواجہ کمال الدین آگے چل کر کہتے ہیں کہ صرف محمد صاحب عالمگیر پیغام کے ساتھ مبعوث ہوئے۔ موسیٰ اور عیسیٰ دونو محدود پیغام اور صرف خاص مقصد کے لئے بھیجے گئے لیکن محمد صاحب کو ساری نسل انسانی کی فکر ہے۔ اگر موسیٰ آزادی کی حمایت میں ہیں اور عیسیٰ کی دلچسپی محبت اور حلیمی پر صرف وعظ کہنے میں ہے تو محمد صاحب کو کسی اور بات کا بھی خیال ہے کہ جس کے بغیر آزادی محبت اور حلیمی یا اور کوئی انسانی اخلاق صحیح طور پر کام نہیں کر سکتے۔ انسانیت میں کچھ اور باتیں بھی پائی جاتی ہیں کہ جن کو اگر ترقی نہ دی جائے تو انسان بدترین قسم کا آدمی بن جائے گا۔ ان سے میری مراد دانش اور دلائل عقلی اور منطقی طاقت ہے.............. یعنی محمد صاحب ذہنی ترقی کے مؤید ہیں۔" (آئیڈیل پرافٹ صفحہ ۵۴)

محمد صاحب کے لئے یہ بھی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ "اس نے تمام دیانت دار اور باعزت وسائل کا استعمال کیا کہ جنہیں دوسرے لوگ بھی استعمال کر سکتے ہیں اور ان لوگوں کے لئے جو بڑی مخالفتوں اور بُری حالتوں کے باوجود کامیابی کی کوشش میں لگے ہیں۔ اس کی زندگی ایک بصیرت

افروز سبق ہے۔" (آئیڈیل پرافٹ ص۶۳) لیکن مصنف نے اس معاملہ میں اس عام اعتراض کے جواب دینے کی کوشش نہیں کی ہے کہ محمد صاحب نے اپنے مخالفوں سے چھٹکارا پانے کے لئے بعض اوقات ناروا وسائل کا بھی استعمال کیا ہے۔

اس اصول پر کہ کوئی شخص یہاں تک کہ انبیاء بھی اوروں کو وہ تعلیم نہیں دے سکتے کہ جس کا تجربہ خود ان کو نہ ہوا ہو۔ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ہر قسم کی زندگی کے لئے محمد صاحب ایک نمونہ ہیں۔ اس کے برعکس عیسیٰ کو مناسب موقعے نہیں ملے جو اور دوسری مختلف خوبیوں کو محمد صاحب کی طرح عملی جامہ پہنانے کے لئے ضروری ہیں۔" (آئیڈیل پرافٹ ص۱۸)

ایک چھوٹی سی کتاب کہ جس میں اسلام پر بچوں کے سوال و جواب ہیں اور جو لاہور سے شائع ہوئی ہے اس خیال کی ذیل کے الفاظ میں تشریح کرتی ہے۔ "جس شخص نے اپنے دشمنوں پر غلبہ حاصل نہیں کیا ہے اور جس کے بیوی بچے نہیں ہیں۔ وہ معافی اور شادی شدہ زندگی کے لئے نمونہ نہیں بن سکتا۔ لوگوں کو زندگی کے ہر شعبہ کے نمونہ کی ضرورت ہے اور سوائے آنحضرت کے اور کہیں ایسا نمونہ لوگوں کو نہیں مل سکتا ہے۔ مسیح نے دشمنوں پر کبھی غلبہ حاصل نہیں کیا اور نہ ان کی بیوی اور بچے تھے۔ اس لئے معافی یا شادی شدہ زندگی کا ان کو نمونہ بنانا فضول ہے۔" لیکن یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ دلیل ہر عالمگیر استاد کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس خوبی کے ساتھ یہ استدلال بھی پیش کیا جا سکتا ہے کہ محمد صاحب کی طرح ایک شادی شدہ نبی یا مجرّد کی مشکلات پر حاوی ہونے کے ناقابل ہے اور موسیٰ یا یسعیاہ کی مانند کوئی مدبّر دنیا کے دہقانوں کو کچھ نہیں سکھا سکتا اور فی الحقیقت

ایسا کہنا کہ عالمگیر اخلاقی تعلیم صرف وہ لوگ دے سکتے ہیں کہ جنہوں نے ہر ممکن تجربہ آزمایا ہے بعید القیاس ہے۔

بہر حال بڑے زور کے ساتھ آج کل ہندوستان اور یورپ میں اعلان کیا جا رہا ہے کہ انسان کا سب سے اعلیٰ النصب العین مسیح کی مانند ہونا نہیں بلکہ محمدؐ کی مانند ہونا ہے۔ ہندوستان کے ایک اعلیٰ مفکر کی نظم تمثیل کی صورت میں یہ سکھاتی ہے کہ مسیحیت کے اصول انسان کو کمزوری کی حالت کی طرف لے جاتے ہیں اور اس کے برعکس اسلام مردانگی۔ خود اعتباری اور آزادی کی طرف لے جاتا ہے جو اور کوئی نہیں کر سکتا۔

قرآن کا ایک مکمل شریعت ہونا

قرآن کی تعلیمات کے بیان کرنے میں بڑے مبالغہ سے مسلمانوں نے کام لیا ہے۔ بے شک ایسے مسلمان بھی ہیں جو واجبی طور پر یہ حجت پیش کرتے ہیں کہ تیرہ ہزار سال پیشتر کا بنایا ہوا قانون زمانۂ حال کے مسلمانوں کے لئے لازمی نہیں ٹھہرانا چاہئے۔ تاہم اب بھی جو دعویٰ قرآن کے لئے کیا جا رہا ہے۔ ذیل کا اقتباس اُس کا ایک نمونہ ہے۔ "قرآن شریف صرف ایک قوم یا ایک زمانہ کے لئے نہیں تھا بلکہ اُس کی تعلیمات کا دائرہ خود انسانیت کے برابر وسیع ہے اس لئے یہ کتاب زندگی کے کل طبقے کے تمام لوگوں کو ہدایت بخشتی ہے۔ یعنی جس طرح ایک جاہل وحشی کے لئے اسی طرح ایک عقل مند فیلسوف کے لئے جس طرح کاروباری لوگوں کے لئے اسی طرح گوشہ نشین فقیروں کے لئے جس طرح امیر اسی طرح غریب کے لئے بھی یہ ہدایت کا کام دیتی ہے۔"

مولانا محمد علی جن کے قرآن کے دیباچہ کا اقتباس ابھی ہم نے پیش کیا ہے پہلا مسلمان ہے کہ جس نے انگریزی داں لوگوں کو قرآن کے مطالب سے آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن دنیائے اسلام کے بہت سے لوگ اس کی ان باتوں سے ناراض ہیں کہ مسلمان ہو کر اس نے پاک کتاب کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے اور ایک اور نسخہ انگریزی میں بغیر عربی متن کے شائع کرنے کی بھی جرأت کی ہے اور خاص کر اس لئے بھی کہ اس نے اپنے فرقہ کے مخصوص عقائد کو تفسیر میں داخل کیا ہے اور خصوصاً مصر اس کے اس فعل پر سخت برانگیختہ ہے اور اپنے ملک میں اس کے اس ترجمہ کے داخلہ کی اجازت دینے سے مصر کی حکومت نے انکار کر دیا ہے۔

کچھ سال ہوئے کہ قاہرہ کے جامع الازہر کے ایک وکیل نے وہاں کے مقامی رسالہ میں جدید خیالات کے خلاف یہ باتیں لکھیں کہ "کیا یہ اشخاص جو ادھر اُدھر غیر اسلامی لوگوں میں قرآن کے انگریزی مترجم پھیلانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ واقعی یقین کرتے ہیں کہ عربی اسلام اور انگریزی اسلام کے مابین وہ امتیازی خط کھینچ سکیں گے؟ جنگ عظیم میں اسلامی ممالک کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کے بعد اور ترکی کی جمہوری سلطنت کا تخت خلافت کو منہدم کر دینے اور اسلام کے خاص دارالخلافت کو اس طرح پھینک دینے کے بعد کہ جس طرح نعش قبر میں ڈال دی جاتی ہے کیا قرآن ہی اسلامی جماعت کی دائمی یادگار باقی نہیں ہے؟ کیا یہ لوگ جو قرآن شریف کے لباسِ عربی کی مخالفت کے جوش میں جدت اور تغیر پسندی کی حرارت اشتیاق سے بے چین ہو رہے ہیں۔ واقعی اسلامی جماعت کا ایک اور معرکۂ کارزار دیکھنا چاہتے ہیں کہ جب ترکیۂ جمہوریہ میں ایک ترکی قران ہو اور دوسری سلطنتوں کی نو

آبادیوں میں فرانسیسی یا اطالوی یا ہسپانوی یا ڈچ قرآن ہوگا اور جنہیں مترجمین کو درست اور صحیح کرنا پڑے گا۔ اور جب ان کی درستی اور اصلاح کی ضرورت محسوس ہوگی کہ جس طرح توریت اور انجیل کے ساتھ معاملہ پیش ہے تو یہ مسلمانوں کا ایک اور میدانِ کارزار ہوگا۔"

ہم اس قسم کی حالت کے ساتھ کچھ حد تک ہمدردی کئے بغیر نہیں رہ سکتے کیونکہ فی الحقیقت پرانے خیالات کے مسلمانوں کے لئے صرف عربی قرآن رشتۂ اتحاد کا ایک ذریعہ رہ گیا ہے لیکن مندرجہ بالا قول کا جواب جو رسالہ لائیٹ میں شائع ہوا تھا اس میں یہ ہمدردی ہم نہیں پاتے چنانچہ یہ رسالہ لکھتا ہے کہ "اس فاضل سے اور اس کی معرفت ہزاروں ملاؤں سے کہ جنہوں نے اسلام کو عقائد۔ رسمیات اور دستورات کا محض ایک پلندہ بنا کر ذلیل کر دیا ہے۔ ہم بے دھڑک کہتے ہیں کہ قرآن کی بے عزتی نہ کیجئے کیونکہ اگر ان گہری حکمتوں کی باتوں کو جو قرآن شریف کے اوراق میں جمع ہیں سمجھنے اور ان کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرنا بدعت ہے۔ اگر روشنی اور زندگی کے اس پیغام کو جو اس میں پائی جاتی ہیں ذہن نشین کرنا بھی بدعت ہے تو سست اور بے سمجھ مُلّا ہونے سے کہ جن کے دماغ الفاظ سے پُر مگر دل سُمّہ بھر زندگی سے بھی خالی ہیں۔ ہم سب سے اوّل درجہ کے بدعتی ہونا کہیں زیادہ پسند کریں گے۔ آخر کار قرآن کے نازل ہونے سے کیا فائدہ؟ کیا اس کی غرض زندگی کی تدبیروں میں کسی کارآمد مقصد کا پورا کرنا ہے؟ یا محض ریشم یا اطلس میں لپیٹ کر اونچے طاق پر عزت کی جگہ دینے کے لئے اور کبھی کبھی اتار کر تعظیم کے ساتھ بوسہ دے کر پھر احترام کے ساتھ واپس رکھ دینے کے لئے یہ ہے؟ یا محض حفظ کر کے زبانی پڑھنے کے لئے ہے اور کیا خدا کی نظر میں مقبول ہونے کے

لیئے یہ کافی ہے؟ یا بیماروں کو اچھا کرنے یا معشوق کی محبت کو جیتنے کی خاطر بطور جادو استعمال میں لانے کے لئے ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ ان ساری باتوں سے اس کتاب کی بے عزتی ہوتی ہے کہ جس میں سے زندگی اور روشنی کے چشمے نکلے ہیں کہ جن سے تیرہ و تاریک اور بے جان دنیا نے روشنی اور زندگی کی نئی قوت حاصل کی ہے۔"

بے شک مستقبل ان کا ساتھ نہیں دے گا کہ جو اس کتاب کے مضمون کا ترجمہ غیر عربی زبانوں میں ہونے سے ڈرتے ہیں بلکہ مستقبل مترجموں کے ساتھ ہے۔ حال میں جو ترقی قرآن کے ترجموں میں ہوئی ہے اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگ سکتا ہے کہ صرف ہندوستان میں پورے یا اس کے کچھ حصوں کے ترجمے گیارہ دیسی زبانوں میں اب مل سکتے ہیں۔

مصر کی حکومت کا قرآن کے احمدیہ ترجمہ کا داخلہ اپنے قلمرو میں ممنوعہ قرار دینے کا سبب اس کی تفسیر کے خیالات کی غیر راسخ الاعتقادی ہے کہ جس میں نہ صرف بعض احمدیہ خیالات زبردستی داخل کئے گئے ہیں بلکہ پرانے مفسروں کی تفسیروں کو جن کی اب تک عزت کی جاتی ہے صریحاً ترک کر دینا بھی پایا جاتا ہے۔

اس خیال کو جو ابھی پیش کیا گیا واضح کرنے کے لئے صرف ایک ایسی مثال اس قسم کے واقعہ کی ہم پیش کرتے ہیں کہ جس سے ایک نہایت ہی اہم مضمون پر بھی اثر پڑتا ہے۔ مسلمانوں کا یہ عام عقیدہ ہے کہ قرآن کی بعض آیتیں اپنے سے قبل کی بعض آیتوں کو منسوخ کرتی ہیں۔ اس کی تائید قرآن کے کئی مقامات سے ہوتی ہے۔ مثلاً (اے پیغمبر) ہم کوئی آیت منسوخ کر دیں یا (تمہارے) ذہن سے اس کو اتار دیں تو اس سے

بہتر یا ویسی ہی نازل (بھی) کر دیتے ہیں۔" (سورۃ البقر آیت ۱۰۰) پھر اس حقیقت سے کہ مسلم علماء نے قرآن کی دو سو پچیس آیتیں جمع کی ہیں جو اس اصول کے مطابق منسوخ ہوگئی ہیں۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مطالعۂ قرآن میں اس مضمون کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

لیکن عقل پرست احمدی اس خیال کو جو مدت سے چلا آرہا ہے بالکل نظر انداز کر دینے کا اظہار کر رہے ہیں اور یوں حوالۂ بالا میں لفظ آیت کا ترجمہ وہ پیغام کرتے ہیں اور بڑی دل جمعی کے ساتھ اس کی تشریح میں کہتے ہیں کہ اس آیت میں خدا کا اشارہ توریت کی شریعت کے منسوخ ہونے کی طرف ہے جو یہودیوں کو دی گئی تھی اور اپنی اس تفسیر میں وہ امام مالک اور امام شافعی جیسے استاد اور بیضاوی۔ جلالین۔ جلال الدین۔ حسین وغیرہ جیسے مفسروں کے بالکل برخلاف ہیں لیکن اپنی یہ مخالفت اپنے قارئین پر وہ ظاہر نہیں کرتے۔

کتاب ہذا کے مولف نے آیت مذکورہ کی اس احمدیہ تفسیر کے متعلق امریکہ کی یونیورسٹی ہارٹ فورڈ سمینری کے پروفیسر ڈی۔ بی۔ میکڈانلڈ سے جو مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کے مانے ہوئے استاد ہیں دریافت کیا۔ پروفیسر موصوف نے اپنے لمبے اور مکمل جواب کے درمیان میں لکھا۔ "میں نے کوئی ایسی سند نہیں دیکھی ہے کہ جس سے یہ ظاہر ہو کہ لفظ "آیت" یا اس کی جمع کا اشارہ ہماری کتب مقدسہ کی طرف ہے۔ بے شک اس لفظ کا اس معنی میں یہ استعمال اسلامی نہیں ہے۔ میں نے کسی مصنف کو اپنی کسی کتاب میں جو آج کل پائی جاتی ہے قرآن کے ایک حصہ کا کسی دوسرے حصہ سے منسوخ ہو جانے کی تعلیم کا انکار کرتے ہوئے نہیں پایا ہے بلکہ اس کے

برعکس شروع ہی سے اسلام کا اجماع اسی معنی پر رہا ہے ....
احمدیوں کی یہ تشریح اسلام میں نہایت ہی بھاری بدعت ہے۔

اسلام کی دیگر ترمیم

کثیر ازدواجی۔ اکثر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اسلام نے عورتوں کو وہ حقوق عطا کئے ہیں اور اسلامی جماعت میں ان کا وہ مرتبہ ہے کہ جس کی نظیر کسی اور مذہب میں نہیں ملتی۔ اس لئے جب کثیر ازدواجی کی قرآنی اجازت پر تنقید کی جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ آیت زیر بحث (سورۃ النساء آیت ۳) خاص حالات کی تحت میں کثیر ازدواجی کی اجازت دیتی ہے۔ یہ اس کا حکم نہیں دیتی بلکہ بغیر شرط کے اس کی اجازت بھی نہیں دیتی۔" (مولانا محمد علی کا انگریزی قرآن الفاظ خط کشیدہ مولانا صاحب کے ہیں۔)

ایسے لوگوں کا دعویٰ ہے کہ قرآن کی حقیقی تعلیم کے مطابق ایک ہی شادی کی اجازت ہے۔ کیونکہ شرع چار بیویوں تک رکھنے کی جب اجازت دیتی ہے تو اسی شرط پر کہ مرد سب کے ساتھ انصاف کر سکے جو عملاً ناممکن ہے۔ اس لئے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ درحقیقت قرآن کا مطلب یہ ہے کہ مرد صرف ایک ہی بیوی رکھے لیکن اس معاملہ پر مسلمانوں میں اتفاق نہیں ہے۔ دوسرے مسلمان صفائی کے ساتھ اسے درست بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انسانی جماعت کی ضروریات کو پورا کرنے کا یہ طریقہ بالکل عقل کے مطابق ہے کہ جو ضروریات غیر مسلم حلقوں میں قانوناً جائز ٹھہرائی ہوئی کم و بیش فواحش کی صورتوں میں پوری کی جاتی ہیں۔

بہرحال بعض مسلمان اس معاملہ میں صاف گو اور صاف دل ہیں مثلاً مرحوم سید امیر علی یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ "میں موجودہ زمانہ میں کثیر ازدواجی کے تعلقات کو زناکاری سمجھتا ہوں اور میرے خیال میں یہ اسلام کی روح کے خلاف ہے۔" مرحوم خدا بخش اگرچہ اس دعوے کو نہیں مانتے کہ اسلام کی تعلیم درحقیقت کثیر ازدواجی کے خلاف ہے تاہم اس رسم کے بُرے نتائج کا ذکر انہوں نے نہایت صفائی سے کیا ہے۔

پردہ :- اگرچہ پردہ کی رسم یک دم موقوف نہ بھی ہو جائے تاہم بلا شبہ اس میں بہت بڑی تبدیلیاں ضرور کی جائیں گی مسلمانوں کا جدت پسند طبقہ کہتا ہے کہ یہ مہلک زہر ہے اور یہ جماعت میں "خطرناک قسم کی غیر ضروری زیادتی ہے۔" یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسلام کو اس کا ذمہ وار ٹھہرانا اسلام پر تہمت لگانا ہے۔ بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ایرانیوں نے تیمور کے بعد ہندوستان کے اسلام میں اس کا اضافہ کیا۔ غرض کہ یہ ساری باتیں ظاہر کر رہی ہیں کہ ہوا کس رُخ چل رہی ہے۔

جہاد :- مسلمانوں میں اس لفظ کے استعمال پر سب لوگوں کا اتفاق نہیں ہے۔ بعض قرآن کے اس حکم "قاتلو" یعنی لڑو (سورۃ التوبہ آیت ۲۹) کی تشریح میں کہتے ہیں کہ اس کی اجازت صرف محمد صاحب کے زمانہ تک کے لئے تھی۔ اسلام درحقیقت امن اور رواداری کا مذہب ہے اور اس کی تائید میں یہ آیت پیش کرتے ہیں جو آیت مذکورہ سے بہت عرصہ پیشتر کی ہے یعنی دین میں زبردستی کا کچھ کام نہیں (سورۃ البقر رکوع ۳۴ آیت ۲۵۷) ان کے بیان کے مطابق بلکہ جہاد ایک روحانی جنگ ہے باقی رہا محمد صاحب کا ان کے متعلق ذکر تو ان کی طبیعت ہی جنگ سے متنفر تھی۔ وہ صرف اپنی جماعت کی حمایت

میں لڑے اور وہ بھی تیس برس لگاتار ظلم برداشت کرنے کے بعد۔ دوسری طرف اس موخر الذکر خیالات کے لوگ بھی صفائی سے لکھتے ہیں کہ جہاد بالسیف یعنی تلوار کی لڑائی ہندوستان میں صرف ملتوی ہے۔ یہ حکم منسوخ نہیں ہوا ہے۔ اس معاملہ میں محمد صاحب کا نمونہ ابھی تک قابلِ تقلید ہے۔ اگرچہ ان کے مزاج میں نرم دلی تھی پھر بھی ایمان داروں کی حمایت میں تلوار استعمال کرنے سے نہیں جھجکے۔

مُشرکوں کے دین کی طرف نیا رجحان۔ بعض جدّت پسند مسلمان کے رجحان میں ہندوؤں کے مذہب کی طرف ایک عجیب تبدیلی پائی جاتی ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ عام مسلمانوں کی نگاہ میں یہ ہندو اور سارے مُشرک قطعاً اسلام سے خارج ہیں اور اہل کتاب کے ساتھ ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اب دعویٰ کیا جاتا ہے کہ قرآن کی تعلیم کے مطابق تمام قوموں میں پیغمبر ہوئے ہیں اور ہر ایک کے پاس الہامی کتاب ہے (سورۃ یونس آیت ۴۸ سورۃ فاطر آیت ۲۲) وہ کہتے ہیں کہ رام اور کرشن خدا کے برگزیدہ تھے اور وہ اسلام کا پیغام لے کر آئے اور درحقیقت وہ مسلم تھے۔ حال ہی میں لائٹ نے ذیل کی یہ عبارت شائع کی کہ "اگر یہ موجودہ افسوس ناک قومی جھگڑے نہ ہوتے جو اسلام کے غیر متعصبانہ مطالعہ میں سدِ راہ ہیں تو ہمیں یقین ہے کہ ہندو جیسی سمجھدار قوم اسلام کے پیغام کو حضور کرشن ہی کے پیغام کی طرح خوش آمدید کہتی۔" پھر یہ مضمون نویس لکھتا ہے کہ نانک رام موہن رائے اور کیشب چندر سین سبھوں نے کل مذاہب کی حقیقی یکتائی کو تسلیم کیا ہے اور اسلام کا خدا کی طرف سے سچا مذہب ہونا بھی مانا ہے اور پھر ہندوؤں کو یقین دلاتے ہوئے کہ اگر وہ مسلمان ہو جائیں تو بڑی سرگرمی اور بڑے تپاک سے وہ قبول کئے جائیں گے۔ اس حیرت انگیز جملہ پر مضمون ختم کرتا ہے "کرشن کے دوسرے بہادر مسلمانوں کو اس قدر عزیز ہیں کہ جس قدر ہندوؤں کو۔"

پانچواں باب

مسیحیت اور اسلام

پہلی فصل

ہندوستان میں مسیحیت اور اسلام کا بیان سولھویں صدی مسیحی سے

جسوبیٹ پادریوں کی تبلیغی جماعتیں

معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں مسیحیت کو پھیلانے کی پہلی کوشش پہلی مرتبہ اکبر کے عہدِ سلطنت میں (۱۵۵۶ - ۱۶۰۵) میں کی گئی۔ اس کی دعوت پر آگرہ کے شاہی دربار میں کل مذاہب کے نمائندے جمع ہوئے اور یہی وجہ تھی کہ گوا کے پرتگیزی جسوبیٹ پادریوں نے تین تبلیغی جماعتیں شہنشاہ مغلیہ کے دربار میں تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد بھیجیں۔ پہلی جماعت کو کوئی کامیابی نہیں ہوئی اور ۱۵۸۳ء میں واپس بلالی گئی۔ دوسری تبلیغی جماعت کا بھی جو ۱۵۹۱ء

سے ۱۵۹۲ء تک رہی یہی انجام ہوا۔ تیسری جماعت لاہور میں ۱۵۹۶ء میں آئی کہ جہاں ان دنوں بادشاہ دربار کیا کرتا تھا اور یہ اس لئے قابل ذکر ہے کہ اس کا سردار جیروم زیویر تھا جو مشہور فرانسس زیویر کا بھتیجا تھا۔ اس جماعت کو بھی کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔

بہر حال شاہان مغلیہ کی واقفیت کے لئے جیروم نے تین کتابیں فارسی میں لکھیں۔ ان میں سے تیسری کتاب آئینۂ حق نما کا مختصر ذکر ہم یہاں کریں گے کہ جسے مصنف نے ۱۶۰۹ء میں اکبر کے جانشین جہانگیر کی نذر کی۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ اس نئے شہنشاہ کے عہد میں بھی مرتبہ مسیحیت قبول کرنے کا واقعہ پیش آیا۔ جہانگیر اگرچہ ابتداءً میں دیگر مذاہب کے لوگوں کا مخالف تھا۔ مگر رفتہ رفتہ مذہبی رواداری میں قریباً اپنے باپ ہی کی طرح ہو گیا تھا۔ اس نے رومن کیتھولک پادریوں کے ہاتھوں اناجیل کا فارسی ترجمہ قبول کیا۔

جیروم کی کتاب مذکورہ کے متعلق کسی نے کہا ہے کہ یہ ظاہر ہے کہ "مصنف بڑی لیاقت اور استعداد کا آدمی تھا اور مسلمانوں کو اپنا مذہب پیش کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی تھی۔ مگر پاک کلام کے سیدھے سادے اور صاف پیغامات سے اس نے خود اپنی دانشمندی پر زیادہ بھروسہ کیا۔" (ہنری مارٹن کے رسالوں کے مجموعہ میں ڈاکٹر لی کے دیباچہ کا اقتباس) علاوہ اس کے جب مصنف نے مقدسین کی برکات اور مردوں کے لئے شفارسی دعائیں اور مورتوں کی پرستش کی تائید میں دلائل پیش کرنے کی کوشش کی تو ایسی دقتوں کا اسے سامنا کرنا پڑا۔ جو رومن کیتھولکوں کی امتیازی باتیں ہیں۔ اتفاقیہ طور پر ہم معلوم کرتے ہیں کہ اُس کے زمانہ میں بھی اسے الوہیت مسیح اور صحت کتب مقدسہ کی تائید میں ثبوت پیش کرنے کی ضرورت پڑی۔

۱۶۲۱ء میں کسی مسلمان زین العابدین نے جیروم کی کتاب کا جواب دیا۔ یہ مسلمان اپنی معاندانہ طبیعت میں بائبل سے زبردستی ایسے معانی نکالتا ہے کہ جو اس کے اپنے مقصد کے موافق ہیں اور اس معاملہ میں وہ بڑی رتک بہتیرے مسیحیت کے خلاف لکھنے والے مسلمانوں کا اصل نمونہ ہے جو صدی بہ صدی ہوتے آئے ہیں۔ یوں اس کا بیان ہے کہ توریت۔ زبور اور خداوند مسیح کے وعدۂ فارقلیط میں اسے محمدؐ کی پیشین گوئی کا ذکر ملتا ہے۔ کتب مقدسہ کے مروّجہ نسخوں کے قبول کرنے کے خلاف دلیل پیش کرتے ہوئے اپنی جہالت یہ کہہ کر ظاہر کی ہے کہ "ہم مانتے ہیں کہ مسیح کے آسمان پر جاتے وقت اصل انجیل کھو گئی" وہ مسیح کے معجزات کا سوال اٹھاتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ اسلام کا سب سے بڑا معجزہ قرآن ہے اس نے جیسوئیٹ پادریوں کے ان تبرکات اور مورتوں کی پرستش پر پُر تمکنت اور مفید طور پر سرزنش کی ہے کہ جو حقارت سے بھی خالی نہیں ہے۔ "اب ہمیں کوئی ضرورت نہیں کہ ہم مسیح اور کنواری مریم کی لکڑی کی بنی ہوئی مورتوں کی تمہاری پرستش پر غور کریں اب خواہ ایسی پرستش کا مقصد ان کی شخصیت کی تعظیم کرنا ہو یا ان کی الٰہی تعظیم کرنا مراد ہو.......... عقلمندوں کو اشارہ کافی ہے۔ اور چونکہ ہم آپ کو عقلمند مانتے ہیں ہم محض اس کا اشارۃً ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔"

۱۶۸۱ء میں روم کے مدرسۂ دینیات کے پروفیسر فلپ گواڈ گنولی نے لاطینی میں زین العابدین کی اس کتاب کا بالکل ناکافی جواب لکھا اور پوپ اربن ہشتم کے نام پر اسے نذر کیا۔

مسیحی مذہب ہندوستانی مسلمانوں کو اس طرح پیش کرنا جس طرح کہ جیسوئیٹ پادریوں نے کیا لائق اور کافی ہونے سے کہیں بعید تھا تاہم اٹھارہویں

صدی میں ہندوستان کے ساتھ برطانوی تعلقات کے قائم ہونے تک تبلیغ کے میدان میں صرف یہی تھے۔ برطانوی حکومت کے ہندوستان میں آنے پر بھی یہاں کی تبلیغی حالت میں کوئی جلدی ترقی نہیں ہوئی۔ مختلف ذرائع سے پتہ لگتا ہے کہ ان ابتدائی دنوں میں برطانوی نمائندے ہندوستان کے لوگوں کی روحانی حالت سے لاپرواہ تھے تو پھر وہ مسلمانوں کی فکر کیوں کرتے۔ بسا اوقات خود اپنی زندگیوں سے مذہب کو نکال باہر کیا تھا۔ اور وہ سب کو یکساں لامذہب معلوم پڑتے تھے۔ یہ "کافر فاتحین" اپنی زندگی کے نالائق طور و طریق سے مسلمانوں کے دعوے کو تقویت پہنچا رہے تھے اور ان کی اس دلیل کی تصدیق کر رہے تھے کہ اسلام مسیحیت سے افضل ہے۔

ہنری مارٹن

انیسویں صدی کا آغاز زیادہ امید افزا واقعات سے ہوا مشہور مبلّغین یعنی انگلستان کے بپٹسٹ مشن کے کیری۔ مارش مین اور وارڈ سرامپور میں مقیم ہو چکے تھے اور کلیسیائے انگلستان کے سنجیدہ مزاج پادریوں کی ایک جماعت کہ جس میں بوخانن۔ ڈیوڈ براؤن۔ طامسن۔ کوری اور خاص کر قابل توجہ ہنری مارٹن شامل تھے کلکتہ اور اس کے مضافات میں مقیم تھی۔

۱۸۰۶ء میں ہنری مارٹن کی ہندوستان میں آمد سے مسیحیوں کا مسلمانوں کے ساتھ تعلقات کی تواریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کا قیام مختصر تھا یعنی صرف ۱۸۱۱ء کی ابتدا تک تاہم وہ اپنی زندگی کے کام کے سبب مسلمانوں کے لئے زمانۂ حال کا پہلا مشنری ہے۔ دانا پور اور کانپور میں کہ جہاں وہ ۱۸۰۷ء سے ۱۸۱۰ء تک رہا

اگرچہ مسیح میں خدا کی محبت کی خالص انجیل کی منادی کا وہ مشتاق تھا تاہم مسلمانوں کے ساتھ اس قسم کی بحث میں اسے مبتلا ہونا پڑا کہ جو اس وقت سے بہت عام ہو گئی ہے اس کے سبب اس کی سریع الحس طبیعت کو سخت صدمہ پہنچا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس جیسا سرگرم مناد بحث کرنے سے بچ کیسے سکتا تھا۔

بحث مباحثہ کے مستقبل کو بالکل اپنے سامنے دیکھ کر اس نے ایسے الفاظ میں اپنے دلی خیالات کا اظہار کیا ہے کہ بہتر ہوگا کہ جنہیں ہم اپنے زمانہ میں یاد رکھیں۔ "میری خواہش ہے کہ تجسّس کی روح لوگوں میں پیدا ہو۔ لیکن میں صریح دلائل پر زیادہ زور نہیں دیتا کیونکہ خدا کا کام بہت کم اس طریقہ پر انجام پاتا ہے۔ آسمان سے روح القدس کے نزول کے ساتھ انجیل کی منادی کرنا روحوں کو جیتنے کا بہتر طریقہ ہے۔" ہمیں اب معلوم ہے کہ آخرکار اس کی نیک زندگی کا نمونہ اس سچائی کا کہ جس کی وہ منادی کرتا تھا بہتر گواہ ثابت ہوا۔ کیونکہ لوگوں نے خواہ کتنا ہی اس سے اختلاف کیا ہو وہ اس کی تعظیم کرتے تھے اور اسے مرد خدا مانتے تھے کہ جو نام بعد میں ایرانیوں نے اسے دیا۔ ہندوستان کے مولویوں کے ساتھ مباحثوں نے اسے ایران میں مباحثے کرنے کے لئے تیار کر دیا کہ جہاں جنوری ۱۸۱۱ء میں جب صحت کی خاطر ہندوستان چھوڑنا پڑا تو وہ گیا۔ اس نے شروع ہی میں یہ محسوس کیا تھا کہ مسلمانوں کے لئے نئے عہد نامہ کا ترجمہ ضرور اردو میں ہونا چاہئے اور یہاں سے روانہ ہونے سے قبل اس ترجمہ کے کام کو پورا دیکھ کر اسے بڑا اطمینان حاصل تھا۔ پھر اس کے دل میں ایک اور حوصلہ تھا کہ ایران پہنچ کر انجیل کے فارسی ترجمہ کو کامل بنا سکے گا۔ اس کام کے بھی پورا ہونے تک وہ زندہ رہا۔ ان خاص مضامین میں کہ جن میں وہ ہندوستان اور ایران میں بحث کرتا رہا معجزہ کا مضمون بھی ہے۔ اور خصوصاً وہ معجزات جو محمد صاحب کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ ہنری مارٹن

نے اس معاملہ میں اپنے دلائل کی بنیاد محمد صاحب کے معجزہ دکھانے سے صاف اور صریح انکار پر رکھی ہے جیسا کہ قرآن سے پایا جاتا ہے (دیکھو سورۃ العنکبوت ۴۹-۵۰ اور سورۃ القصص ۴۸-۴۹)

ایران میں ہنری مارٹن نے اپنے مقابل پر وہاں کی ایک با اقتدار ہستی کو پایا جو تمام ملاؤں کا مجتہد تھا کہ جس کا نام مرزا ابراہیم ہے اور جس نے مسیحیت کے خلاف اپنے دلائل کو قابلیت کے ساتھ ایک کتاب میں لکھا ہے کہ جس کا لب لبجہ نرم ہے۔

مرزا کے نرالے طرزِ استدلال کے نمونہ میں ہم معجزات کے باب سے اس کی ایک دلیل پیش کرتے ہیں وہ کہتا ہے کہ معجزات کا تعلق زمانہ کے دور سے ہے جو آتے جاتے رہتے ہیں۔ چنانچہ موسیٰ کے معجزات جادو کے زمانہ میں ہوئے اور جادوگروں نے اُن پر گواہی دی۔ مسیح کے معجزے علم طب کے زمانہ میں ہوئے اور طبیبوں نے اُن کی تصدیق کی۔ محمد صاحب کا معجزہ قرآن ہے کہ جس کا نزول شاعری کے زمانہ میں ہوا اور عرب کے شاعروں نے اس پر گواہی دی۔

مرزا کتب مقدسہ کی صحت کا بھی ردّ کرتا ہے اور اس لئے قابلِ تعریف طور پر اپنی اس دلیل کی مطابقت میں بائبل سے اپنے کسی دعوے کے ثبوت میں کوئی سند پیش نہیں کرتا۔ ہنری مارٹن نے اس کتاب کے جواب میں تین رسالے فارسی میں لکھے جو اب تک محفوظ ہیں۔ پہلا رسالہ معجزات پر ہے جس میں اس نے ثابت کیا ہے کہ قرآن معجزات کے مطالبات کو پورا نہیں کرتا۔ دوسرا رسالہ محمد صاحب کی رسالت کی تنقید میں ہے اور تیسرا رسالہ تصوف کی غلطیوں پر ہے۔ آخری رسالہ میں وہ دوسرے کے عوض دکھ اُٹھانے کے اصول کی حمایت کرتا ہے اور موسیٰ اور مسیح کے معجزوں کو ثابت کرتا اور کتب مقدسہ کی اصلیت کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔

یہ بتایا جا چکا ہے کہ اگر ہنری مارٹن بحث کی باتوں کو چھوڑ کر مسیحی ایمان کے زیادہ ضروری معاملات پر زور دیتا تو بہتر ہوتا۔ لیکن اگر ہم ذرا بھی اپنی قوت متخیلہ کو کام میں لائیں تو خداوند مسیح کے اس تنہا ایلچی کی حالت پر ہمیں ترس آئے گا۔ اس وقت اس کی صحت نہایت خطرناک حالت میں تھی وہ تپ دق کا شکار تھا۔ اس مسلمان کے حملہ نے چونکہ اسے مقابلہ پر بلایا تھا تو بطور مسیح کے نمائندہ ہونے کے جواب دینے کی ضرورت اس نے محسوس کی لیکن ہنری مارٹن کی مسیحی خدمت اور اس کی وقعت اور ہندوستان کے مسلمانوں کے درمیان مسیحی کارناموں پر اس کے اثر کا اندازہ اس کے ان رسالوں سے نہیں لگانا چاہئے۔

اس لائق فاضل کے متعلق جو کیمبرج یونیورسٹی کا سینیئر رینگلر اور سمتھ پرائز جیتنے میں اول تھا۔ کسی نے نہایت خوب کہا ہے کہ جب یہ صرف ستائیس برس کا تھا "تو مسلمانوں میں مسیحی بشارت کے ایک نئے دور کا اس نے آغاز کیا"، کیونکہ اس کی غیر فانی شہرت نئے عہد نامے کے اس کے اردو اور فارسی ترجموں پر قائم ہے کہ جس سے زمانۂ بعد میں مسلمانوں کے درمیان کل کام کی بنیاد اس نے رکھی۔ اس کے وقت سے دنیا کے مسلمانوں کی زبانوں میں بائبل کے ترجمے کا کام وقتاً فوقتاً کیا جاتا رہا اور پورا ہو رہا ہے۔

ہنری مارٹن کے رسالوں کا جواب ان کی وفات کے ایک سال بعد ایک اور ایرانی مرزا محمد رضا کی قلم سے سنہ ۱۸۱۳ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب میں مرزا ابراہیم کی کتاب کے برابر علمیت۔ قابلیت اور عمدہ مزاج نہیں پایا جاتا لیکن ہنری مارٹن کے کمزور دلائل سے اس نے پورا فائدہ اٹھایا مثلاً قرآن کی عبارتوں سے محمد صاحب پر حضرت مسیح کی فضیلت ثابت کرنا۔ یہ کتاب بھی مثل زین العابدین کی کتاب کے کہ جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے ایسے دلائل سے کہ جن میں کتب مقدسہ

کی آیتوں کے مطالب کو بگاڑ کر پیش کیا گیا ہے اور ان کے غلط نتیجوں سے بھری پڑی ہے۔ اس مصنف نے بھی اپنی سخت جہالت کا کبھی کبھی اظہار کیا ہے مثلاً وہ لکھتا ہے کہ افلاطون نے مسیح کو ایک خط بھیجا!

ڈاکٹر فنڈر

ہنری مارٹن کے بعد قریب بیس برس سے کچھ زائد عرصہ گزر جانے پر ہندوستان کے مشنری لوگوں کی جماعت میں ایک مختلف قسم کا حامئِ مسیحیت ظاہر ہوا۔ یہ مشہور شخص ڈاکٹر کارل فنڈر ایک جرمن مشنری تھا جسے روسی سلطنت نے جورجیا کے قلعے شوشا سے شہر بدر کر دیا تھا۔ اس سے قبل وہ فارسی زبان سیکھ چکا تھا اور کئی مرتبہ ایران کا سفر بھی کیا تھا اور ایران ہی میں پہلی مرتبہ وہاں کے شہر کرمان شاہ میں اُس نے اپنی پہلی تصنیف میزان الحق شائع کی۔ یہ غور طلب بات ہے کہ اس سے اس قدر مخالفت پیدا ہوئی کہ لوگوں نے اُسے مار ہی ڈالا ہوتا۔

قریب ۱۸۳۵ء کے آگرہ میں سی۔ ایم۔ ایس کے کارپردازوں کی جماعت میں شامل ہوا اور کچھ عرصہ بعد مسلمانوں کے ساتھ بحث کرنے میں لوگ اُسے مسیحیت کا ایک بہادر مناظر ماننے لگے۔ اس نے میزان الحق کے علاوہ کئی اور کتابیں فارسی میں لکھیں اور ان تمام کا ترجمہ بعد ازاں اردو میں کیا گیا۔ لیکن گزشتہ صدی میں مسلمانوں کے لئے جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے کسی پر بھی اس قدر بحث نہیں کی گئی ہے جس قدر کہ میزان الحق پر۔ زمانۂ بعد میں اس کا ترجمہ عنقریب دنیا کی ہر اسلامی زبان میں کیا گیا۔

میزان الحق میں وہ کتب مقدسہ کی اصلیت کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔

بائبل کی خاص تعلیمات کی تشریح کرتا اور محمد کے رسول اللہ اور قرآن کے کلام اللہ ہونے کے دعاوی کی تردید کرتا ہے۔ اس کی دو اور کتابیں قابل ذکر ہیں۔

(۱) طریق الحیات ۔ اس میں گناہ اور اس کی ماہیت اور نتائج کا بیان کیا گیا ہے اور پھر نجات کے طریقہ کی تشریح کی گئی ہے ۔ یہ میزان الحق سے بھی بڑے پایہ کی کتاب ہے (۲) مفتاح الاسرار ۔ اس میں مسیح کے اعلیٰ مرتبہ کا ذکر ہے اور پھر اس کی بے مثل پیدائش اور معجزات ۔ ابنیت اور تثلیث کا بیان ہے۔

اگرچہ فنڈر کی تصنیفات بیشتر مقبول رہ چکی ہیں۔ اب یہ ماننا پڑتا ہے کہ آج کل ان کا کام خاص کر اور بہتر کتابوں کی ضرورت پیش کرتا ہے۔ ڈاکٹر فنڈر کی ایک کمی یہ ہے کہ اسلام کی تعلیم اور محمد صاحب کے اخلاق و عادات پر نکتہ چینی کئے بغیر مسیحی ایمان پر وہ لکھ نہیں سکتا تھا یا لکھنا چاہتا نہیں تھا۔ بعض موقعوں پر اس کے دلائل بھی کمزور ہیں کہ مسلمان مناظرین نے جن سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔

انیسویں صدی کے وسط سے بیشتر ڈاکٹر فنڈر شمالی ہندوستان کے بڑے مولویوں کے ساتھ ایک فیصلہ کن بحث میں پڑ گئے ۔ یہ بحث کچھ تو پبلک مناظروں کی صورت میں قریب تین برس تک آگرہ کی جامع مسجد میں ہوتی رہی۔ جو لوگ فنڈر کی مدد پر تھے ان میں والپی فرینچ بھی جو لاہور کے پہلے بشپ ہوئے شامل تھے۔ مولویوں کی جماعت میں صفدر علی اور عماد الدین تھے کہ جن کا ذکر کچھ آگے چل کر آئے گا۔ ان طول طویل مناظروں کے نتائج مختلف اور قابل ذکر ہیں۔ مسلمانوں کی طرف سے فنڈر کے دلائل کے جواب میں کتابیں اور رسالے شائع کئے گئے ۔ ایک مسلمان بنام کاظم علی خاص کر اپنی ضد پر اڑ گیا کہ بائبل کے چند

مقامات کے معنی جو وہ کرتا تھا ان کے سوا کوئی اور معنی ہو ہی نہیں سکتے۔ فنڈر کو جلد پتہ لگ گیا کہ یہ شخص جھگڑالو ہے اور اس نے یہ عقلمندی کی کہ اپنے اس مخالف سے کہا کہ اگر اس نے بہتر مزاج نہیں دکھایا تو اس کے ساتھ وہ بحث جاری نہیں رکھے گا۔

سر ولیم میور نے جو اس وقت کسی ضلع کے سول عہدہ پر سرفراز تھے تحریر کیا ہے کہ مسلمانوں نے دلائل پیش کرنے میں عام طور سے قابلیت اور ہوشیاری سے کام لیا تھا۔ لیکن ان کی کج فہمی نے جو ان میں عام ہے اور ان دلائل کے استدلال پر ضد کرنے کی حماقت نے کہ جن کا غلط ہونا دکھایا جا چکا تھا ان کی بحث کو بگاڑ دیا۔

یہاں ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ مسلمانوں کے مناظرین میں سے ایک نے اصرار کیا کہ کل معاملات زیر بحث کا آخری فیصلہ عقل کے ذریعہ ہونا چاہیئے۔

۱۸۴۵ء میں کسی مسلمان نے صولت الضیغم یعنی شیر کا حملہ نامی ایک کتاب شائع کی جو شمالی ہند میں برسوں تک مسیحیت کے خلاف ایک مقبول عام تصنیف رہی ہے اس کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ کس قسم کی باتیں اور کس پیرایہ میں لکھی ہیں۔ سر ولیم میور نے اس کے متعلق کہا ہے کہ "یہ بے ربط ضبط اور بے سلسلہ اعتراضات کا مسیحیت پر ایک حملہ ہے اور یہ کتاب کینہ اور دشمنی کی باتوں سے بھری ہے اس میں غلط دلائل کا استعمال کیا گیا ہے لیکن اس کا طرز زور دار اور دلکش ہے اس میں خداوند مسیح کے لئے فحش اور گستاخانہ زبان کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔"

اس میں بعض باتوں کی ذمہ داری خود فنڈر پر عائد ہوتی ہے کیونکہ اُس نے

دین دار مسلمانوں کی سریع الحسی کا کافی لحاظ نہیں رکھا اور نہ اس نے ہمیشہ اس طور پر لکھا کہ جس سے مخالفوں کے دل چھوٹے جائیں اور ان کے ذہن قائل ہوں۔ بہر حال اس سرگرم مناظرہ کا ایک مسرت انگیز پہلو بھی ہے یعنی جو مولوی صاحبان اس مناظرہ میں حصہ لے رہے تھے ان میں سے تین مولویوں نے آخر کار مسیحی مذہب قبول کر لیا۔ یہاں صرف دو کا مختصر ذکر ہم کریں گے۔

(۱) صفدر علی کا بپتسمہ جبل پور میں ۱۸۶۵ء میں ہوا۔ وہ اس ضلع میں سکولوں کا انسپکٹر مقرر ہوا اور کئی کتابیں تصنیف کیں کہ جن میں ایک اس کا رسالہ نیاز نامہ ہے اس رسالہ میں اس نے مسلمانوں کو اپنی تبدیلی مذہب کی وجہ بتائی ہے اس کتاب کی قدر کا خاص سبب یہی نہیں ہے کہ یہ ایک ایسے مولوی کی تصنیف ہے جو مسیحی ہو گیا بلکہ اس لئے بھی کہ تمام کتاب بہ مد روانہ طبیعت کے ساتھ لکھی گئی ہے۔

(۲) دوسرا مسیحی جو صفدر علی سے مختلف قابلیت کا شخص تھا عماد الدین ہے جسے رابرٹ کلارک نے ۱۸۶۶ء میں امرتسر میں بپتسمہ دیا۔ یعنی جس سال فنڈر ہندوستان چھوڑ کر چلا گیا عماد الدین کو بشپ ملین نے کلکتہ میں ڈیکن کے عہدہ پر ۱۸۶۸ء میں مقرر کیا اور پھر بعد ازاں لاہور میں بشپ فرنچ کا چپلین مقرر ہوا۔ ۱۸۸۴ء میں آرچ بشپ آف کنٹربری نے اسے ڈی۔ ڈی کی ڈگری عطا کی۔ ۱۹۰۱ء میں اس نے وفات پائی۔[1]

اس نے سچائی کی تلاش کے ابتدائی زمانہ کا واقعہ خود بیان کیا ہے جو نہایت ہی دلچسپ ہے۔ معلوم پڑتا ہے کہ گویا خدا نے عماد الدین کو فنڈر

---

[1] دیکھو واقعات عمادیہ جو پنجاب رلیجس بک سوسائٹی انار کلی۔ لاہور سے شائع ہوئی۔

کی جگہ کے لئے چن لیا تھا کیونکہ وہ مسیحیت کا زبردست حامی اور ایک بڑا مناظر ہُوا۔ اس نے بہتیرے مختلف مضامین پر بیس سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں کہ جس سے محمد صاحب کے چال چلن کو نقصان پہنچتا ہے اس کی ایک اور نہایت مشہور کتاب کا نام ہدایت المسلمین ہے کہ جس میں مضامین کے دوران میں کتب مقدسہ کی صحت کی بڑی زور سے حمایت کی گئی ہے۔ صفدر علی کے برعکس اس کا نشانہ تیز ہوتا تھا اور اگرچہ اس کی تصنیفات کا کسی زمانہ میں زبردست اثر رہ چکا ہے لیکن اب فنڈر کی کتابوں کی طرح اس کی بہتیری کتابیں استعمال کی نہیں رہیں۔

جدید اسلام کا ظہور

آگرہ کے مناظرہ سے بعض واقعات ظہور میں آئے لیکن چونکہ اس کتاب میں ان کا ذکر آچکا ہے اس لئے ہم یہاں صرف اشارۃً ان کا بیان کریں گے۔

(۱) اصلاحات کے پیشوا سر سیّد احمد خاں بانی علیگڈھ کالج کی ذات اور تعلیمات کے ذریعہ ایک جدید اسلام کا ظہور ہوا یعنی جو ہندوستان کے لئے جدید اور اصلاح شدہ اسلام تھا۔ سر سید ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوا تھا اس لئے جب فنڈر کے مناظرے کا لوگوں میں چرچا ہو رہا تھا اس وقت اس کی عمر قریب تیس سال کی تھی۔ معلوم پڑتا ہے کہ اس وقت لوگوں کے مذہبی خیال میں جو ہیجان پیدا ہو رہا تھا اس سے اس جیسے صاحب بصیرت اور دور اندیش شخص کے مذہبی نقطۂ نگاہ پر نہایت گہرا اثر پڑا ہوگا۔ زمانہ بعد میں جب اس نے انسانی عقل پر اس طرح زور دیا کہ گویا صرف یہی مذہبی فیصلہ کا واحد معیار ہے تو اس سے اس مناظرے کا ایک پہلو ہمیں یاد آتا ہے۔

(۲) دوسری تحریک انیسویں صدی کے دوسرے حصہ میں شروع ہوئی کہ جس کا کچھ سبب تو فنڈر کے مناظرہ سے جو لوگوں میں ہیجان پیدا ہوا تھا اس کا الٹا اثر ہے۔ اس کا بانی مرزا غلام احمدؐ قادیانی تھا (۱۸۳۹ء سے ۱۹۰۸ء) آگرہ میں جب مناظرہ ہو رہا تھا تو یہ ایک لڑکا تھا۔

ڈاکٹر عماد الدین نے یہ محسوس کیا کہ اسلام کے ان ہونہار مصلحین کی تعلیمات میں کچھ ایسی باتیں موجود ہیں جو انجیل کے لئے نئی روک اور مخالفت پیدا کریں گی۔ اور اس لئے اپنی امتیازی استعداد کے ساتھ ان لوگوں کی تعلیمات کو اور خاص کر مرزاء قادیانی کے متکبرانہ دعاوی کے رد کرنے میں اپنے آپ کو مصروف کیا۔

اس عرصہ میں مغرب کے مشہور علماء کی ایک جماعت نہ تو تبلیغی کام کی غرض سے اور نہ اس صورت حال کے سبب کہ جس کا ذکر ہم نے ابھی کیا ہے اسلام اور اس کے مآخذ کا مطالعہ کرنے لگی یعنی فلبینشر۔ فاوگل۔ نولڈکہ۔ گولڈزیہر۔ سنخاؤ۔ سپرنگر۔ سنوک ہراگر نئے وغیرہ۔

اس قسم کے مطالعہ کی قوتِ متحرکہ نے اور ساتھ ہی میدان تبلیغ کے بدلتے ہوئے حالات کے مطالبات نے یہاں ہندوستان میں کئی ایک قابل مخصوص شدہ لوگوں کو آمادہ کیا کہ وہ اپنے زمانہ کے مسیحیوں کو اسلام کی باتوں کے بتانے کی کوشش کریں۔

ایسے لوگوں میں سب سے مقدم سر ولیم میور کا نام ہے جو سول سروس کے عہدہ پر تھے اور جنہوں نے لائف آف محمدؐ (یعنی محمد صاحب کی زندگی) چار جلدوں میں لکھی ہے اور جو ۱۸۶۱ء میں شائع کی گئی۔ مشنریوں میں خاص طور پر قابل ذکر یہ ہیں۔ پادری ٹی۔ پی ہیوز (سی۔ ایم۔ ایس پشاور) جو

ڈکشنری آف اسلام (لغات اسلام) کے مصنف ہیں جو ۱۸۸۵ء میں شائع ہوئی۔ یہ سات سو پچاس صفحوں کی کتاب ہے جو بیش قیمت معلومات کا اب بھی ایک بڑا خزانہ ہے۔ ڈاکٹر ای۔ ایم۔ ویری (اے۔ پی۔ ایم لدھیانہ) ان کی سب سے مشہور تصنیف انگریزی کی تفسیر القرآن ہے جو چار جلدوں میں ہے۔ ڈاکٹر سنٹ کلیر تسڈل (سی۔ ایم۔ ایس ہندوستان و ایران) جو ینابیع القرآن وغیرہ کے مصنف ہیں۔ کپتن اڈورڈ سیل (سی۔ ایم۔ ایس مدراس) آپ کی تصنیفات سے بہتیری کتابیں ہیں جن میں سب سے مشہور فلیفۂ آف اسلام یعنی عقائدِ اسلامیہ ہے کہ جسے چار مرتبہ خود نظرِ ثانی کر کے آپ نے شائع کروایا۔

ان کے ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں میں انجیل کی منادی بھی مشہور واعظین کرتے رہے ہیں جن میں سے صرف چند کے نام یہ ہیں۔ والپی فرنچ۔ لیفرائے رولینڈ بیٹمین اور ڈاکٹر ہنبل۔ ان سبھوں نے ہندوستان کی آنے والی مسیحی نسلوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے اور بہتیرے مسلمانوں کو نہ صرف اپنا ہی مذہب صحیح طور سے سمجھنے کے قابل کر دیا ہے۔ بلکہ مسیحی انجیل کو بھی خوب سمجھایا ہے۔

دوسری فصل

اسلام کی طاقت کے ذرائع

ہمدردانہ مطالعہ کی ضرورت

زمانہ بدل چکا ہے اور زمانے کے ساتھ ساتھ ہمارے خیالات نے بھی پلٹا کھایا ہے۔ ہم بہتیرے ایسے لوگوں کی محنتوں میں داخل ہوئے ہیں جو اپنے طریقہ پر سچائی کی خاطر دلیر تھے لیکن اب ہم سچائی کے مفاد کی خاطر مسلمانوں کی بڑی قوم اور ان کے مذہبی یقینیات کو ایسے نقطۂ نگاہ سے دیکھنے پر مجبور ہوئے ہیں جو ان کے نقطۂ نگاہ سے کچھ مختلف ہے۔ خصوصاً یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ایسے دل و دماغ پیدا کریں کہ ان باتوں کو جو اسلام میں سچ اور قابلِ قدر ہیں معلوم کر لینے اور مان لینے کے لئے مستعد ہوں۔

اسلام کی طرف غیر مانوس طبیعت رکھنا خاص کر آسان ہے اور اس کی کئی وجوہات ہیں۔

ہماری طبیعت ایسی واقع ہوئی ہے کہ ہم اپنے مذہب کے سوا دوسرے مذاہب کی طرف ظاہری باتوں ہی کو دیکھتے ہیں مثلاً رسمی عبادت اور دستورات بے شک یہ باتیں جس طرح اور مذاہب میں اسی طرح اسلام میں پائی جاتی ہیں اور محض اندھاپن اور تعصب اس کی اچھی باتوں کو بھی دیکھنے سے ہمیں روک سکتا ہے۔

علاوہ اس کے ہم ان کی رائے اختیار کرنے کو زیادہ مائل ہیں جنہوں نے برسوں تک اسلام کے کھیت میں ہم سے پیشتر کام کیا ہے۔ بے شک کسی حد تک یہ فعل دانشمندانہ ہے لیکن اس میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ ان میں سے بہتیروں کا نقطۂ نگاہ ایسا تھا کہ ان کی تصنیفات کا زیادہ تر حصہ باطل ثابت کرنے والی نکتہ چینی کی قسم سے ہے اور اس قسم کی تصنیفات کے مطالعہ کے بعد اسلام اور مسلمانوں کی خوبیاں دیکھنا آسان کام نہیں ہے اس کے علاوہ چاہیئے کہ پاسِ عزت کے لحاظ سے ہم اپنی آزادانہ رائے قائم کرنے کی کوشش کریں۔

اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ نادانستہ طور سے ہم پر اس قسم کے شک کا اثر ہو جو اب تک بعضوں کے دماغ میں جگہ پکڑے ہوئے ہے کہ اسلام بالکل خدا کی طرف سے نہیں ہے۔ کیا لوگ نہیں گزرے ہیں کہ جن کی سنجیدہ رائے میں محمد وہ مخالف مسیح ہے کہ جسکا ذکر ۱۔ یوحنا ۲: ۲۲ میں پایا جاتا ہے۔

یقیناً ایسے مسیحی منادیا استاد کہ جن کے دماغ پر ایسے خیالات کا تسلط ہو وہ اس تعصب کی بناء پر نہ صرف اسلام کا صحیح مطالعہ کرنے کے ناقابل ہیں بلکہ مسلمانوں کو مسیح تک لے جانے کے نازک کام کی وہ اپنے اندر قابلیت نہیں رکھتے حال ہی میں ایک مسلمان نے مصنّف ہذا سے یہ کہا کہ "ایک مسلمان کے لئے جو یسوع مسیح کے نام کی عزت کرتا ہے۔ مسیحیت کا صحیح تصوّر قائم کرنا زیادہ اغلب ہے۔ بہ نسبت ایک مسیحی کے اسلام کا صحیح تصوّر قائم کرنا جو اسلام کا مطالعہ اس اعتقاد سے شروع کرتا ہے کہ محمد دھوکے باز تھا۔ اس خیال سے بے شک ہم متفق ہیں۔

اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ پیش آنے میں بحیثیت مسیح کے پیرو ہونے کے بے شک ہمارا خاص کام معلوم کرنے کے لئے تلاش کرنا اور پورا اثر نا ہے

برباد کرنا اور اکھاڑ پھینکنا نہیں ہے (متی ۵ : ۱۷) اسلام میں خدا کی حضوری کا جو کچھ ثبوت ہمیں ملے اور جو کچھ گواہی خدا کی ہستی اور عظمت کی ہم اس میں پائیں اس پر ہمیں خوشی کرنا چاہئے۔ اسی مزاج میں ہو کر ہمیں قرآن کا مطالعہ کرنا چاہیئے جو ایسی کتاب ہے کہ تیرہ صدی سے بے شمار سرگرم طالبانِ حق کی عزیز اور پاک ملکیت رہی ہے۔ یاد رہے کہ وہ جو کچلے ہوئے سرکنڈے کو نہیں توڑتا اور دھواں اٹھتے ہوئے سن کو نہیں بجھاتا۔ جس طرح کل معاملات میں اسی طرح اس معاملہ میں بھی وہ ہمارا استاد اور رہنما ہے۔ زمانہ حال میں غیر مسیحی مذاہب کا مطالعہ ہمدردی اور قدردانی کے ساتھ جنہوں نے کیا ہے ان میں مشہور عالم مرحوم ڈاکٹر جے۔ این۔ فارقوہر ہیں۔ اس قسم کے مطالعہ پر آپ کی رائے جو اگرچہ ہندو مذہب کے متعلق لکھی گئی ہے مگر چونکہ مطالعہ اسلام پر بھی صادق آتی ہے اس لئے ذیل میں پیش کرتا ہوں۔ آپ فرماتے ہیں۔ اس قسم کے مطالعہ میں مسیحی کو جو طبیعت اختیار کرنی چاہیئے کیا اس کے متعلق کسی قسم کا شبہ ہو سکتا ہے یہ ایک عالم آدمی کی خاموش۔ سنجیدہ۔ ہمدرد اور سچائی کی متجسس طبیعت ہے جو انسانی تحقیقات کے ہر دائرہ کی باتوں کو سمجھ لیتی ہے اور خاص کر مذہب کے دائرہ میں سیکھنے کی کوشش کو سب سے بڑھ کر دلی روشنی کی ضرورت ہے کہ جس سے اس کام میں مدد ملے اور اگر لوگوں کو مسیح کے لئے جیت لینے کی خواہش کے نقطۂ نگاہ سے ہم اس مسئلہ پر غور کریں تو بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ جس قدر پورے طور پر مسیحی مذہب اور ہندوستان کے دیگر مذاہب کی فضیلت کے باہمی مقابلہ کی بحث عوام کے سامنے آئے گی اتنا ہی زیادہ خاموش اور معقول طریق اور ایک ایسی مرضی کی ضرورت پڑے گی جو مذاہب کی تعلیم اور روایتی دستورات کے اچھے اور بُرے دونوں پہلوؤں کو پرکھے۔ کسر پنے اور تردید سے لوگ صرف پیچھے

ہٹیں گے"۔ اس بیان کے ساتھ بھی پورے طور پر متفق ہونے کو ہم مجبور ہیں۔
ہم ایسے زمانہ میں رہتے ہیں کہ جہاں دلیر اور حوصلہ مند ایمان کی ضرورت ہے۔ ایسا ایمان جو یہ ماننے کے لئے تیار ہو کہ دنیا میں مسیح کے وسیلے خدا کے بڑے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے دوسری قوموں اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کا بھی حقیقی حصہ ہے۔ ہاں ایسے ایمان کی بھی ضرورت ہے جو طرطولین (Tertullian) کا یہ قول مانتا ہو کہ انسانی روح اصولاً اور طبعاً "مسیحی" ہے۔
ان بے شمار چھوٹی چھوٹی سچائیوں کی موجودگی کا جو دوسرے مذاہب میں پائی جاتی ہیں ہمارے پاس سوائے اس کے اور کیا حل ہے کہ انسانی مخالفت اور خامی کے باوجود خدا کا روح لوگوں کے دل و دماغ میں برابر اپنا کام کر رہا ہے اس لئے ہمیں اپنے مطالعہ میں صبر سمجھ اور ہمدردی کی ضرورت ہے اور ایسے ایمان کی جو یہ مانتا ہو کہ اسلام میں خدا کی بادشاہت کے لئے کچھ ایسی چیز موجود ہے جو حقیقی قدر کے لائق ہے۔ اس باب کے اصل موضوع کی طرف رجوع کرنے سے پیشتر ایک اور بات بیان کر دینا ضروری ہے۔ گذشتہ زمانہ میں بہتیرے مسیحی علماء اسلام کے مطالعہ سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مذہب اسلام میں ترقی کی کوئی امید نہیں ہے۔ یہ نتیجہ راسخ الاعتقاد جماعت کے علماء کی تعلیم کے انجام پر مبنی ہے۔ ان علماء کی جماعت کی تعلیم سے میری مراد وہ اسلامی شریعت ہے جو ساتویں صدی مسیحی میں قائم کی گئی اور جس کے احکام ہر زمانہ میں مسلمانوں پر جاری ہیں۔ مرحوم لارڈ کرومر نے اسی خیال کو دوسری صورت میں یوں ظاہر کیا ہے کہ اگر اسلام کی اصلاح کی جائے تو اسلام نہیں رہتا۔
بہرحال ہمیں ان مایوس کرنے والی باتوں کے سبب ہمت نہ ہارنی

چاہیئے۔ یہ ممکن ہے کہ محمد کا ارادہ ایسے قوانین جاری کرنے کا ہو جس کے احکام ہمیشہ نافذ رہیں۔ اگرچہ جدت پسند مسلمانوں کو اسے ماننے میں تامّل ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ علمائے اسلام کا صدیوں سے یہ عقیدہ رہا ہو اور اس کی تعلیم دی ہو کہ خدا کے پاس اور سچائی لوگوں پر ظاہر کرنے کو نہیں ہے تاہم اگر یہ مان لیا جائے جیسا کہ ہم ابھی کہہ چکے ہیں کہ خدا کا روح ابھی اسلام میں کام کر رہا ہے تو ہم کون ہیں کہ اس ترقی کو محدود کر دیں کہ جس کا خدائے قادر کے زیر اثر ہونا بھی ممکن ہے۔ مصنف ہذا کا یہ خیال ہے کہ ایک زبردست طاقت اسلام میں کام کر رہی ہے جو اس کے کٹر سے کٹر ہادیوں کی پیش بینی کو باطل کر سکتی ہے۔ اور ساتھ ہی اس کے بہتیرے انجیل کے منادوں کو ان کی کم اعتقادی پہ جھڑک سکتی ہے۔ اسلام کے مطالعہ کرنے والوں کے ذہن کو شروع ہی میں دو حقیقتیں موثر کرتی ہیں اور ہمیشہ ہمیں یہ باتیں یاد رکھنی چاہیئیں۔ کیونکہ ہر مسلمان کے ذہن میں یہ ہمیشہ موجود رہتی ہیں۔

اسلام کی گذشتہ تواریخ:۔ محمد صاحب کے زمانہ سے لے کر قریب قریب زمانۂ جدید تک اسلامی تواریخ کے صفحات اسلامی سلطنتوں کے عظیم الشان دبدبہ و تمکنت سے بھرے پڑے ہیں۔ مسلمانوں کا فخر کے ساتھ تواریخ کے ان ایام کا ذکر کرنا کیا کوئی بڑی حیرت کی بات ہے یعنی پہلی صدی ہجری میں عرب اور اس کے مضافات میں مسلمان جرنیلوں کی فتوحات۔ محاربات صلیبی کے ایام میں ملک شام اور مصر میں سلطان صلاح الدین کے کارنامے۔ سلیمان اعظم کی شان شوکت۔ ملک ترک میں دولت عثمانیہ کا قیام۔ پھر آخر میں جو ان سے کم نہیں۔ ہندوستان کے مغل شہنشاہوں کا جاہ و جلال۔

مسلمانوں کی موجودہ تعدادی طاقت۔ جریدہ ٹائمس مئی ۱۹۲۹ء

کے مطابق دُنیا کی آبادی کا شمار تخمیناً ایک ارب اسّی کروڑ ہے مسلمانوں کی تعداد کم از کم تئیس کروڑ پچاس ہزار ہے۔ ان کا یہ شمار دُنیا کی آبادی کا آٹھواں ⅛ حصہ ہے اور یہ قریب القیاس ہے کہ عنقریب ہمیں یہ کہنا پڑے کہ اسلام دنیا کی آبادی کا ⅐ حصہ ہے لیکن مختلف ممالک کی مردم شماری کی تعداد کی موجودگی میں مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ ان کا شمار دنیا میں چالیس کروڑ ہے محض مبالغہ ہے۔ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کے مسلمانوں کا شمار سات کروڑ ستھتر لاکھ تینتالیس ہزار نوسو اٹھائیس ہے۔ یہ باتیں ذہن کو مؤثر کرنے والی ہیں اور اگر مسلمانوں کو ان پر فخر نہ ہو تو وہ انسان نہیں اور ہمیں یقین رکھنا چاہیئے کہ جب تک اس قسم کے فخر کی موجودگی کو ہم اُن میں جائز و مناسب نہ سمجھیں اور خاص کر اس تغیر پذیر زمانہ میں ہم ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنیت کو پُورے طور پر ہرگز نہیں سمجھ سکتے۔

اب ہم اسلام کی اُن چند باتوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو اس کی طاقت کے ذرائع ہیں۔ اسلام کا ایک مصنّف کہ جس نے بغور اس کا مطالعہ کیا ہے لکھتا ہے:۔ "اسلام میں اثر قائم رہتا ہے خصوصاً اس لئے کہ یہ ایک مذہب ہے۔ جماعتی اور سیاسی حیثیت میں اسلام خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ اپنے ذاتی طور پر ایک دینی طریقہ ہے۔ جو اپنے پیروؤں کی مذہبی زندگی کو برقرار رکھتا ہے۔ اگر اسلام اپنے ان اثرات کے ساتھ کہ جن کے ذریعہ لوگوں کا ایمان زندہ رہتا ہے یہ انسانی روح کی کچھ ضروریات کو ایک حد تک پُورا کرنے کے قابل نہ ہوتا تو ہماری اسلامی جماعت کے کروڑوں لوگوں کے حق میں یہ وہ طاقت نہ ہوتا جو آج ہے۔"

یہ بالکل سچ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے بعض عقائد اور اعمال کے ذریعہ ایک حد تک اصل روحانی تحریک ملتی ہے۔ ان میں سے صرف چند ہم ذیل

ہیں پیش کریں گے۔

تصوّرات کی سادگی

(۱) اسلام کے خاص مذہبی تصوّرات میں سادگی پائی جاتی ہے۔
(ا) اسلام لوگوں کے دلوں میں گہرا یقین پیدا کرتا ہے کہ خدا واحد ہے اور زندہ ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس کی سادگی ہی شرک اور پیر پرستی کی اُلجھنوں کے درمیان ہمیشہ اطمینان بخش ثابت ہوئی ہے۔
(ب) ... ہی تصوّر کے ... اللہ اکبر کا لگاتار اعلان ہے۔ اس سے سچے مومنوں کے دلوں میں ویسا ہی احساس پیدا ہوتا ہے جو بنی اسرائیل کے اُس مزمور نویس کے دل میں موجود تھا کہ جس کا یہ قول ہے کہ میرے ساتھ خداوند کی بڑائی کرو۔ ہم مل کر اُس کے نام کی تمجید کریں (از بور ۳۴ : ۳)
(ج) مسلمانوں کو پورا یقین ہے کہ خدا نے لوگوں پر اپنی مرضی نبیوں کے ذریعہ ظاہر کی ہے اور یہ کہ سچائی کتاب میں پائی جاتی ہے۔
(د) اُن کا ایمان مردوں کی قیامت پر ہے اور ان کا عقیدہ ہے کہ خدا روزِ انصاف کا مالک ہے۔
(ہ) اُن کا ایمان ہے کہ خدا سے جو دعا کی جاتی ہے وہ مؤثر ہوتی ہے۔
یہ سچ ہے کہ عقائد مذکورہ میں ایک بھی امتیازی حیثیت سے اسلامی نہیں ہے لیکن تاہم اسلام میں یہ باتیں موجود ہیں اور ان کا کچھ قوی اثر مسلمانوں کے ذہن پر ہوتا ہے اسے ماننا چاہئے۔

اسلامی عبادت سے مذہبی تحریک کا حاصل ہونا

(۲) اسلام کی طاقت کا دوسرا عنصر اسلامی عبادت کے وہ طریقے ہیں جن سے انسان کی مذہبی طبیعت تحریک پاتی اور عمل میں ممد ہوتی ہے۔

(ا) روزانہ نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے وہ اعلیٰ جذبات کے اظہار کا ذریعہ بڑے جوش کے ساتھ بنا لیا جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ان نمازوں کا بار بار دن میں پانچ مرتبہ پڑھنا مسلمانوں کو رسمی عبادت کے خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ لیکن اس سے اُن کی ایسی عادت پڑ جاتی ہے کہ جس میں نیکی کے لئے بڑے بڑے ممکنات موجود ہیں۔

نماز کے حرکات اور تلاوت اور پھر اس کا باہم جماعت کے ساتھ ادا کرنا اِن پر بہت بڑا اثر ڈالتا ہے یعنی رکوع و سجود و تلاوت اکثر مسلمانوں کو خدا کے سامنے عاجزی کرنے اور اس کا شکر ادا کرنے کا موقعہ دیتے ہیں۔

(ب) مسلمانوں پر جو اذان کا اثر ہوتا ہے اس پر غور بھی کرنا چاہئے۔ اگرچہ ایسے لوگوں کا شمار کم ہے جو اذان سُن کر نماز پڑھتے ہیں تاہم ہر مسلمان کو اذان کے سُننے سے فخر اور اطمینان کا احساس ہوتا ہے۔ اُسے فخر ہے کہ اس اذان کے ذریعہ اسلام کے عقیدہ کی عزت ہوتی ہے اور اُس کا اعلان کیا جاتا ہے۔

(ج) اسی قسم کا اثر ایک ہی قبلہ کے ہونے سے بھی اُن پر ہوتا ہے۔ ہر مسلمان نماز پڑھتے وقت مکہ کی طرف مُنہ کر کے نماز کی نیت باندھتا ہے اور اس سے وہی دلی آسودگی اُسے حاصل ہوتی ہے جو دانی ایل کو اُس وقت ہوتی تھی جب وہ بابل میں اپنی کھڑکیوں کو کھول کر یروشلیم کی طرف منہ کر کے

تین مرتبہ روزانہ دُعا مانگا کرتا تھا۔

مکہ کی طرف منہ کرنا ایک جمہوری اور عالمگیر مذہبی رسم ہے۔ جس سے مسلمانوں کو بہت بڑا تیقّن نہ صرف نماز کے وقت حاصل ہوتا ہے بلکہ بستر مرگ پر بھی کہ جب اس کا چہرہ آخری وقت قبلہ کی طرف کر دیا جاتا ہے۔ اسی سے بہتیرے غمزدے اپنی میت کے جسم کو قبر میں سیدھی جانب اور اُس کے چہرے کو قبلہ رُخ لٹا کر سُپردِ خاک کرتے وقت تسلی حاصل کرتے ہیں۔

(۵) رمضان کے روزے حقیقی مذہبی اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ اُن کے ذریعہ ایماندار کے قوتِ ارادہ پر بڑا زور ڈالا جاتا ہے اور اُن سے خود ضبطی کی قوّت اِن میں پیدا ہوتی ہے اور ان کا ایمان ادنیٰ چیزوں سے اوپر کی طرف پرواز کرتا ہے۔

(۶) ذکر۔ مذہبی جذبات کو ظاہر کرنے کا ایک طریقہ ہے کہ جس کے ذریعہ مسلمان کسی صوفی کا مُرید ہو کر خدا کے ساتھ رفاقت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس قسم کی عبادت میں اُن کا دعوےٰ ہے کہ زبان و دل دونوں یادِ الٰہی میں مصروف ہوتے ہیں۔ اس قسم کا شغل اپنے ہم خیال لوگوں کی جماعت میں یا تنہا کیا جاتا ہے۔ رات کے اوقات کو ترجیح دی جاتی ہے۔ بعض مسلمان صبح ہونے سے بہت پیشتر مقررہ عبادتوں کے لئے بیدار ہوتے ہیں۔

جماعتی اتحاد کے احساس کی طاقت

(۳) اندرونی طاقت کی ایک اور صورت مسلمانوں میں جماعتی یگانگت کا احساس ہے۔

(ل) یہ وہ احساس ہے کہ جس کے ذریعہ ساری قوموں کے مسلمان دُنیا کے تمام حصّوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ اُن کی مذہبی تعلیم یا جماعتی دستور یا قومیت کے اختلاف خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں ہمیشہ اُن میں یہ احساس موجود رہتا ہے کہ وہ ایک ایسی بڑی برادری کے شریک ہیں کہ جو درحقیقت اُن اختلافات کے مافوق ہے۔

(ب) یہ احساس تمام مومنوں کے مساوات کے اصول پر مبنی ہے۔ مثلاً مسجد میں جب بادشاہ اور رعایا پاس پاس کھڑے ہوتے ہیں تو دونوں خدا کے سامنے برابر ہیں۔

(ج) اسی سلسلہ میں حج کی رسوم کے اخلاقی اثر پر بھی غور کرو اپنے ہم مذہب کی اس قدر کثیر جماعت پر نظر ڈالنا جو مختلف قوموں اور قبیلوں اور مختلف زبانیں بولنے والوں سے وہاں جمع ہوتی ہے۔ اُن کے ایمان اور فخر کے لئے بیشک عجیب قوت محرکہ ہے۔

قرآن کا اثر

(۴) قرآن کے اثر پر غور کرنا چاہیئے جو اُس کے تلاوت کرنے والوں پر اور اُن ناخواندہ لوگوں پر ہوتا ہے جو بڑی سنجیدگی اور رقّت کے ساتھ اُس کی تلاوت کو سُنتے ہیں۔ اگرچہ موسیقی کا سُننا مسلمانوں پر حرام ہے تاہم بہتیروں کے لئے قرآن کی تلاوت یا قرأت موسیقی کا بدل ہے۔

اسی کے ساتھ ایک اور قسم کی تلاوت ہے یعنی باری تعالےٰ کے ننانوے اسماء الحسنیٰ کو کبھی تسبیح پر اور کبھی یوں ہی پڑھنا۔ ان طریقوں سے خدا کا دھیان کرنا یقیناً اسلام کی ایک پُر اثر طاقت ہے۔

محمد کو کامل نمونہ کی حیثیت میں پیش کرنا

(۵) مسلمانوں میں اس قسم کی کوشش کا خیال جیسا ہم بیشتر دیکھ چکے ہیں آج کل بڑی صفائی سے پایا جاتا ہے۔ یہ کہنا مبالغہ سے خالی ہے کہ مسلمانوں کے ذہن میں جس قدر نمایاں طور پر خدا کا تصور موجود ہے قریب قریب اسی قدر محمد کا بھی کلمہ اس کا سبب ہے۔ کلمہ میں اس بات کا اظہار ہے کہ خدا اُن کے ہادی کا خدا ہے اور کہ وہ سب سے آخری اور خدا کا سب سے بڑا نبی ہے۔ حقیقتاً اسلامی غیرت اور وثوق کا یہ سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔

اس کے ثبوت میں مندرجہ ذیل باتوں پر غور کرو۔

(ا) مولود کا اثر جو محمد کی پیدائش کی یادگار میں ہر سال بڑی جماعت کے سامنے کیا جاتا ہے۔ ان جلسوں میں محمد کی زندگی اور کامیابی کا ذکر نثر و نظم میں لوگوں کو سنایا جاتا ہے اور جماعت بیچ بیچ میں درود پڑھتی ہے کہ جس میں خدا کی برکت محمد کے لئے مانگی جاتی ہے۔

(ب) نورِ محمد کی تعلیم کا وہ عقیدہ جو صدیوں سے مسلمانوں میں نہایت پسندیدہ تعلیم رہی ہے۔ اس عقیدے کا یہ مطلب ہے کہ دنیا کی پیدائش کے قبل ہی خدا نے اپنے نور سے ایک حصہ علیحدہ کر دیا اور یہ نور محمد میں اُس کی پیدائش کے وقت داخل ہونے کے لئے مقرر ہو چکا تھا (دیکھو صفحہ ۱۷۶) اس عقیدے میں دو اور باتیں پائی جاتی ہیں یعنی محمد کی ازلیت اور ایمانداروں کے لئے سفارش کرنے میں آسمان پر اُس کا سب سے بڑا اثر۔

ان باتوں سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ آج کل اسلام کی خاص روحانی طاقتیں ایک کامل ہادی کے لئے اخلاقی جوش اور شخصی عقیدت مندی کی صورت

میں یک جا اکٹھی ہو رہی ہیں۔
چند ایسے اور امور بھی ہیں کہ جو امتیازی حیثیت سے اس قدر اسلامی نہیں ہیں کہ جتنی اور باتیں لیکن مسلمانوں کے خیالات پر ان کا بڑا اثر ہے اور بہتیروں کی زندگی ان کے تحت بن رہی ہے۔ ہم ان باتوں کا یہاں محض خاکہ ہی کھینچ سکتے ہیں۔
(ل) ان کا پختہ یقین کہ موت کے بعد زندگی ہے کہ جہاں جزا و سزا ملیگی اور اسی یقین پر غازی جو اسلام کی حمایت میں لڑتا ہے خوشی کے ساتھ موت کا مقابلہ کرتا ہے۔ فقیر یعنی دل کا غریب بطیب خاطر غریبی کی برداشت کرتا ہے اور جن میں بُری خواہشیں ہیں وہ جہنم کے عذاب کے خوف سے بُری خواہشوں کو پورا کرنے سے باز رہتے ہیں۔
(ب) مسلمان بُت پرستی کو ذلیل سمجھتے ہیں اور اُسے بُرا ٹھہراتے ہیں۔
(ج) اسلامی جماعت بحیثیت مجموعی منشی اشیاء کا استعمال قطعاً بُرا سمجھتی ہے۔

تیسری فصل

اسلام کا غیر مکتفی ہونا

اسلام کے قابلِ قدر اور طاقت بخش عناصر کا پتہ لگانے اور اُن کو مان

لینے کے بعد اب جب ہم اُسی صاف دلی اور دوستانہ طبیعت کے ساتھ اُس کے نقائص کو ظاہر کرنے کی طرف متوجہ ہوں گے تو ہم پر تعصب کے الزام لگانے کی اس قدر گنجائش کسی کے لئے باقی نہیں رہے گی۔

ہر صورت اسلام کے دعاوی اور اُس کے نقائص کا مطالعہ اور بھی ضروری ہے۔ مسلمانوں کے لئے یہ ایک عام بات ہے کہ وہ کئی ایک وجوہات کی بنا پر یہ دعوے کرتے ہیں کہ تمام لوگوں اور تمام زبانوں کے لئے اچھے سے اچھا جو مذہب ہو سکتا ہے وہ اسلام ہی ہے اور یوں مسیحیت کے حریف کی صورت میں اسے پیش کرتے ہیں اور اس لئے اس مذہب کو اور بھی اچھی طرح جانچنے کے لئے ہم مجبور ہیں تاکہ معلوم کریں کہ کیا لوگوں کی زندگیوں پر شخصی طور سے اور جماعت پر مجموعی حیثیت سے ایسی نیکی کے اثر ڈالنے کی طاقت اس میں موجود ہے جو مسیحیت میں نہیں ہے اور درحقیقت یہی نہایت اہم سوال ہے کہ جس سے ہمارا تعلق ہے۔

فی الحال ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ وسیع معنوں میں مسلمان دو طرح کے خیالات پر منقسم ہیں۔ اوّل مسلمانوں کی وہ جدید اور اصلاح پذیر جماعتیں ہیں جو قرآن کی نئی تفسیر کرتے ہیں اور جن کے طریقے ترقی کرنے والے ہیں مثلاً جماعت احمدیہ۔ دوم مسلمانوں کی راسخ الاعتقاد جماعت جو ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں اسی عقیدہ اور اعمال کی پیرو ہے جو تیرہ صدی سے منتقل ہوتے چلے آرہے ہیں۔

چونکہ گزرے باب میں ہم مسلمانوں کی جدید جماعت کے لوگوں کی تعلیم و خیالات کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ اس لئے اس فصل میں راسخ الاعتقاد گروہ تک اپنے بیان کو ہم محدود رکھیں گے لہذا اب ہم غور کریں گے کہ راسخ الاعتقاد جماعت کے ایمان میں کون سے خاص نقائص ہیں۔

محمد صاحب کے عادات واخلاق

اگرچہ یہ بات عجیب معلوم پڑیگی کہ ہم نے پہلے ہی محمد صاحب کو غور وفکر کے لئے چن لیا ہے تاہم ایسا کرنے کا کافی سبب موجود ہے۔ یہ صریحاً ظاہر ہے کہ محمد صاحب اسلام کا سرچشمہ نہیں تو کم ازکم اُس اسلام کا وسیلہ ہیں کہ جس سے ہم واقف ہیں اور جسے قرآن میں ہم پاتے ہیں جو کسی مصنّف کے خیال کے مطابق حقیقی معنی میں اس کی زندگی کا روزنامچہ ہے۔ اُس کے عادات واخلاق کیسے تھے۔ خواہ کتنا ہی کیوں نہ چاہیں ہم اس مسئلہ کو خاموشی سے نظر انداز نہیں کرسکتے۔ تمام فرقوں کے مسلمان جو خاص اہمیت اپنے نبی کو دیتے ہیں اُن کے سبب سے ہم اُس کا اخلاق جانچنے کو مجبور ہیں۔

محمد صاحب کی نسبت عجیب متضاد خیالات لوگوں میں پائے جاتے ہیں جن میں سے بعض اس پر دھبہ لگاتے ہیں تاہم یہ کہنا غالباً صحیح ہے کہ اب تک کسی مسلمان نے کھلے طور پر اُن کی سوانح حیات وعادات پر اس طرح تنقید کرنے کی جُرأت نہیں کی ہے۔ اسی سلسلہ میں مسلمانوں کی یہ شکایت چند برسوں سے روز بروز بڑھ رہی ہے کہ مسیحی مصنّفوں نے اپنے مخصوص تعصب کے سبب ایسے بیانات کا استعمال کیا ہے جس سے محمد صاحب کے عادات و اخلاق کو صدمہ پہنچتا ہے اور جو صرف مستند اسلامی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس لئے یہ نہایت ہی ضروری ہے کہ ہم بڑی احتیاط برتیں کہ ہماری معلومات کے ذرائع ایسی کتابیں نہ ہوں جو عام طور پر علمائے اسلام میں غیر معتبر سمجھی جاتی ہیں لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جب مسلمان گھبرا کر قدیم مصنّفوں کے بیانات کا انکار صرف اس بنا پر کریں کہ انہوں نے اپنے نبی کے عادات واخلاق کے

متعلق کچھ ایسی باتیں تحریر کی ہیں جو آج کل ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں تو اُن کی اس حرکت سے ہم اپنے آپ کو بچائیں۔

ذیل میں بہرحال محمد صاحب کے عادات و اخلاق کی بنسبت مسلمانوں کے خیالات پر سرسری طور سے غور کرنے پر ہم اکتفا کریں گے۔

(۱) مسلمانوں کے قدیم مورّخوں کی تصنیفات کا مطالعہ بلا تعصب کرنے والوں پر ظاہر ہے کہ اِن مورخوں نے یہ محسوس نہیں کیا کہ جو ناپسندیدہ بیانات محمد کے متعلق اُنہوں نے تحریر کئے ہیں اور جن کے اقتباس کے لئے یورپین مصنّفین پر الزام لگایا جاتا ہے۔ حقیقتاً اُن کی زندگی پر اخلاقی دھبے ہیں۔ برعکس اس کے وہ ان باتوں کا ہونا مناسب ٹھہراتے ہیں معلوم پڑتا ہے کہ اُن کا خیال تھا کہ جو باتیں اپنے لئے بُری ہیں وہ خُدا کے نبی کے لئے بُری نہیں ہو سکتیں علاوہ اس کے یہ کہنا درست ہے کہ قریب قریب زمانہ حال تک مسلمانوں کا عام خیال یہی تھا جیسا کہ اب بھی راسخ الاعتقاد جماعت کے لوگوں کا ہے اگر اس کے ثبوت کی ضرورت ہو تو احادیث کے مجموعہ مثلاً مشکوٰۃ المصابیح کی عام مقبولیت سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ جس میں ایسے بیانات موجود ہیں جو عوام کے سامنے پڑھے جانے کے لائق نہیں۔

(۲) صدیوں کے دوران میں محمد صاحب کی زندگی رفتہ رفتہ کامل نبی کی حیثیت میں پیش کی گئی ہے۔ اس لئے اس نئی اور مقبول عام سیرتوں میں ایسی باتیں پائی جاتی ہیں جو تواریخی محمد میں موجود نہیں ہیں مثلاً یہ بات اکثر ظاہر کر دی گئی ہے کہ بعض خطابات و القاب جو صحیح طور پر صرف خداوند مسیح کے نام کے ساتھ مستعمل ہیں۔ بے وجہ طور پر پیغمبر اسلام پر اُن کا اطلاق کیا گیا ہے (مقابلہ زویمر کی کتاب مسلم کرائسٹ)

(۳) آج کل مسلمانوں میں محمد صاحب کے لئے ایک نیا احساس عزت پایا جاتا ہے کہ جس کے سبب وہ محمد صاحب کے عادات و اخلاق کی تنقید سے بھڑک اُٹھتے ہیں۔ مثلاً جماعت احمدیہ محمد صاحب کے متعلق ایسے بیانات اور احادیث کو غیر معتبر ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہے کہ جن سے اُن کی اخلاقی زندگی پر عیب لگتا ہے لیکن اُن سے یہ دریافت کیا جا سکتا ہے کہ اگر ان بیانات و احادیث کو جعلی قرار دے کر اُن کا انکار ممکن ہے تو پھر یہ کن کی دماغی اختراع ہیں۔ اس کا تو انکار کوئی نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کی کتابوں میں یہ احادیث موجود ہیں۔ کوئی یہودی یا عیسائی انہیں لکھ نہیں سکتا بلکہ یہ کام بعض مسلمانوں ہی کا ہے جنہوں نے یہ خیال کیا ہوگا کہ یہ باتیں یا تو نادرست نہیں ہیں یا نبی کے لئے ناموزوں نہیں ہیں۔

(۴) برعکس اس کے جب محمد صاحب کی زندگی کے کسی واقعات کا انکار کسی بنا پر ممکن نہیں۔ مثلاً راوی کا غیر معتبر ہونا تو زمانۂ حال کے حامیانِ اسلام ان واقعات کو کامل نمونہ کے نبی کیلئے لازم ٹھہراتے ہیں۔ اگرچہ ان کی ایسی دلیل عام توقع کے خلاف ہی کیوں نہ ہو محمد صاحب کی لڑائیوں کی تائید میں یہی استدلال پیش کیا جاتا ہے۔

خدا کا اسلامی تصوّر

اسلامی عقیدہ کی مضبوطی اور کمزوری جس صفائی کے ساتھ اسلامی توحید الٰہی سے ظاہر ہوتی ہے کہ جس پر مسلمانوں کو بڑا فخر ہے اور کسی جگہ اسلام میں ظاہر نہیں ہوتی۔ مسلمانوں کی اس گواہی کی تعریف کرنے سے کوئی انکار نہیں کر سکتا جو وہ مشرکوں کے اثر کے درمیان اس سچائی سے مدتوں سے برابر دیتے آئے ہیں کہ سارے جہان کا معبود ایک زندہ خدا ہے۔

لیکن خدا کے ایک ہونے پر اُن کے اس نہایت زور دینے کا ماحصل کیا ہے۔ یہاں خدا کے ایک ہونے سے جو کچھ مُراد ہے یہ وہ الٰہی وحدانیت نہیں ہے جو عام طور پر اس سے سمجھا جاتا ہے یعنی بلاشبہ یہ یہودیوں کی تعلیم وحدانیتِ الٰہی نہیں ہے۔ اسرائیلی انبیاء کے صحیفوں میں واحد اور اکیلا خدا سب باتوں سے پہلے پاک اور راست تھا۔ انہوں نے خدا کے اخلاق پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ اور اس بات میں مسیح بھی اُن کے مانند تھے۔ لیکن اسلام نے خدا کے ایک ہونے پر اس قدر مبالغہ کے ساتھ زور دیا ہے کہ خدا کی اخلاقی صفات کو اس سے نقصان پہنچا ہے۔ اور دوسرے درجہ پر آگئی ہیں۔ اسلام کی تعلیم میں خدا کا ایک ہونا سب سے پہلے اور اپنی اصلیت میں گنتی کی ایک اکائی ہے۔

اس تعلیم سے چند باتیں لازمی طور پر نکلتی ہیں۔ اگرچہ مسلمانوں میں بعض اعلیٰ خیالات کے لوگ بھی پائے جاتے ہیں اور ہم خوشی سے اُن کی تصدیق کرتے ہیں۔ تاہم عام طور پر خدا کی نسبت جو خیال مسلمانوں میں پایا جاتا ہے اُس سے خوف۔ غلامی کی طبیعت۔ رسم پرستی اور پژمردگی زندگی اور عمل میں پیدا ہوتی ہیں۔

اللہ سے اس قدر محبّت نہیں کی جاتی جس قدر کہ اس سے ڈرا جاتا ہے۔ اسلام سکھاتا ہے کہ سب سے بڑا حکم یہ ہے کہ "تو اپنے خداوند خدا سے ڈر"۔ اس لئے انسانی دل کے محبتانہ جذبات اور سرگرم اُلفت کا ولولہ ان میں بہت کم تحریک پاتا ہے کہ جس کا سرچشمہ وہ یقین ہے جو خدا کی محبت کے اس علم سے پیدا ہوتا ہے جو خدا کو انسانوں کے ساتھ ہے۔

انسان تاکیداً خدا کا بندہ ہے اور اس کی رحمت کا بالکل محتاج ہے اور اسی سبب سے مسلمانوں کی کثیر جماعت اب تک مذہبی فرائض کو خدا کے قہر اور سزا سے بچنے کے لئے بجالاتی ہے۔ اس عقیدے سے ان میں سخت اور کٹر طبیعت پیدا ہو جاتی ہے کہ جس کے سبب یہ اُن تمام لوگوں کو عام طور پر نفرت کی نگاہ سے دیکھتے جو خدا کی ذات میں محبّت کو اس کی خاص صفت مانتے ہیں۔

گناہ اور اس کی مُعافی

عام طور پر مسلمان کے خیال میں گناہ کسی اخلاقی بُرائی کا نام اتنا نہیں ہے جتنا کہ کسی ایسے فعل کا کرنا ہے جس کی ممانعت کی گئی ہے (دیکھو صفحہ ۱۳۵) ہاں یہ صحیح ہے کہ بعض اخلاقی برائیاں مثلاً غرور اور لالچ صفائی کے ساتھ گناہ مانی گئی ہیں۔ زیادہ صحت کے ساتھ اسی خیال کو ہم یوں پیش کر سکتے ہیں کہ گناہ سے عام طور پر انسان کی فطری حالت نہیں سمجھی جاتی ہے بلکہ جن رسوم کا حکم ہے اُن کو توڑنا گناہ کہلاتا ہے۔ قرآن کی تعلیم کے مطابق انسان اپنی فطرت میں ضعیف تو ہے مگر گناہ آلود نہیں ہے۔ ہمارے سامنے اس امر میں نادر حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی تعلیم کے مطابق وہ گناہ جس کی معافی نہیں مل سکتی ہمارے توقع کے بالکل برعکس ہے۔ یہ گناہ پاک رُوح کے خلاف خطا کرنا نہیں ہے

کہ جس کے متعلق مسیح نے ہمیں بتایا ہے بلکہ شرک ہے یعنی کسی بدعتی تعلیم کو دل میں جگہ دینا اور پھر یہاں تعلیم وحدانیت کا وسیع اثر ہمیں نظر آتا ہے جس سے مراد خدا کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانے کی بدعت کا مرتکب ہونا ہے۔ اس تصور کی روشنی میں بہتیرے معبودوں کو ماننا اور عقیدۂ تثلیث دونوں یکساں لعنتی ہیں۔ دوسری طرف اگر کوئی رسوم کے احکام پورا کرنے سے معذور رہے تو اسلام میں اُن کو پھر پورا کرنے کی ایسی خاص صورتیں مہیا کردی گئی ہیں کہ جن سے ان گناہوں کی تلافی ہوجاتی ہے مثلاً نماز یا اس کا قضا اسماءالحسنیٰ اور کلمہ کا ورد۔ زکوٰۃ۔ خیرات۔ روزہ اور حج۔ ان کے ذریعہ مومن اپنے لئے ثواب بھی جمع کرتا ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جن مسلمانوں کے خیالات اس قسم کے ہیں ان میں صحیح اخلاقی مفہوم میں گناہ پر حقیقی تاسف اور سچی توبہ جس کے شامل بری راہوں سے پھر کر پاک زندگی بسر کرنے کا مصمم ارادہ ہو اکثر نہیں پایا جاتا۔ اُن کے نزدیک گناہوں کی معافی نہایت آسان بات ہے جیسا کہ آگے چل کر ہم دیکھیں گے اور یہ اس وجہ سے کہ گناہ کی اصلی حقیقت جو خدا کی محبت کے خلاف خطا کار ہونے میں ہے اس سے مسلمان ناواقف ہیں۔

عبادت

مسلمانوں کی عبادت میں اندیشہ ہے کہ یہ رسمی بن جائیں اور محض عادتاً بجالائی جائیں۔ یہ خطرہ مسلمانوں کے علاوہ اوروں کے لئے بھی ہے۔ لیکن مسلمانوں کے لئے اور بھی زیادہ ہے کیونکہ ان کی عبادتوں کا عربی زبان میں ہو لازمی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہتیرے مسلمانوں کے لئے خصوصاً جن کی

مادری زبان عربی نہیں ہے عبادت ایک ایسا ادنٰی فعل بن جاتا ہے کہ جس میں دماغ شریک نہیں ہوتا۔

ایک مرتبہ جب عربی دعائیں یا آیتیں حفظ ہو جاتی ہیں تو پھر دماغ پر کوئی زور نہیں پڑتا۔ عبادت میں اس طرح بار بار دہرانے سے عبادت کرنے والے کے دل و دماغ پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ غرض کہ ایسے لوگوں کے لئے عبادت ایسے فرض کا پورا کرنا ہے کہ جس کا خدا نے حکم دیا ہے مگر خدا کے سامنے اپنے دل کو ولولہ کے ساتھ انڈیل دینا نہیں ہے۔

عورتوں کی نسبت مسلمانوں کے خیال

اس معاملہ میں مسلمانوں کو بڑا رشک ہے اور ان کے احساس کو چوٹ لگتی ہے۔ اس موضوع پر ہر طرف سے نکتہ چینی ہونے کے سبب عام طور پر اب تعلیم یافتہ مسلمان یہ ظاہر کرنے لگے ہیں کہ اسلامی شریعت نے عورتوں کو وہ حقوق عطا کئے ہیں جو اور کسی مذہب نے انہیں نہیں دیئے ہیں۔ مرحوم سیّد امیر علی نے لندن میں اپنی ایک تقریر کے دوران میں یہ کہا کہ جو کچھ اسلام نے عورتوں کی ترقی کے لئے کیا ہے وہ کسی اور مذہب نے اُن کے لئے نہیں کیا۔

اس قسم کا تصوّر کمالیت ایک بات ہے لیکن حقیقت دوسری بات ہے جو باتیں ہمارے لئے واقعات ہیں اُن کے ذریعہ ہم فیصلہ کرتے ہیں اور ایسے واقعات مثلاً پردہ کی قید کہ جس کا عام رواج ہے۔ کثیر ازدواجی اور کثرت طلاق کی روشنی میں بعض مشہور مصنفوں اور سیاحوں نے بیان کیا ہے کہ جو برتاؤ عام طور پر اور واقعی عورتوں کے ساتھ اسلام میں کیا جا رہا ہے وہ ذلیل ہے یہ ایک اُمید فزا علامت ہے کہ اس عام حالت کے برعکس میں

کہیں ایسے شریف اور الوالعزم لوگ بھی اسلام میں موجود ہیں جو بڑے صبر کے ساتھ عورتوں کی حالت سدھارنے کی کوشش میں لگے ہیں کہ جن کی اصلاح عرصہ سے رکی تھی۔

لیکن کیا یہ سچ نہیں کہ عورتوں کے درجہ کا وہ معیار جو قرآن کی تعلیم (سورۃ النور ۲۲ - ۳۲ آیات وسورۃ النساء ۲۹ - ۳۰ وسورۃ البقر ۱۸۲ آیت) اور احادیث سے ماخوذ ہے۔ عملاً عورتوں کی حالت کو ہمیشہ کے لئے ناخوشگوار بنائے رکھنا سکھاتا ہے۔

تعلیم

یہ مشہور بات ہے کہ راسخ الاعتقاد علمائے اسلام عام طور پر آزاد تعلیم کے مخالف ہیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ اسلامی تواریخ میں ایسے مشہور زمانے بھی گزر چکے ہیں کہ جب خلفاء اور مغل شہنشاہوں نے اور با اثر ذی اقتدار اسلامی علماء نے علم کی ترقی میں مدد دی ہے۔ آج کل کے بہت سے مسلمان بھی اعلیٰ تعلیم کے سرگرم محرک ہیں لیکن عام طور پر اسلام کا اثر اس کے برعکس رہا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تواریخ اس میرے بیان کی مثال ہے۔ ممکن ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم کی کمی کی خاص اور وجوہات بھی ہوں۔ ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں کا تعلیمی اعتبار سے پیچھے رہنا بالکل ظاہر ہے اور یہ باوجود اس کے کہ دونوں قومیں صدیوں سے پاس پاس رہتی چلی آئی ہیں۔ اس کی خاص وجہ اگرچہ اسے صریح سبب نہ بھی مانیں اسلام کی وہ تعلیم ہے جو عام طور پر مانی جاتی اور جس کی پیروی کی جاتی ہے اور جو معلوم پڑتا ہے کہ آزاد خیال اور ترقی پذیر تعلیم کی حوصلہ افزائی نہیں کرتی گویا کہ ان کے علما کہتے ہیں کہ کیا اللہ نے ساری حکمت اور

سارا علم قرآن کے ذریعہ لوگوں پر ظاہر نہیں کیا ۔ اور جو کچھ علم کی باتیں قرآن میں موجود نہیں ہیں یا تو وہ غیر ضروری ہیں یا وہ اللہ کی مرضی کے خلاف ہیں اور اس لئے اُن کا مطالعہ نہ کرنا جائز ہے اور نہ کرنا چاہیئے ۔
اس نقطہ نگاہ کے خلاف آج کل نئی نسل کی مخالفت نہایت ہی اُمید افزا علامت ہے ۔

روحانی طاقت کی عدم موجودگی

اسلام کی سب سے بڑی کمی ایک ایسے راہ کی غیر موجودگی ہے کہ جس کے ذریعہ روحانی طاقت اُن لوگوں تک پہنچ سکے جو گناہ میں پڑے ہیں اور پھر اس سے بڑھ کر اس طاقت کی ضرورت کے احساس کا عام طور پر نہ ہونا ہے ۔ جس معنی میں ہم مسیحی "روحانی مذہب" کا مطلب سمجھتے ہیں اس معنی میں اسلام صفائی کے ساتھ روحانی مذہب ہونے کا دعوٰے نہیں کرتا یعنی ایسا مذہب جو کھوئے ہوئے انسان کو خدا کی طرف واپس لاتا ہے اور گرے ہوئے انسان کو خدا کی طرف اوپر کو اُٹھا لے جاتا ہے ۔ اسلام نے اس قدر زور خدا پر دیا ہے کہ انسان کے ساتھ بے انصافی ہوگئی ہے اور اس نے کوئی ایسا طریقہ مہیا نہیں کیا ہے کہ جس کے ذریعہ انسان سے گناہ کی خواہش دُور کی جا سکے اور نہ یہ انسانی افعال کی بنیاد تک پہنچ کر اُن کو صاف کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔
اسلام میں نہ اس قسم کا احساس پایا جاتا ہے کہ خدا کے دل میں نجات بخشنے کا پُر جلال مقصد موجود ہے ۔ نہ ایسے خدا کا تصور پایا جاتا ہے کہ جو انسان کو گناہ کی زبردست طاقت سے بچانے کا آرزو مند ہے ۔ نہ خدا کے مقصد کا یہ تصور پایا جاتا ہے کہ وہ اپنے روح القدس کی طاقت سے انسان کو ایک نئی مخلوق بناتا

چاہتا ہے۔

اس بیان کی تائید عجیب طور سے ایک ایسے جریدہ کے مدیر کے بیان سے بھی ہوتی ہے جو آج کل کے جدید اور ترقی کرنے والے فرقہ کا رسالہ ہے۔ اس مدیر نے صفائی کے ساتھ تحریر کیا ہے کہ ایسی بات جسے نجات کہتے ہیں اسلام میں نہیں ہے۔ یہ ایک غلط خیال ہے اور وہ لکھتا ہے کہ یہ خیال عیسائیوں سے لیا گیا ہے بلکہ نجات ایک بخشش ہے جو پیدائش کے وقت انسان کو ملتی ہے (لائٹ ۸ مارچ ۱۹۳۱ء)، بیان مذکور الصدر کی تائید اس خط سے بھی ہوتی ہے۔ جو اسی رسالہ میں شائع ہوا تھا جس کا اقتباس ابھی ہم پیش کر چکے ہیں کسی نے مدیر کے پاس ذیل کی باتیں اپنے متعلق لکھی تھیں۔

"میں بیس برس کی لڑکی ہوں اور بارہ برس کی عمر سے اُن سارے گناہوں کی مرتکب ہو چکی ہوں جو آپ کے خیال میں آسکتے ہیں۔ درحقیقت زندگی کے درخت کے ہر پتے کا ذائقہ میں چکھ چکی ہوں۔ افسوس مرنے کے بعد میرے لئے سوائے جہنم کے اور کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ میں سچے دل سے دریافت کرتی ہوں کہ نجات پانے کے لئے مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ میں یہ سوال ایک رومن کیتھولک پادری سے کر چکی ہوں۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ مجھے توبہ کرنا چاہیئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں توبہ نہیں کر سکتی کیونکہ جو کچھ میں نے کیا اگرچہ وہ گناہ تھے تاہم میں اُن سے لطف اندوز ہو چکی ہوں اب آپ مجھے صلاح دیں کہ جہنم سے بچنے کے لئے مجھے کیا کرنا چاہیئے۔"

اس بے کس رُوح کو مدیر نے جواب دیا۔ "ایک نیا صفحہ اُلٹو اور اب سے نیک زندگی بسر کرو۔ صرف اسی سے گزرے گناہ دھل سکتے ہیں۔ یہی صرف حقیقی کفارہ ہے۔ قرآن یقین دلاتا ہے کہ صرف نیک اعمال سے گناہ دُور

ہو جاتے ہیں (سورہ ہود ۱۱۶ آیت) لائٹ اگست ۱۹۲۷ء
یہ روٹی کے عوض پتھر کا معاملہ ہے یعنی اسلام کا اقرار کہ روحانی طاقت
کی اس میں عدم موجودگی ہے۔

چوتھی فصل

اسلامی تعصب کی روشنی میں مسیحی تعلیمات

مسیحی پیغام مسلمانوں تک جو پہنچانا چاہتے ہیں اُن کو اکثر اعتراضات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور جلد اُن کو پتہ لگ جاتا ہے کہ اُن کے دلوں میں مسیحیت کے متعلق چند پُر تعصب خیالات گہرے طور پر جگہ پکڑے ہوئے ہیں کہ جن کا اظہار کرنے کو وہ ہمیشہ مستعد رہتے ہیں۔ صحیح طور پر اس کی وجہ دریافت کرنے کے لئے سب سے پہلے ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام کا مسیحیت سے تعلق کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ کسی اور عالمگیر مذاہب کا نہیں ہے کیونکہ یہ مذہب مسیحیت کے بعد کا ہے اور اس کی موجودگی میں اس کی نشر و اشاعت ہوئی اور ایک معنی میں مسیحیت کے خلاف یہ مذہب پھیلایا گیا۔

ہم یہ پہلے دیکھ چکے ہیں کہ محمد صاحب کو نہ صرف اپنے وقت کے یہودیوں پر ہی اعتراض تھا بلکہ مسیحیوں پر بھی اور مسیحیوں کے ساتھ اس کے بحث کی کچھ تفصیل قرآن میں پائی جاتی ہے اور قدیم اسلامی تصنیفات کے کچھ حصوں

میں یہ موجود ہے اور اُن کا اثر اپنے خاص رنگ میں اب تک پایا جاتا ہے اور اس لئے جب کبھی ان دونوں مذاہب کے لوگوں کا قریبی اتصال ہُوا ہے تو پھر اس بحث کے چھڑ جانے کا بھی احتمال رہا ہے۔ تواریخ اس امر کی مُوّید ہے۔

بہر حال ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی یہ خصوصیت اور ان کا دیرینہ تعصب مسیحی پیغام کے خلاف اتنا نہیں ہے جتنا کہ نمایاں طور پر چند مسیحی تعلیمات کے خلاف ہے جب صورت حال یہ ہے تو ہم پر دوچند فرض یہ عائد ہوتا ہے کہ ہم کو چاہئے کہ اُن کے تعصب کے سبب کی تہ تک پہنچیں اور ہم کو چاہئے کہ اپنے مسیحی اعتقادات پر اس طرح دوبارہ غور کریں کہ اگر ضرورت ہو تو اُن کو پھر ایسے الفاظ میں ادا کریں کہ مسلمانوں کے دماغ سے غلط فہمی اور ٹھوکر کی ہر ممکن علت دُور کی جا سکے۔

پس اسلامی تعصب کے اسباب کے لئے ہمیں محمد صاحب کے زمانہ کا اور قرآن کا مطالعہ کرنا ہے۔

بائبل کی صحت

قبل اس کے کہ ہم ان تعلیمات پر بحث کریں جن پر مسلمان معترض ہیں تو اس امر متنازع فیہ کی اصل کیفیت ہمیں مجبور کرتی ہے کہ مسلمانوں کے اس نمایاں تعصب پر جو بائبل کی کتابوں کے خلاف ہے غور کریں۔

مسلمانوں کو بڑی شدومد سے یہ سکھایا جاتا ہے اور ایک بڑی حد تک وہ مانتے بھی ہیں کہ جو بائبل اب مروّج ہے وہ لائق اعتبار نہیں کیونکہ اس میں تحریف کی گئی ہے۔

یہ صاف ظاہر ہے کہ اُن کا یہ اعتراض جو عموماً کیا جاتا ہے بائبل کے نسخوں

کی تنقید کے نتائج سے کوئی تعلق نہیں رکھنا بلکہ قدیم روایتی ذہنیت کا یہ اظہار ہے۔ بہتیرے مسلمان اس اعتراض کو کرتے وقت محض سنی ہوئی باتوں کو دُہراتے ہیں اور کوئی ثبوت پیش نہیں کرتے لیکن بعض قرآن میں اس کی دلیل ڈھونڈتے ہیں لیکن ان میں بہتیرے یہی کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ ہماری کتاب میں لکھا ہے اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ قرآن اس معاملہ میں کہتا کیا ہے۔

اس صورتِ حال کی موجودگی میں قرآن کا جابجا بائبل کی کتابوں کا ذکر نہایت ہی اعلیٰ الفاظ میں کرنا تعجب خیز ہے۔ مثلاً قرآن بتاتا ہے کہ یہ کتابیں خدا کی دی ہوئی ہیں۔ یعنی توریت موسیٰ کو (سورۃ السجدہ آیت ۲۳) زبور داؤد کو (سورۃ بنی اسرائیل آیت ۵۷) انجیل یسوع کو (سورۃ المائدہ آیت ۵۰) (۲) ان کتابوں کو اعلیٰ خطاب سے پکارتا ہے۔ مثلاً کتاب اللہ۔ سورۃ المائدہ ۴۴۔ کلام اللہ سورۃ البقر آیت ۷۰۔ الناس کے لئے نور اور ہدایت سورۃ الانعام ۹۱ آیت۔ ہدایت اور رحمت سورۃ انعام ۱۵۵ آیت۔ (۳) ان کو مستحکم کرنے اور ان کی حفاظت کے لئے ہے سورۃ المائدہ آیت ۵۰۔ سورۃ البقر آیت ۸۳ و ۹۱۔ سورۃ المائدہ آیت ۵۲)

ان مقامات کو ذہن نشین کرنے کے بعد ہم اُن آیتوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ مسلمان جن کی بنا پر بائبل کا محرف ہونا بتاتے ہیں اُن کے عربی ترجموں سے ذیل کی باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔

(۱) سورہ اعراف آیت ۱۶۲ میں ذکر ہے کہ ناخدا ترسوں نے جو لفظ نازل ہوا تھا اُسے دوسرے لفظ سے بدل لیا معلوم ہوتا ہے کہ یہ موسیٰ کی اُمت کے لوگوں کے لئے کہا گیا ہے کہ جنہوں نے جان بوجھ کر لفظ کے تلفظ کو بگاڑ دیا اس کا مقابلہ اسی سورہ کے ۱۶۱ آیت سے کرو جہاں مفسرین کے بیان کے مطابق لفظ حطہ یعنی مغفرت نازل شدہ لفظ تھا لیکن یہودیوں نے "لفظ" "حبت" "گیہوں" سے بدل دیا۔

(۲) سورہ آل عمران ۳: ۷۸ آیت اور ان ہی اہل کتاب میں ایک فرقہ ہے جو کتاب (یعنی توریت) پڑھتے وقت اپنی زبان کو مروڑتے تروڑتے اور کچھ کا کچھ پڑھ لیتے ہیں، تاکہ تم سمجھو کہ جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں وہ کتاب الہٰی کا جزو ہے حالانکہ وہ کتاب الہٰی کا جزو نہیں۔

(۳) سورۃ البقرہ آیت ۷۹۔ پس افسوس ہے ان لوگوں پر جو اپنے ہاتھ سے تو کتاب لکھیں پھر لوگوں سے کہیں کہ خدا کے ہاں سے اُتری ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے تھوڑے سے دام (یعنی دنیاوی فائدہ حاصل کریں۔)

(۴) سورۃ آلِ عمران ۳: ۷۱۔ آیت اے اہلِ کتاب کیوں حق و باطل کو گڈ مڈ کرتے اور حق کو چھپاتے ہو حالانکہ تم حقیقت حال سے واقف ہو۔

درحقیقت قرآن کے ان الزامات سے محمد صاحب کے زمانہ میں بائبل کی صحت ثابت ہوتی ہے کیونکہ تحریف کر کے نقل کرنا ایسی حالت میں ممکن نہیں ہے کہ صحیح نسخہ سامنے موجود نہ ہو اور نہ سچی بات چھپائی جا سکتی ہے جب تک کہ سچی بات نہ ہو۔ غرض کہ ان غلط استعمال سے اصل متن پر کوئی اثر نہیں پڑتا اس لئے کتاب میں درحقیقت تحریف نہیں ہوتی۔

علیگڈھ کی مشہور ہستی سر سید احمد خاں نے اپنے زمانہ میں ایک کتاب لکھی جس میں مسلمانوں کو یہ دکھایا ہے کہ قرآن کہیں بھی یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ یہودیوں یا مسیحیوں نے بائبل کے متن میں تحریف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ قدیم اسلامی علماء دو قسم کی تحریف مانتے تھے۔ تحریف لفظی یعنی نسخوں ہی کے لفظوں کا بگاڑنا اور تحریف معنوی یعنی معنی یا تفسیر بگاڑ کر کرنا اور وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ قرآن میں اس دوسری قسم کے تحریف کا الزام ہے اور جس کی مندرجہ ذیل مثالیں وہ پیش کرتے ہیں۔ پڑھتے وقت لفظ کو ایسا بدل دینا کہ سننے والے کو تھے

ہُوئے لفظ کے بجائے او، کوئی لفظ سنائی دے ۔ صرف بعض مقامات کو پڑھنا اور بعض کو چھوڑ دینا ۔ لوگوں کو خدا کی اُس تعلیم کے برعکس جو پاک کتاب میں درج ہے ہدایت کرنا مگر لوگوں سے یہ منوانا کہ خدا کا یہی سچا کلام ہے ۔ مبہم یا دو معنی الفاظ کے بے جا معنی کرنا جو وہاں کے مفہوم کے مطابق نہ ہو ۔ جن مقامات کے معنی مخفی ہیں اور جو تشبیہ سے بھرے ہیں اُن کا غلط مطلب نکالنا ۔ دیکھو تفسیر بائبل خطبات احمدیہ ۔

یہ الزامات جو نسخوں کے الفاظ کی تحریف الزام سے کم ہے کن حالات کے تحت اہل کتاب پر عاید کئے گئے ہیں ۔ ہمیں اس نتیجہ کے ماننے بغیر اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ یہ پہلے محمد صاحب نے ہی نکالے ہیں اور ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ محمد صاحب کو ان لوگوں پر اعتراض تھا اور اعتراض کا ایک پہلو قرآن کے ان مقامات میں ہم پاتے ہیں ۔

محمد صاحب کو جس صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا اُس کے بیان کو از سر نو ترتیب دینے کی کوششوں میں مندرجہ ذیل بیان قریب القیاس معلوم پڑتا ہے ۔ محمد صاحب جب مکہ میں تھے تو ان کے دل میں یہودیوں اور ان کی کتاب کے لئے سچی عزت پیدا ہوئی ۔ اُن کے اپنے لوگوں کے پاس کوئی کتاب نہ تھی یہودیوں سے مل جل کر کچھ باتیں اُن کی کتاب کی اُس نے معلوم کیں بعد ازاں مدینہ میں، وہ اُن کے ساتھ اس اُمید پر ملتا رہا کہ اپنی تائید میں اُن کو اپنی طرف کھینچ لے گا ۔ اُن سے مسیح کی بابت پُرانے عہد نامہ کی پیشین گوئیوں کو سُنا اور دلچسپی لی کہ جسے یہودی بتاتے تھے کہ آنے والا ہے ۔ محمد صاحب نے شروع ہی سے اپنی رسالت کا خدا کی طرف سے ہونے کا دعویٰ کیا تھا اب یہ بھی دعویٰ کیا کہ کتاب مقدس کے صحیفوں میں اُس کے آنے کی پیش خبری درج ہے ۔ (سورۃ الاعراف آیت ۱۵۶

مقابلہ کرو۔ سورۃ الصف آیت ۶)

یہودیوں نے بڑے زور سے اس کا انکار کیا (سورۃ البقر آیت ۹۵) اُن کو اپنی کتاب سے معلوم تھا کہ مسیح داؤد کی نسل سے ہوگا۔ اس روشنی میں قرآن کے دعاوی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ محمد صاحب نے درحقیقت یہودیوں پر یہ الزام لگایا کہ جب کبھی اُن کو ایسی عبارتوں کے پڑھنے کے لئے کہا جاتا ہے کہ جن میں انہوں نے دعویٰ کیا کہ اُن کا اپنا ذکر ہے تو انہیں وہ بدلتے ہیں، چھپاتے ہیں "دوسرے الفاظ سے بدل ڈالتے ہیں۔" "زبان مروڑ کر پڑھتے ہیں" لیکن صریح حقیقت اس معاملہ میں اور اسی طرح دیگر معاملات میں یہ ہے کہ یہودیوں نے اُن کا مقابلہ کیا یہاں تک کہ تنگ آکر محمد صاحب نے اُن کو اپنے راستہ سے ہٹا دیا۔ حقیقی معنی میں ان دنوں کے بہتیرے یہودیوں نے اپنی کتاب کی خاطر اپنی جان دے دی۔

دوسرے الفاظ میں یہ ابتدائی بحث بڑی حد تک شخصی تھی جس میں محمد صاحب کے دعاوی شامل تھے اور آج تک بحث کا یہ پہلو بہتیرے مسلمانوں کے ذہن میں موجود ہے۔ قرآن کے الزامات کے صحیح مطلب کو نظر انداز کر کے یا اُن سے ناواقفیت کے سبب مسلمان یہ مان لیتے ہیں کہ بائبل میں کسی وقت محمد صاحب کی بابت پیشینگوئیاں پائی جاتی ہیں کہ جن کو یہودیوں اور عیسائیوں نے کسی نہ کسی وقت نکال ڈالا۔

بے شک یہ سارا خیال غلط ہے۔ اس قدر دریافت کرنا کافی ہے کہ ایسے کام کے کرنے سے یہودیوں کو کون سے نفع کا امکان تھا بلکہ اگر اُن کے صحیفوں میں محمد صاحب کی بابت ایسی پیشین گوئی ہوتی تو وہ اس کو قبول کر لیتے اور ایذا رسانی سے بچ جاتے۔ علاوہ اس کے یہ حقیقت ہے کہ محمد صاحب

کے زمانہ سے بہت پیشتر یہودی مسیحیوں کے دعاوی سے واقف تھے جو یہ تھے کہ عہدِ قدیم کی بہت سی پیشین گوئیاں جن کا تعلق مسیح کی آمد سے تھا۔ یسوع ناصری میں پوری ہو چکی ہیں۔ تاہم اگرچہ انہوں نے مسیحیوں کی تفسیر کا انکار کیا لیکن ان عبارتوں کو مٹا نہیں ڈالا۔

ان باتوں کے باوجود اور اُن کے اس دعوے کا خیال کرتے ہُوئے کہ بائبل محرّف ہے پھر بھی اُن کا یہ دعویٰ کرنا کہ بائبل میں جیسی کچھ کہ اب موجود ہے محمد صاحب کی بابت بہتیری پیشین گوئیاں پائی جاتی ہیں۔ انوکھا ہے یہ دونوں دعوے ایک ساتھ کون کر سکتا ہے۔

ان سب سے اُوپر سیدھی سادی حقیقت یہ ہے کہ قرآن اور بائبل کے درمیان بہتیری باتوں میں بڑا اختلاف ہے اور سب سے بڑھ کر ان دونوں کا کبھی تطابق نہیں ہُوا کیونکہ شروع سے قرآن بائبل سے مختلف ہے۔ قرآن اور بائبل کی یہ نامطابقت پُر فخر اور سریع الحس مسلمانوں کے لئے پریشانی کا باعث ہے جو یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ان میں سے ایک محرّف اور لہٰذا ناقابل اعتبار ہے۔ قرآن کے لئے ایسا ہونا وہ نہیں مانتے کیونکہ ان کے خیال میں یہ افضل درجہ کی کتاب ہے۔ اس لئے بائبل ہی غلطی پر ہے یقیناً یہ طرزِ استدلال صحیح نہیں ہے۔

ذاتِ مسیح

ہرچند کہ مسلمانوں کا علی الاتصال یہ دعویٰ رہا ہے کہ وہ یسوع کے نام کا لحاظ بلکہ احترام کرتے ہیں تاہم آپ کی بابت مسیحیوں کے اعلیٰ اور لاثانی دعاوی کے انکار کرنے کے وہ عادی ہیں۔ عیسیٰ ابنِ مریم اُن کے لئے

یسُوع کا قرآن میں یہ مستقل خطاب ہے ، صرف نبیوں میں ایک نبی ہیں جو نہ سب سے آخری اور نہ سب سے افضل ہیں۔

یہ لازمی امر ہے کہ مسلمانوں سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ یسُوع کو محمد سے افضل درجہ دیں اور عملاً جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ....وہ آپ کو محمد کے برابر بھی مرتبہ نہیں دیتے لیکن مسلمانوں کا مسیح کو وہ نام دینے سے انکار کرنا جو سب ناموں سے اعلیٰ ہے اس کی تنہا یا خاص وجہ یہی نہیں ہے کہ اُن کے لئے اپنے نبی کو ترجیح دینا لازمی اَمر ہے بلکہ یہ اُن کی خدا کے لئے غیرت ہے جو اُن کو ابھارتی ہے کہ مسیح کی ہر ایسی عزت کو کہ جس کے باعث وہ پیغمبر کے مرتبہ سے بڑھ جائیں کفر سمجھ کر اُس کی ملامت کریں۔ یہ غیرت اسلام کی اصولی تعلیم یعنی توحید کی تہ میں ہے۔ لہٰذا اس تعصب کا بھی شروع اسلام کی ابتدا سے ہے جیسے مولانا محمد علی لکھتے ہیں توحید الٰہی قرآن کا بڑا مضمون ہے .... الٰہی ذات میں کامل وحدانیت پائی جاتی ہے .... وہاں شرکت یا کثرت کی گنجائش نہیں ہے .... الوہیت میں اقانیم کی کثرت کا یہ انکار کرتا ہے .... ذات الٰہی کے تجسم کو ماننے سے اسلام انکار کرتا ہے۔" مولانا محمد علی۔ دیباچہ قرآن۔

اور گویا کہ قرآن کا تعلیم توحید پر اس قدر زور دینا لوگوں کے ذہن نشین کرانے کو کافی نہ تھا کہ شرک یعنی خدا کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانے کے جرم کو اور بھی بڑھا کو قرآن نے ناقابلِ معافی گناہ قرار دیا ہے۔ "تحقیق اللہ نہیں بخشتا ہے یہ کہ اس کا شریک پکڑے اور بخشتا ہے اس سے نیچے جس کو چاہے اور جس نے شریک ٹھہرایا اللہ کا اُس نے بڑا طوفان باندھا۔ سورۃ النساء رکوع ۷ و رکوع ۱۸۔

اِس قسم کے ناموزوں سخن کا مسیح کی ذات کے لئے بالکل نامناسب ہونے پر ہمارا اصرار کرنا کوئی فائدہ نہیں دیتا کیونکہ یہ حقیقت قائم رہتی ہے۔ کہ

مسلمانوں کے خیال میں ہمارا شمار اسی مذکورہ بالا درجہ کے لوگوں میں ہے جن کی ملامت کی گئی ہے۔

یہ امر یقینی معلوم پڑتا ہے کہ بار بار توحید الہٰی کی تعلیم کی تکرار اور شرک کے خوف ناک گناہ میں ایسی خاص دو باتیں یہاں ملتی ہیں کہ جن سے مسلمانوں میں اس قدر تعصب پیدا ہو گیا ہے کہ الوہیت مسیح کے کسی تصور یا تجسم کی کسی تشریح کو دل میں جگہ دینے کے لئے وہ تیار نہیں ہیں۔ اسی سبب سے مسلمان مسیح کی ابنیت کی تعلیم سے متنفر ہیں۔ حال ہی میں جنوبی ہندوستان کے ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے ایک مسیحی مناد سے کہا کہ "جب کبھی تم عیسائی یسوع کو خدا کا بیٹا کہتے ہو ہمارا خون اُبلنے لگتا ہے۔"

مسلمانوں کی اس برانگیختگی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ جب یسوع مسیح کو ہم اس قسم کے خطابات سے پکارتے ہیں تو اُن کو یہ معلوم پڑتا ہے کہ خدا کی اصل وحدانیت کی اعلیٰ تعلیم کی خفت کرتے اور انھیں نظر انداز کرتے بلکہ اس کا انکار کرتے ہیں لیکن مسلمانوں کے اس عالمگیر احساس کے پرے کچھ اور بھی ہے یعنی قرآن کی ملامت۔ خدا کی توحید کے اظہار کے ساتھ ساتھ قرآن بڑی شدت سے اس خیال کی بھی تردید کرتا ہے کہ خدا کا کوئی بیٹا ہے۔

اس کے متعلق قرآن کے مقامات دو حصوں میں منقسم کئے جا سکتے ہیں۔
(۱) وہ جو عرب کے بُت پرستوں کے متعلق ہیں اور (۲) وہ جو مسیحیوں کی بابت ہیں۔ ان ہر دو اقسام سے ایک ایک مثال یہ دکھانے کو کہ غیر صاحب کے خیال میں کس قسم کی "ابنیت" بھی کافی ہے۔

(۱) سورۃ الانعام رکوع ۱۲ آیت ۱۰۰۔ اس کے اولاد کیوں ہونے لگی جب کہ کبھی اُس کی کوئی جورو ہی نہیں۔ مقابلہ کرو۔ یونس رکوع ۷، الزمر رکوع ۱،

زخرف رکوع ۷، جن رکوع ۲۔ سورہ اخلاص ۔

(۲) سورہ مریم ۔ (رکوع ۶) آیت ۸۸ ۔ ۹۲ ۔ بعض لوگ قائل ہیں کہ خدائے رحمٰن بیٹا رکھتا ہے ۔ اے پیغمبر اُن سے کہو کہ یہ تم ایسی سخت بات اپنی طرف سے گھڑ کر لائے جس کی وجہ سے تعجب نہیں آسمان پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزے ریزے ہو کر گر پڑیں کہ لوگوں نے خدائے رحمٰن کے لئے بیٹا قرار دیا حالانکہ خدائے رحمٰن نہیں کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے ۔" (اور دیکھو سورۃ البقر آیت ۱۱۶ سورہ المائدہ آیت ۱۹ و ۷۵ سورۃ التوبہ آیات ۳۱۔۳۲۔ سورۃ مریم آیت ۳۶)

ان سارے مقامات سے دو باتیں ظاہر ہیں کہ (۱) قرآن جس کی تردید کرتا ہے وہ ابنیت کا جسمانی تصور ہے اور (۲) کہ اس زمانہ کے بُت پرست عرب اور مسیحیوں پر بھی یہ الزام لگاتا ہے کہ وہ اسی قسم کا خیال رکھنے کے تقصیر وار تھے ۔ عرب اس ملامت کے پورے سزاوار تھے ۔ اب رہا مسیحیوں کی بابت تو اُن پر اس الزام کے لگانے کی وجہ ابی سینا کے مسیحیوں کا کنواری مریم کو ایسا اعلیٰ مرتبہ دینا تھا جو الوہیت کے قریب قریب ہے اور ہم کو معلوم ہے کہ ابی سینا کے مسیحیوں سے محمد صاحب کا بہت کچھ میل جول تھا ۔ علاوہ اس کے ملک شام میں مسیحیوں کا ایک فرقہ زمانۂ قدیم میں پایا جاتا تھا جو مانتے تھے کہ تثلیث خدا، مریم اور یسوع سے بنتی ہے ۔ ممکن ہے کہ محمد صاحب کے زمانہ میں کسی گمنام فرقہ کا بھی یہی عقیدہ ہو ۔

اب اس بات کے ثابت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ نئے عہد نامہ میں کہیں بھی یہ فقرہ جسمانی معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے اور نہ یہ فقرہ اس طرح استعمال ہوا ہے کہ جس سے یہ ظاہر ہو کہ انجیل نویسوں کے ذہن میں یہ خیال تھا کہ یسوع کی پیدائش کسی خاص یا مافوق الفطرت طریقہ سے ہوئی ہے ۔ صاف اور

صریح حقیقت یہ ہے کہ یہ فقرہ بطور لقب کے یعنی مسیح کے لقب کے واسطے استعمال ہوا ہے۔ صرف لوقا کے پہلے باب کی ۳۵ آیت میں یہ لقب یسوع کی پیدائش کے متعلق استعمال ہوا ہے اور وہاں بھی اس سے صرف ایک نام ظاہر ہوتا ہے جو آپ کو دیا جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک استعارہ ہے اور اس کے لفظی معنے نہیں لینا چاہیئے۔ بہر حال نئے عہد نامہ میں اس لفظ کے استعمال سے اس سے کہیں زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس فقرہ سے یہ پایا جاتا ہے اور اس سے مراد بھی اس حقیقت کا معلوم کر لینا ہے کہ یسوع کا شعور و وقوف خدا اپنے بیٹے ہونے کا شعور و وقوف تھا۔ الٰہی باپ کے بیٹے ہونے کا احساس یسوع میں اس سے کہیں زیادہ گہرا۔ صاف۔ قریبی۔ شامل الکل اور مستغرق تھا جو کسی انسان کو کبھی ملا ہو۔

یہ ایک حقیقت ہے جو انجیل سے کسی طریقے سے بھی مٹائی نہیں جا سکتی۔ لیکن یہ کہنا باقی ہے کہ مسلمانوں کا یہ اعتراض اپنی اصلیت میں زمانہ مسیح کے یہودیوں کے اعتراض کی مانند تعلیم ابنیت کے اس قدر خلاف نہیں جس قدر کہ ابنیت کے اس گہرے معنی کے یعنی اس کے کہ باپ اور بیٹے کی ماہیت ایک ہی ہے (مقابلہ کرو۔ یوحنا ۵: ۱۸ اور ۱۰: ۳۳) اور اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نئے عہد نامہ میں اس فقرہ کے استعمال سے یہی معنی نکلتے ہیں۔

اب دوسری طرف اللہ لاشریک ہے۔ پس اگر مسیح کی بابت مسیحیوں کا خیال مان لیا جائے تو اللہ اپنے جلال میں دوسرے کو شریک کرتا ہے اور اس کا کوئی شریک ٹھہرتا ہے جو مسلمانوں کے لئے ایک ناممکن مسئلہ اور کفر ہے جس "ذات الٰہی کے تجسم کو ماننے سے اسلام انکار کرتا ہے" ہم پھر یہاں صفائی سے دیکھتے ہیں کہ خدا کا تصور جیسا کچھ مسلمانوں کے خیال میں ہے اس کی غیرت

کے سبب بڑی شدّت سے تجسّم کے ہر خیال کا مسلمان انکار کرتا ہے بعینہٖ جس
طرح وہ یہ کہتا ہے کہ "نہیں لائق ہے رحمٰن کو کہ رکھے اولاد" اسی طرح وہ یہ
بھی کہتا ہے کہ کبھی ایسا نہ ہو رحمٰن کے لئے کہ "وہ انسانی شکل میں ظاہر ہو"
جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان خدا کے تجسّم کو اُس کے جلال کے لئے باعث
ذلّت سمجھتا ہے اگرچہ یہ تجسّم انسان کی نجات ہی کے لئے کیوں نہ ہو۔
لیکن خدا کے لئے اُس کی یہ غیرت الوہیّت کے ناقص تصوّر پر مبنی ہے
وہ سمجھتا ہے کہ رب العالمین کی عظمت کی حمایت جس طرح بن پڑے کرنی
چاہئے برعکس اس کے ہم کہتے ہیں کہ خدا کا اپنے آپ کو ایسے نجات بخش طریقہ
سے لوگوں پر ظاہر کرنے کی کوشش کرنا اُس کی عظمت و جلال کے باعث
ذلّت ہونے سے کہیں بعید ہے بلکہ یہ محبّت کا خاص حق ہے کیونکہ خدا اپنی ذات
میں محبت ہے یہ ہو سکتا ہے کہ قدرت کے جلال کو حلیمی سے دھبہ لگے۔ ممکن
ہے کہ اعلیٰ دانائی ادنیٰ شکل میں ظاہر ہونے سے جھجکے اور شاید خالص انصاف
کسی اور طریقہ کی متقاضی ہو لیکن محبت ہاں حقیقی محبّت بچانے کی خاطر اپنے آپ کو
پست کرتی ہے اور پست کرنا ذلّت نہیں۔
مسیح کے متعلق مسیحی ایمان کی یہی اصلیت ہے۔ ہم ایمان رکھتے ہیں
کہ خدا اپنے آپ کو اپنے اخلاقی خصائل کو اپنے بیٹے میں ظاہر کرتا ہے۔ یعنی
یہ کہ مسیح میں اور صرف مسیح کے وسیلہ جیسا کہ خدا حقیقتاً ہے ہم اُسے پہچانتے
ہیں اور چونکہ لوگ مسیح کی رُوح میں محبّت کی معموری پاتے ہیں اس لئے وہ
اُس میں خدا کی معموری دیکھتے ہیں۔

تثلیث

غالباً مسلمانوں کا سب سے عام اعتراض تثلیث کی تعلیم پر ہے
ایک اسلامی اخبار میں ریاضی کے مسئلہ کی صورت میں یوں اُسے بیان
کیا گیا ہے۔ ۱ + ۱ + ۱ = ۱ اور تب اس کا مذاق یہ کہہ کر اُڑایا گیا
ہے کہ طفلِ مکتب بھی اپنے حساب میں ایسی بھاری غلطی نہ کرے گا اور اگر
کرے تو مار کھائے گا۔

اور ہم پھر یہاں اسلامی تعلیم توحید کا اثر دیکھتے ہیں۔ ابتداء ہی سے
اسلامی ذہنیت کی ساخت میں یہ تعلیم داخل ہونا شروع ہوتی ہے اِس لئے
کہ چھوٹے بچوں کو جو باتیں سکھائی جاتی ہیں ان میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے علاوہ
اس کے قرآن میں چند ایسے مقامات ہیں جن سے تقریباً ہر مسلمان واقف
ہے اور اپنے اعتراض کے ثبوت میں جنہیں وہ پیش کرتا ہے۔

"اور تین خدا نہ کہو اس سے باز آؤ کہ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔
بس اللہ ہی اکیلا معبود ہے۔ سورۃ النساء (رکوع ۲۳) آیت ۱۶۹۔ اور
جو لوگ کہتے ہیں کہ خدا تو یہی مریم کے بیٹے مسیح ہیں یہ لوگ اس کہنے سے
بے شک کافر ہو گئے اور مسیح تو یوں سمجھایا کرتے تھے کہ اے بنی اسرائیل
اللہ ہی کی عبادت کرو کہ وہ میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار
ہے اور اس میں شک نہیں کہ جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک گردانے تو
اللہ کی طرف سے بہشت اُس پہ حرام ہو چکی اور اُس کا ٹھکانا دوزخ ہے
سورۃ المائدہ (رکوع ۱۰) آیت ۷۷۔ اور قیامت کے دن یہ معاملہ بھی پیش
آئیگا کہ اُس دن اللہ عیسیٰ سے پوچھے گا کہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ کیا

تُم نے لوگوں سے یہ بات کہی تھی کہ خدا کے علاوہ مجھ کو اور میری والدہ کو بھی دو خدا مانو۔ عیسیٰ عرض کریں گے کہ اَے پروردگار تیری ذات پاک ہے مجھ سے یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ مَیں تیری شان میں ایسی بات کہوں کہ جس کے کہنے کا مجھ کو کوئی حق نہیں۔ سورۃ المائدہ (رکوع ۱۶، آیت ۱۱۶)

ان بیانات سے جس تصوّر کا اظہار ہوتا ہے ہم مسیحی خود مسلمانوں کی طرح اس کی پُرزور تردید کرتے ہیں۔ قرآن کے الفاظ میں تثلیث کا نہیں بلکہ ثلاثہ یا تین خدا کا انکار پایا جاتا ہے جیساکہ ہندوؤں کے برہمہ وشنو اور شیو اور مصریوں کے آئی سِیس، سائرس اور ہورس کے عقیدہ میں ہے۔ اگر محمد صاحب نے یہ خیال مسیحیوں سے لیا ہے تو جیسا ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ ایسی تعلیم کسی گمنام فرقہ سے لی ہو گی کہ جس کا صحیح الاعتقاد مسیحی ضرور انکار کرتے ہیں۔

ہم بھی مانتے ہیں کہ خدا واحد خدا ہے اور ہمارے اس ایمان کے لئے خود مسیح کا نمونہ اور اس کی پسندیدگی ہمارے پاس ہے۔ جب آپ سے دریافت کیا گیا کہ سب سے پہلا حکم کون سا ہے تو آپ نے موسیٰ کے وہ الفاظ پیش کئے جو اُس نے بنی اسرائیل سے کہے تھے۔ "سُن لے اے اسرائیل خداوند ہمارا خدا اکیلا خداوند ہے۔ تو اپنے سارے دل اور اپنے سارے جی اور اپنے سارے زور سے خداوند اپنے خدا کو دوست رکھ۔" (استثنا ۶: ۴، ۵)۔ اگر یسوع نے اُسے تسلیم کیا ہے تو ہم بھی اُسے مان سکتے ہیں اور ماننا چاہئے۔

اب مسلمان کہہ سکتے ہیں اور اُن کا یہ کہنا سچائی سے میل کھاتا ہے کہ جس تعلیم توحید کو وہ مانتے ہیں۔ قرآن کے اصل الفاظ سے اُس ہی کا فی تائید ہوتی ہے۔ لیکن مسیحی بائبل کی سیدھی تعلیم سے بہک گئے ہیں (جیساکہ بائبل کے حوالہ مذکور سے ظاہر ہے)، اور ایسا عقیدہ تجویز کر لیا ہے جو صرف ناپسندیدہ ہی نہیں

ہے بلکہ بائبل سے بھی جس کی تائید نہیں ہوتی ہے۔

ہم اس بات کو مانتے ہیں آزاد ہیں کہ عقیدہ تثلیث بحیثیت مسئلہ الٰہیات انجیل کے اصل پیغام میں موجود نہیں ہے لیکن تاہم اناجیل میں ایسی باتیں موجود ہیں کہ بعد میں اس عقیدہ کو خاص مسئلہ کی صورت پر لاتے ہیں جن سے بڑی مدد ملی بلکہ یہاں ہم وہ عجیب خیال پاتے ہیں کہ جس کا سرچشمہ براہ راست قدیم مسیحیوں کا پُر طاقت اور مسرت انگیز تجربہ ہے۔

وہ مسیح کی زندگی کے مطلب پر خود غور کرنے کے لئے مجبور ہوئے۔ مسیح کو وہ اپنی معلومات کے کسی حصے میں نہیں شامل کر سکے۔ مسیح کی تعلیم میں نہیں بلکہ آپ کے خصائل۔ آپ کے افعال اور ان کے ساتھ جو آپ کے شخصی تعلقات تھے اُن سب سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ آپ کا تعلق خدا سے اور خدا کی قدرت حکمت اور محبت کے ساتھ ایک بے نظیر طریقہ پر تھا۔ ساری معلومات سے جس کی حیثیت جداگانہ تھی اُن سب سے اُنہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ مسیح ذاتِ الٰہی کی حد میں ہے لہذا اپنے اس عقیدہ کا اظہار آپ کو "ابن اللہ" کے نام سے پکار کر کیا۔

جب مسیح اُن کو چھوڑ کر چلے گئے تو انہوں نے اپنے اندر روح کی سکونت کا تجربہ کیا۔ یہ مسیح کے اپنے وعدہ کے مطابق تھا اور آپ کے قول کے مطابق انہوں نے پایا کہ روح مسیح کی چیزوں کو لے کر اُن پر اُنہیں ظاہر کرتا تھا۔ آپ کے الفاظ پر سچ نکلے کیونکہ لوگوں کے دلوں میں مسیح کے کام کو روح نے جاری کیا۔ اُنہیں گناہ سے قائل کرتا اور راست بازی کے لئے انہیں پاک کرتا اور بالآخر قدیم مسیحیوں نے روح کو "پاک" کہا اور یوں فی الحقیقت اُنہوں نے روح کو بھی ذاتِ الٰہی کی حد میں رکھا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اُنہوں نے باپ کو جس کی منادی یسوع نے کی اور خود یسوع کو اور روح القدس کو

اپنے تجربہ میں اخلاقی حیثیت سے ایک پایا۔ اور اپنے اس تجربہ سے انہوں نے عقیدہ ثالوث کے مسئلہ کو خاص صورت پر ترتیب دیا۔

حاصل کلام ضروری بات تعلیم نہیں بلکہ تجربہ ہے اور تجربہ ہم حاصل کر سکتے ہیں اور کرتے بھی ہیں۔

واقعۂ صلیب

بہتوں کو یہ سُن کر تعجب ہوتا ہے کہ راسخ الاعتقاد مسلمان مانتے ہیں کہ یسُوع نہیں مرے اور یہی سبب ہے کہ ہمارے بیان کا وہ صاف انکار کر دیتے ہیں اگرچہ ہم دوسرے باب میں دیکھیں گے کہ جدید فرقہ جو عقل پر زور دیتا ہے ان کا اس انکار سے مطلب یہ ہے کہ یسُوع صلیب پر نہیں مرے۔

یہ خیال بھی قرآن ہی سے ماخوذ ہے۔ اگرچہ اس بارے میں قرآن کی جو عبارت ہے ان میں ذومعنی بات پائی جاتی ہے۔ مندرجہ ذیل آیات اس کے متعلق ہیں۔

یسُوع حالت شیر خوارگی میں گہوارہ میں بولتے ہیں۔ " اور مجھ پر خدا کی امان جس دن میں پیدا ہُوا اور جس دن مروں گا اور جس دن دوبارہ زندہ اُٹھا کھڑا کیا جاؤں گا" سورۃ مریم (رکوع ۲) آیت ۳۴۔

اور جب قیامت کے قریب عیسیٰ دوبارہ دُنیا میں آئیں گے تو جتنے اہل کتاب ہیں ضرور ان کے مرنے سے پہلے سب کے سب ان پر ایمان لائیں گے اور قیامت کے دن عیسیٰ ان منکرین کے خلاف گواہی دینگے سورۃ النساء (رکوع ۲۲) آیت ۱۵۷۔

اسی زمانہ میں اللہ نے عیسیٰ سے فرمایا کہ اے عیسیٰ دُنیا میں تمہارے

رہنے کی مدت پوری کر کے ہم تم کو اپنی طرف اُٹھا لیں گے اور کافروں کی صحبت کی گندگی سے تم کو پاک کر دیں گے۔ سورۃ آلِ عمران (رکوع ۶) آیت ۴۸۔
اور ان کے اس کہنے کی وجہ سے ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ مسیح کو قتل کر ڈالا اور (حقیقت الحال یہ ہے) کہ نہ تو انہوں نے اُن کو قتل کیا اور نہ اُن کو سولی چڑھایا مگر اُن کو ایسا ہی معلوم ہوا کہ وہ عیسیٰ کو سولی دے رہے ہیں اور جو لوگ اس بارے میں اختلاف کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ عیسےٰ کو سولی دی گئی تو اس معاملہ میں یہ لوگ ناحق شک میں پڑے ہیں۔ اُن کو اِس کی واقعی خبر تو نہیں مگر صرف اٹکل کے پیچھے دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ اور یقیناً عیسیٰ کو لوگوں نے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اُن کو اپنی طرف اُٹھا لیا۔ سورۃ النساء (رکوع ۲۲) آیت ۱۵۶ مقابلہ کرو سورۃ المائدہ آیت ۱۱۷۔
آیات مذکورہ کی بنا پر مختلف بیانات مسلمانوں کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں۔
(۱) راسخ الاعتقاد مسلمان سورۃ النسا کی رکوع ۲۲ آیت ۱۵۶ سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یسوع مرے نہیں بلکہ خدا نے آسمان پر آپ کو زندہ اُٹھا لیا۔ اِن کی دلیل یہ ہے کہ یسوع ایسی شرمناک موت نہیں مر سکتے تھے کیونکہ تب وہ خدا کے ملعون ہو جاتے (استثنا ۲۱: ۲۳) اور خدا کے نبی کے لئے یہ ناممکن ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ درحقیقت ایک اور شخص آپ کی صورت پر بن گیا۔ اور لوگوں نے اُس شخص کو صلیب دی لیکن خدا نے یسوع کو بے ضرر آسمان پر اُٹھا لیا۔ مگر مسلمان اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کر جاتے ہیں کہ انجیلی بیانات سے ظاہر ہے کہ یسوع نے اپنی مرضی سے اس شرمناک موت کو تسلیم کیا۔

(۲) باقی اور آیتوں سے اس کے برعکس یہ ظاہر ہوتا ہے کہ محمد صاحب کے خیال کے مطابق یسوع فطری موت سے مرے لیکن صرف تھوڑے عرصہ تک موت کی حالت میں رہے کیوں کہ جگہ جگہ قرآن میں یہ بھی آیا ہے کہ خدا نے اُسے اُوپر اُٹھا لیا۔ درحقیقت بعض پُرانے مفسرین کہتے ہیں کہ مسیح موت کی حالت میں تین گھنٹے اور بعض کے مطابق سات گھنٹے تک رہے۔ دیکھو تفسیر سر سید احمد خاں مقتبس از تفسیر کبیر امام فخر الدین رازی سورہ آل عمران آیت ۴۸)

بہر حال ان آیات مذکورہ سے یہ ظاہر ہے کہ قرآن یسوع کی صلیبی موت کا انکار کرتا ہے۔ اس کا کیا سبب ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ محمد صاحب نے قدیم بدعتی فرقہ ناستک کی تعلیم سُنی ہو اور اس تعلیم کا اُن پر اثر ہُوا ہو جس فرقہ کے بعضوں کے خیال کے مطابق رومی افسروں نے شمعون کرینی کو یسوع کی جگہ دھوکہ میں صلیب دے دی اور بعضوں کی رائے کے مطابق یہودا اسکریوطی صلیب پر کھینچا گیا۔ بے شک زمانۂ بعد کے مسلمانوں نے اِن خیالات کو اختیار کیا ہے۔

یہ ممکن ہے کہ محمد صاحب نے یسوع کی عزت کی خاطر اور یسوع کے نام کو اس ملامت سے صاف کرنے کے لئے کہ صلیبی موت کے سبب جس کے قابل یہودی آپ کو سمجھتے تھے اس بدعتی فرقہ کے اس خیال کو سچا قرار دیا ہو کہ اُن کی صورت کا کوئی دوسرا شخص صلیب پر کھینچا گیا تھا بہر حال سورۃ النساء کی ۱۵۶ آیت سے اس قسم کے خیال کی طرف کنایہ پایا جاتا ہے۔

علاوہ اس کے معلوم ہوتا ہے کہ محمد صاحب کے خیال میں مسیحی

بڑائی کی مستقل علامت کامیابی تھی۔ اس لئے کل انبیاء جن میں یسوع بھی شامل ہیں ضرور کامیاب ہوئے ہوں گے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ ایسا اولوالعزم نبی صلیب پر مرے۔ ضرور کوئی بڑی غلطی اس امر میں ہوئی ہے۔ یہود جنہوں نے بارہا جھوٹ بولا ہے۔ ضرور یہ اُن کا ہی جھوٹ ہے۔ یسوع کو انہوں نے صلیب پر نہیں مارا ہوگا بلکہ کسی دوسرے کو دھوکے میں یسوع سمجھا اور اُسے صلیب پر اُنہوں نے کھینچا ہوگا +

کفّارہ

مسلمانوں کا واقعۂ صلیب کے انکار کے بعد کفّارہ کی تعلیم کو فضول بتانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے لیکن اُن کے اس خیال کی اصل توجیہ واقعۂ صلیب کا قرآنی انکار اس قدر نہیں ہے جتنا کہ اللہ کا عام اسلامی تصوّر جو قرآن میں ہے اور جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کفّارہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اس امر میں قرآن کی تعلیم اس قدر واضح اور پُر زور ہے کہ نہایت ہی اختصار کے ساتھ اس کا اجمالی بیان ذیل میں یوں پیش کیا جا سکتا ہے۔

اللہ قادرِ مطلق ہے .... یعنی وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔

اللہ رحمٰن و رحیم ہے .... یعنی جسے چاہے وہ معاف کرے۔

پھر گناہ کی عام اسلامی تعلیم سے اللہ کی قدرت و رحمت کا چند اخلاقی صفات سے قطعاً خالی ہونا ثابت ہوتا ہے (دیکھو صفحہ ۳۵۲)

گناہ کے لئے قرآن میں تین خاص اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں

(۱) ذنب ۔ ۳۸ مرتبہ مستعمل ہُوا ہے۔ اس لفظ سے کسی مذہبی رسم کے ترک کر دینے کی تقصیر مُراد ہے۔

(۲) اثم ۔ ۲۹ مرتبہ مستعمل ہُوا۔ اس لفظ سے قریب وہی مراد ہے جو ذنب سے

(۳) خطا ۔ ۵ مرتبہ مستعمل ہُوا ہے۔ تینوں الفاظ میں سے یہ لفظ گناہ کے تصور سے زیادہ نزدیک ہے کہ جس سے مراد خُدا کے مقرر کردہ معیار سے بھٹک جانا ہے۔

مسلمانوں کی کتابیں گناہ کے اسی تصوّر پر شہادت دیتی ہیں۔ رسمی شریعت میں اس قدر باریکیاں ہیں کہ وہ ایک بوجھ بلکہ حقیقتاً اُن کے لئے ایک جوا ہے اور اگرچہ یہ صحیح ہے کہ قرآن غرور اور حسد وغیرہ جیسے گناہوں کو بُرا بتاتا ہے اور علماءِ شرع نے گناہِ کبیرہ کی فہرست تیار کی ہے تاہم یہ بھی صحیح ہے کہ ساری خطائیں شرک کی بدعت کے سامنے جو سب سے بڑا اور ناقابلِ عفو گناہ ہے باقی تمام گناہ بغیر کسی مستثنیٰ کے ادنیٰ ہیں۔ خود یہ حقیقت اس اسلامی خیال پر روشنی ڈالتی ہے کہ خدا کا رجحان بُرائی کی طرف کیسا ہے

اسلام کے مسئلہ تقدیر سے بھی خدا کی رحمت کو صدمہ پہنچتا ہے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو انسان کی قسمت کا فیصلہ اٹل فرمانِ الٰہی کی تحت ہو چکا ہے۔

اگرچہ بالکل واجب طور پر اس مسئلہ کے سبب توکّل و صبر کی تلقین کی جاتی ہے لیکن ان مقاصد تک ہی یہ مسئلۂ تقدیر محدود نہیں ہے۔ قرآن میں بار بار یہ مسئلہ صریح الفاظ میں نظر پڑتا ہے۔

خُدا جسے چاہے گمراہ کر دے اور جسے چاہے اُسے راہِ راست پر لگا دے۔ سورۃ الانعام (رکوع ۴) آیت ۳۹۔

اور بے مشیت الٰہی تم لوگ کوئی بات چاہ نہیں سکتے بے شک

اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ سورۃ الدہر (رکوع ۲) آیت ۳۰۔
اور جس کو خدا گمراہ کرے تو کوئی اُس کا راہ دکھانے والا نہیں۔ سورۃ الرعد (رکوع ۵) آیت ۳۳۔
اور ہم نے ہر آدمی کی برائی بھلائی کو اس کے ساتھ لازم کر کے اس کے گلے کا ہار بنا دیا ہے اور قیامت کے دن ہم اس کا نامۂ اعمال نکال کر اس کے پیش کر دیں گے۔ سورۃ بنی اسرائیل (رکوع ۲) آیت ۱۴۔
اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو لوگوں کو ایک ہی امت کا کر دیتا لیکن لوگ ہمیشہ آپس میں اختلاف کرتے رہیں گے مگر جس پر تمہارا پروردگار فضل کرے اور اس لئے تو اُن کو پیدا کیا ہے وہ فرمودہ پورا ہو کر رہے گا کہ ہم جنات اور بنی آدم سب سے دوزخ بھر دیں گے۔ سورۃ ہود (رکوع ۱۰) آیت ۱۲
یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی تعلیم کے زیر اثر یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی مسلمان گناہ کے اُس تصور کا قریبی ادراک بھی حاصل کر سکے جو ہم مسیح سے سیکھتے ہیں یعنی یہ کہ گناہ آسمانی باپ کی محبت کے خلاف جرم ہے۔ اس کے برعکس اسلام میں اللہ مطلق العنان خدا ہے اور بے رحم قسمت کا لوگوں کی خطاؤں کو پہلے ہی سے مقرر کر دینا معلوم پڑتا ہے اور یہ خطائیں ہیں کیا۔ شرک کے خوفناک ہوّا کے ماسوا زیادہ تر باقی خطائیں اُس قسم کی نہیں ہیں کہ جن سے انسان کی روح کو سخت صدمہ پہنچتا ہے۔
مندرجہ بالا قرآن کے حوالوں کا ذیل کے بائبل کے حوالوں سے مقابلہ کرو۔ اس قسم کی باتیں قرآن میں کہیں نہیں ملیں گی۔
خداوند کسی کی ہلاکت نہیں چاہتا بلکہ یہ چاہتا ہے کہ سب کی توبہ تک نوبت پہنچے۔ ۲ پطرس ۳: ۹۔ وہ (خدا) چاہتا ہے کہ سارے

آدمی نجات پائیں اور سچائی کی پہچان تک پہنچیں۔ ۱۔تمتھیس ۲ : ۴۔ خُداوند یہوواہ فرماتا ہے مجھے اپنی حیات کی قسم کہ شریر کے مرنے میں مجھے کچھ خوشی نہیں بلکہ اس میں کہ شریر اپنی راہ سے باز آئے اور جیئے۔ حزقی ایل ۳۳ : ۱۱ و ۱۸ : ۲۲ و ۲۳۔

قرآن میں نجات کا ذکر کم آیا ہے مثلاً لفظ نجات بطور اسم کے صرف ایک ہی مرتبہ سورۃ مومن رکوع ۵ میں آیا ہے اور جہاں نجات کا ذکر آیا بھی ہے وہاں اخلاقی اور روحانی اعتبار سے نئی زندگی مراد نہیں ہے۔

اس لئے ہمارا پہلا کام یہ ہے کہ خدا کے اخلاق و عادات کو اُس دائرہ کے باہر نکالنے میں مدد کریں جہاں اسلام نے رکھا ہے اور اُس کی ذات اُس کی پاکیزگی اس کی راست بازی اور اُس کی محبّت کے زیادہ لائق تصور کی طرف مسلمانوں کی رہنمائی کریں اور ہم اُن کو یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ انسان جس قدر تائب ہوگا اُسی قدر گناہ کا اُس میں احساس بھی زیادہ ہوگا اور یہاں اس سلسلہ میں ہم مسیح کی صلیبی موت کی ضرورت اور طاقت اُن پر ثابت کر سکتے ہیں۔

ہم اپنے تجربہ سے ظاہر کر سکتے ہیں کہ مسیح کے دُکھ و اذیت کے معنی و مقصد پر دھیان کرنے سے خدا کا زیادہ بہتر تصوّر اور گناہ کا زیادہ صحیح خیال ہم کو حاصل ہوتا ہے۔

پانچویں فصل

نیا مجادلہ

اسلام کی نئی حمایت کے ساتھ ساتھ گذشتہ صدی کے آخری حصّہ میں ایک نیا مجادلہ مسیحیت کی صریح مخالفت کے مقصد سے ظہور پذیر ہوا۔ یہ امر محتاج بیان نہیں کہ نئے مجادلہ کا آغاز نہ تو سر سید احمد نے اور نہ ہی اُن کے ہم خیال لوگوں نے کیا۔ سر سید نے جن موقعوں پر اسلام کو عقلی بنیادوں پر بحال کرنے کی فوری ضرورت کو محسوس کیا تو دوسرے لوگ جو تند مزاج طبیعت کے تھے ایسے موقعوں پر اپنے دعوے کی حمایت میں نالائق ذرائع کے استعمال کی طرف مائل ہوئے۔

۱۸۷۵ء سے قبل کی بحث جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ کُتب و معجزات اور چند خاص تعلیمات مثلاً الوہیت مسیح۔ تثلیث اور کفارہ تک موجود تھی لیکن قریب قریب اس تاریخ سے جماعت احمدیہ یا زیادہ درستی کے ساتھ مرزا غلام احمد اور اُس کے تابعین مسیحیت کی تحریک پر حملہ کرنے کے لئے اور دوسری قسم کے ہتھیار استعمال کرنے لگے۔ اہلِ مغرب "اسٹراس" اور "شمبڈل" جیسے غیر ذمہ دار نکتہ چین کی تصنیفات کے ذریعہ پہلے ہی اس قسم کے ہتھیار سے واقف ہو چکے تھے اور جماعت احمدیہ کے مصنفوں کی مجادلانہ تصنیفات صریحاً انہی لوگوں کے خیالات سے ماخوذ ہیں مثلاً کتاب مقدس کی نسبت تنقید اعلےٰ کے نہایت ہی انتہا

پسند خیالات کے لوگوں کے آرا صحائف مقدسہ کے متن کو غیر معتبر ثابت کرنے کے لئے آزادانہ طور پر استعمال کئے گئے ہیں اور ان انتہا پسندوں کے خیالات کو آج کل کے نہایت ہی لائق مسیحی علماء کے غور وفکر کا ماحصل بڑی بے باکی سے بتایا گیا ہے۔

اور پھر ان احمدیوں نے عام طرز کے دلائل کے ذریعہ مسیحیت کو غیر معتبر ثابت کرنے کی بھی کوشش کی ہے کہ جن خیالات میں پھر انتہا پسند خیالات کے مغربی نکتہ چینیوں کا اثر پایا جاتا ہے مثلاً یہ کہنا کہ مسیحی مذہب کا موجد مسیح نہیں بلکہ پولوس ہے اور کہ کلیسیا کے رسوم اور اُس کے تیوہاروں سے پتہ لگتا ہے کہ مسیحیت کا ماخذ بت پرست مذاہب ہیں اور رومیوں اور یونانیوں کے قدیم مذاہب کا اثر اس میں اب تک موجود ہے اور کہ مسیحیت کا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا کہ یہ ایک عالمگیر مذہب مانا جائے۔ چنانچہ خود مسیح نے اپنی خدمات اسرائیل کے گھرانوں تک ہی محدود رکھیں پھر وہ اعتراض کرتے ہیں کہ مغربی ممالک کے گرجوں کی عبادتوں میں لوگوں کی تعداد کا کم ہونا مسیحیت کے اثر کے زائل ہونے کی دلیل ہے اور جماعتی حالات بھی مورد الزام ٹھہرائے گئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ عورتوں کی حیثیت اور طلاق کی کثرت سے خصوصاً امریکہ کے ممالک متحدہ میں جیسی کچھ کہ حالت ہے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان عورتوں کی حالت زیادہ اچھی ہے اور کہ بہر حال بدکاری کا قانوناً جائز ٹھہرالینا اسلامی شریعت کثیر ازدواجی کو جائز قرار دینے سے کہیں بدتر ہے وغیرہ۔ احمدیوں کا بیان ہے کہ مسیحی مبلّغوں کی غلط بیانی کے سبب مغرب میں اسلام صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا اور یوں مسیحی ممالک کو اصل حقیقت سے آگاہ کرنا اور اس دوران عمل میں کلیسیاؤں کے تبلیغی

مساعی کو بے کار کر دینا اُن کے علانیہ مقصد کا ایک جزو ہے۔ ان کے ہاں ایک ہادی کا بیان ہے کہ "یورپ اور امریکہ کے دو بہ اعظم جو اسلام کی مخالفت کرنے میں مسیحیت کو مدد پہنچا رہے ہیں وہ قطعاً اسلام سے ناواقف ہیں اور اس تحریک کو اُس غلط تصوّر کے زیر اثر دہ چلا رہے ہیں جو مسیحی مبلّغوں نے اُن کے ذہن میں پیدا کر رکھا ہے.........
اگر ہم ان ممالک میں اسلامی رسائل و کتب کی نشر و اشاعت کریں......
تو ہم نہ صرف مسیحی تبلیغ کی ترقی ہی روک سکیں گے بلکہ اُس کی حیات بخش طاقت کے مرکز پر موت کی ضرب لگا سکیں گے۔" انہی احمدیوں کی کوششوں سے لندن و بیریں اور برلن میں مسجدیں تعمیر ہوئی ہیں۔

خُداوند یسُوع مسیح کی بابت خیالات کے رجحان میں تبدیلی

لیکن اس نئے مجادلہ کی نہایت ہی نمایاں صفت امتیازی خُداوند یسُوع مسیح کے نام کی بے عزتی کرنے کی کوشش ہے کہ جس کا آغاز قادیانی جماعت کے بانی نے کیا۔

اب تک مسلمانوں کی نگاہ میں خداوند مسیح کے نام کی بڑی وقعت رہی ہے اور قرآن کے اُن مقامات نے جہاں اگر آپ کو عدیم المثال اہمیّت نہیں تو کم از کم خاص عزت تو دی گئی ہے۔ مسلمانوں کے دلوں میں خداوند مسیح کی عزت صدیوں سے قائم رکھی ہے (سورۃ آل عمران آیت ۴۰ سورۃ النساء آیت ۱۶۹) لیکن گزرے پچاس سال سے اس نئے خیال کا اثر قدیم نقطۂ نگاہ کے بدلنے میں رفتہ رفتہ اپنا کام کر رہا ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ مسلمانوں میں اعلے خیالات کے لوگ اس طرز سے

متنفرہیں تاہم یہ صاف ظاہر ہے کہ جو اپنے آپ کو احمدی نہیں کہتے وہ بھی اسلام کو افضل مذہب ثابت کرنے کی کوشش میں مسیحیت کے خلاف اس نئے ہتھیار کے استعمال سے نہیں جھجکتے۔

مرزا قادیانی نے اس قسم کے دلائل کو جائز ٹھہرانے کی غرض سے کہ جس سے اُس وقت کے بہتیرے مسلمان برانگیختہ ہو گئے تھے یہ کہا کہ میں قرآن کے عیسیٰ پر نہیں بلکہ اناجیل کے یسُوع پر حملہ کر رہا ہوں۔ لیکن اُس کا یہ قول جس قدر اخلاص سے خالی ہے اُسی قدر غیر معقول بھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تین وجوہات کی بنا پر اُس نے اس طرزِ مجادلہ کو اختیار کیا۔

(۱) جن علانیہ مناظروں کا آغاز ڈاکٹر فینڈر نے کیا تھا اُن میں اسلام اور محمد صاحب کے افشاء واقعات کے سبب ہندوستان کے مسلمانوں کے خیال و احساس میں جو ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے اثر کا ایک حصّہ اس تحریک کی بنیاد تھی اور یوں اندیشہ ہے کہ اس تحریکِ احمدیہ کی ابتدا سخت انتقام کی طبیعت میں کی گئی۔

(۲) اپنے اس دعوےٰ کی تائید میں کہ وہ مسیح موعود ہے اُس نے یہ لغو قصّہ اختراع کیا کہ مسیح نے صلیب پر نہیں بلکہ کشمیر میں فطری موت سے انتقال کیا اور یوں مرزا نے مسیحی ایمان پر ضرب کاری لگانے کی کوشش کی۔

(۳) اُس نے اپنی فراست سے جو اس میں کافی طور پر تھی یہ معلوم کیا کہ سب سے بڑا مسئلہ تصفیہ طلب دونو مذاہب کے مابین اُن کے بانیوں کا ہے اور اس معاملہ میں جماعتِ احمدیہ کے دونوں فریقین کی اس نے رہنمائی کی ہے اور یہ لوگ اب مانتے ہیں کہ حقیقی بحث نہ تو اس کتاب یا اُس کتاب کی ہے اور نہ اس عقیدہ یا اس عقیدہ کا ہے بلکہ مسیح یا محمد کے سوال پر ہے گویا کہ اُن لوگوں نے ٹھان لیا ہے کہ جو کچھ

محمد صاحب نہیں ہو سکتے وہ مسیح بھی نہیں ہونے پائینگے۔

اگر جماعت قادیانی کے بانی کے رجحان و مقصد کے مزید ثبوت کی ضرورت ہے تو یہ اُس کے بیان سے ملتی ہے جسے ہم اُس کی "آخری وصیت" کہہ سکتے ہیں۔ اپنی کتاب میں وہ لکھتا ہے "اے میرے دوستو! میری ایک آخری وصیت سنو۔ اور ایک راز کی بات کہتا ہوں اِس کو خوب یاد رکھو کہ تم اپنے ان تمام مناظرات کا جو عیسائیوں سے پیش آتے ہیں پہلو بدل لو اور عیسائیوں پر یہ ثابت کر دو کہ درحقیقت مسیح ابن مریم ہمیشہ کے لئے فوت ہو چکا ہے۔ یہی ایک بحث ہے جس میں فتحیاب ہونے سے تم عیسائی مذہب کی روئے زمین پر سے صف لپیٹ دو گے۔ تمہیں کچھ بھی ضرورت نہیں کہ دوسرے لمبے لمبے جھگڑوں میں اپنی اوقات عزیز کو ضائع کرو۔ صرف مسیح ابن مریم کی وفات پر زور دو اور پُر زور دلائل سے عیسائیوں کو لاجواب اور ساکت کر دو۔ جب تم مسیح کا مُردوں میں داخل ہونا ثابت کر دو گے اور عیسائیوں کے دلوں میں نقش کر دو گے تو اُس دن تم سمجھ لو کہ عیسائی مذہب دنیا سے رخصت ہُوا۔" (ازالہ صـــــ ۱۱۶)

اس شخص نے اپنے اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے جو کچھ کیا ہم اُن سے واقف ہیں۔ اُس نے اس قدیم بدعت کو کہ خداوند مسیح صلیب پر صرف بےہوش ہو گئے تھے تازہ کیا اور اُس نے کہا کہ صلیب سے اتار کر وہ پھر ہوش میں لائے گئے اور مرہم عیسیٰ نام ایک مرہم کے استعمال سے چالیس دن میں تندرست ہو کر کشمیر کو چلے گئے جہاں ایک سو بیس ۱۲۰ برس کی عمر میں انتقال کیا اور دفن ہوئے اور مرزا نے یہاں تک اعلان کیا کہ آپ کی قبر آج تک کشمیر کے صدر مقام سرینگر میں موجود ہے۔

ایک اَور بیان جو اسی مزاج میں لکھا گیا ہے مسیح کی پیدائش کے متعلق ہے جو لاہور کی احمدیہ جماعت کی طرف سے ایک مضمون کی صورت میں شائع ہوا تھا۔ کہ جس میں مسیح کی بے عزتی کرنے کا وہی مصمم ارادہ موجود ہے چنانچہ لاہوری جماعت کا وہ بیان یہ ہے۔ اسلام اور مسیحیت دنیا پر غلبہ پانے کے لئے ایک سخت لڑائی میں مصروف ہیں اور اس لئے اسلام کی بہتری کے لیے چاہیئے کہ مسیح اپنی الوہیّت کی پاء ستون سے نیچے اُتار ڈالا جائے۔ اُس کی معجزانہ پیدائش اور معجزانہ آسمانی صعود کا اقبال کرکے مسلمان اس مسیحی دعوے کی تصدیق کر رہے ہیں کہ وہ انسان نہیں بلکہ خدا ہے اور اس لئے آج کل کی یہ تحت ضرورت ہے کہ ثابت کر دیا جائے کہ مسیح بعینہٖ اسی طرح پیدا ہوا تھا جس طرح اور انسان پیدا ہوتے ہیں اور کہ دوسرے فانی انسانوں کی طرح اُسے بھی موت کا مزا چکھنا پڑا۔" دی لائٹ اکتوبر ۱۹۲۹ء۔

خداوند مسیح پر احمدیہ حملوں کے صرف چار پہلوؤں پر اختصار کے ساتھ ہم یہاں غور کریں گے۔ گذری فصل میں ہم نے مسیح کی صلیبی موت کے انکار پر غور کیا تھا۔ یہاں ہم اُن اعتراضات کا بیان کریں گے جو مسیح کی معجزانہ پیدائش۔ معجزات۔ اخلاقی چال چلن اور آپ کے جی اُٹھنے پر انہوں نے کیا ہے۔

افسوس ہے کہ بعض مسیحی مصنّفین نے مسیحی ایمان کے ارکان کے بیان کرنے میں کبھی کبھی بے احتیاطی سے کام لیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض مسلمان درحقیقت الجھن میں پڑ جاتے ہیں اور اُن کی سمجھ میں نہیں آتا کہ فی الواقعی مسیحی ایمان کے اصول ہیں کیا اور پھر ایسے لوگ بھی ہیں جو ان غیر محتاط

اور نقیض بیانات سے بڑا فائدہ اٹھانے کو بہایت مستعد ہیں۔
چنانچہ ایک چھوٹے سے رسالہ میں جماعت احمدیہ کے ایک مشہور پیشوا نے نہ صرف یہ دعویٰ کیا ہے کہ (۱) "مسیحی مذہب نے اپنی بنیاد نہ صرف مسیح کی صلیبی موت اور پھر جی اٹھنے پر رکھی ہے"۔ بلکہ اس پر بھی کہ (۲) "مسیحیت کی بنیاد ہی صرف مسیح کی تنہا بے گناہی پر ہے"۔ اور کہ (۳) "مسیح کی الوہیت کا ثبوت مسیحیوں کو اس کے معجزات میں ملتا ہے"۔ یہ ایک بڑی مفید بات ہوگی کہ جو لوگ مسلمانوں کے لئے لکھتے اور اُن میں منادی کرتے ہیں۔ صرف حقیقت بیان کرنے کی غرض سے مطالعہ کیا کریں اور مبالغہ آمیز باتوں سے ہوشیاری کے ساتھ پرہیز کریں۔ جو واقعات کا ہمیں جہاں تک علم ہے وہاں تک اپنے بیانات کو پورے طور پر محدود رکھنے میں کسی قسم کا اندیشہ نہیں ہے۔

فوق الفطرت پیدائش

جس مضمون کا اقتباس ہم نے اوپر پیش کیا ہے۔ اسی مضمون میں احمدی مضمون نویس نے قرآن اور انجیل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسیح کی پیدائش عام قانون فطرت کے مطابق تھی اور ساتھ ہی وہ یہ بھی مانتا ہے کہ "اب تک اوسط مسلمان کے دل کو اس خیال سے ہی کہ مسیح کسی انسانی باپ سے پیدا ہوا تھا صدمہ پہنچتا ہے"۔ وہ اپنے ہم مذہب لوگوں کے خیالات کی غیر مطابقت پر اُن کی ملامت کرتا ہے کہ مسیح کی فوق الفطرت پیدائش کا جب وہ اقرار کرتے ہیں تو پھر اُس کے نتیجہ کے ماننے سے کہ وہ ذات الہٰی سے ہے اُن کو کیوں

انکار ہے۔ لاہوری جماعت کے برعکس قادیانی جماعت مسیح کا کنواری مریم سے پیدا ہونا مانتی ہے۔ لیکن اس کی اہمیّت کو یہ کہہ کر گھٹا دیتی ہے کہ بُت پرستوں کے مذہب میں بھی اس قسم کے واقعات موجود ہیں۔

یہ مضمون نویس اس بات پر زور دینے کے بعد کہ اس واقعہ کے متعلق قرآنی بیانات کو مسلمانوں اور مسیحیوں دونوں نے غلط سمجھا ہے اور کہ متی اور لوقا نے جو کچھ اس کے بارے میں تحریر کیا ہے وہ غیر مستند ہے۔ آگے چل کر لکھتا ہے کہ اناجیل کے اس سارے قصّہ کی بنیاد یسعیاہ کا کنواری کے ذکر کرنے پر ہے۔ (یسعیاہ ۷: ۱۴) لیکن ڈاکٹر اے بی۔ ڈیوڈسن نے ثابت کر دیا ہے کہ اصل عبرانی لفظ جو نبی نے استعمال کیا تھا اس سے یہ مطلب نہیں نکلتا۔

اب یہ ان مضامین سے ہے کہ جن کے متعلق یہ کہنا صحیح ہے کہ اگر ہم بڑھ چڑھ کر اُن کے حق میں دعوے کریں تو ہمیں کچھ حاصل نہ ہوگا اور اس مسئلہ میں مبالغہ کرنے سے خدشہ ہے کہ مسلمانوں کو حقیقی فیصلہ طلب معاملہ کے سمجھنے میں الجھن واقع ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ مسیح کی پیدائش کا مسئلہ ہمارے مسیحی ایمان پہ حقیقی اثر نہیں ڈالتا اور اس کے طریق پیدائش کے مسئلہ سے نہ تو اس کی "بے گناہی" نہ اسکی "ابنیّت" اور نہ اس کی "الوہیت" کے مسائل وابستہ ہیں۔

نوٹ:۔ ڈیوڈسن کا یہ کہنا صحیح ہے کہ اصل عبرانی لفظ کا ترجمہ اس موقعہ پہ غیر مناسب طور سے کنواری کیا گیا ہے بلکہ اس کے معنی شادی کے سن کو پہنچی ہوئی لڑکی ہے۔ متی نے کنواری کا لفظ عبرانی سے نہیں بلکہ پرانے عہد نامہ کے سیپٹواجنٹ یعنی یونانی ترجمہ سے لیا ہے جہاں لفظ پرتھینوس ہے کہ جس کے معنی کنواری کے ہیں۔

علاوہ اس کے اس مسئلہ میں جو کئی ایک دقتیں ہیں اور جنہیں احمدی بڑھا کر بیان کرتے ہیں اُن کو صاف دلی سے ہمیں مان لینا چاہئیے۔ مثلاً یہ سچ ہے کہ (۱) اگر گنہگار فطرت ماں باپ دونوں سے بچّہ تک پہنچتی ہے تو پھر صرف ماں سے بھی بآسانی پہنچ سکتی ہے۔ (۲) عہد نامہ کے باقی حصّہ میں اس مسئلہ پر ایک عجیب قسم کا سکوت پایا جاتا ہے۔ پولوس جو کچھ اس کے متعلق کہتا ہے۔ (مقابلہ کرو گلتیوں ۴:۴) وہ ایوب کی کتاب کی بعض آیتیں قریب قریب لازمی طور پر یاد دلاتی ہیں (ایوب ۱۴:۱ او ۲۵:۴) مسلمان بھی انہیں جانتا ہے اور قطعی ثبوت کے طور پر مریم کے حق میں انہیں پیش کرتا ہے۔ (۳) پیدائش مسیح کے بیانات میں جو متی اور لوقا کی انجیلوں میں ہیں مطابقت کرانا نہایت ہی مشکل ہے۔

(۴) یہ مشہور ہے کہ دیوتاؤں کے قصّے اُن دنوں بُت پرستوں کے درمیان خوب پھیلے تھے۔

شاید یہ باتیں پہلے بڑی مشکل ہی کیوں نہ معلوم پڑیں تاہم اُن سے گھبرانے کی کوئی بڑی وجہ نہیں ہے۔

(۱) نئے عہد نامہ کا سکوت درحقیقت کوئی بڑی اہمیّت نہیں رکھتا۔ یہ بہت ممکن ہے کہ اس سکوت کا سبب مسیح کی موت کے بڑے عرصہ تک رسولوں پر اس واقعہ کو ظاہر کرنے میں مریم کی ہچکچاہٹ ہو اور پولوس کے خاموش رہنے کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ شروع ہی سے (مقابلہ اعمال ۹:۲۰) اُس نے مسیح کی الوہیّت کو آپ کی پیدائش کے ہر نظریہ سے بالکل علیحدہ رکھا ہے۔ علاوہ اس کے جن حالات کے تحت پولوس نے انجیل کا اعلان بُت پرستوں سے نکلے

ہُوئے نو مریدوں کے سامنے کیا تھا۔ اس مسئلہ کو مسیح کی تعلیم کا جزو بنا کر پیش کرنے میں یہ خطرہ تھا کہ اُس سے اُن میں غلط فہمی پیدا ہو جائے اور پھر یہ تعلیمی مسائل کے اعتبار سے غیر ضروری مسئلہ بھی تھا۔

(۲) درحقیقت متی اور لوقا کے بیانات آپس میں ایک دوسرے کے ضد نہیں ہیں۔ یہ دو نقطۂ نگاہ سے لکھے گئے ہیں۔ ایک یعنی متی کا بیان یُوسف کے نقطۂ نگاہ سے لکھا گیا ہے اور دوسرا یعنی لوقا کا مقدسہ مریم کے نقطۂ نگاہ سے تحریر کیا گیا ہے اور پھر اہم معاملات میں ان کا آپس میں اتفاق ہے مثلاً ذیل کے بیانات پر دونو متفق ہیں۔

(ا) فوق الفطرت پیدائش کی مرکزی حقیقت۔

(ب) پیدائش کا بیت لحم میں ہونا۔

(ج) ہیرودیس کی سلطنت میں اس پیدائش کا ہونا۔

(د) بعد کو مسیح کا ناصرت میں رہنا۔

(۳) یہ نہایت ہی بعید العقل ہے کہ بُت پرستوں کے اثر کے سبب ایسے بیانات نے رواج پکڑ لیا ہو۔ اُس کی بہتیری وجوہات ہیں جن میں سے صرف چند ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔ نئے عہد نامہ سے فوراً پتہ لگ جاتا ہے کہ یہ کتاب اس قسم کے اثر سے بالکل بری ہے اور مرزا کے دعوے کے باوجود بھی علماء نے بُت پرستوں میں کسی ایسے بیان کا اب تک پتہ نہیں لگایا۔ ہے کہ جہاں درحقیقت پاک کنواری سے پیدا ہونے کا ذکر ہو بلکہ برعکس اس کے نئے عہد نامہ کے لکھنے والوں کا جو کچھ علم ہم کو ہے اس سے یہ بات بعید القیاس معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو اس قدر پست کیا ہو گا کہ بُت پرستوں کی کہانیوں کی

ذلیل باتوں کا استعمال کیا ہو۔

نہ ہم یہ مان سکتے ہیں کہ یہ واقعہ کسی یہودی مسیحی کی من گھڑت ہے کیونکہ یہودی کنوارے پن کی حالت کو نہیں بلکہ شادی شدہ حالت کو بڑی عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے لیکن اب مسیح کی فوق الفطرت پیدائش کے دعوے کی تائید میں ہمیں چند اور باتوں پر صفائی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

(۱) ہم اس مسئلہ پر اس طرح ہرگز بحث نہیں کر سکتے کہ گویا اس کا تعلق کسی معمولی انسان کے ساتھ ہے۔ خود مسیح کی زندگی کا بیان ہی ہمیں ایسا کرنے سے باز رکھتا ہے۔ نہیں بلکہ ہمارے کلام کا موضوع ایک ایسا شخص ہے جو ہمارے خیال میں اسی نام کا مستحق ہے جو سب ناموں سے اعلیٰ ہے کہ جس کی دنیاوی زندگی کا خاتمہ (اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے فرض کرلیں) اس کے دوبارہ جی اٹھنے پر ہوتا ہے۔ ہمارے زیر بحث تواریخ کی مرکزی شخصیت ہے اور یہ کوئی غیر معقول خیال نہیں ہے کہ ایسے شخص کی زندگی میں جو اس طرح فوق الفطرت ہے کنواری سے پیدا ہونا موزوں آغاز سمجھا جائے۔

(۲) متی اور لوقا نے اس واقعہ کے بیان کرنے میں عمدہ اور غیر معمولی طور پر احتیاط اور حجاب سے کام لیا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی اس کا غلط مطلب نکالے اور اس کا سبب یہ ہے کہ ان کے سامنے چند خاص حقیقتیں موجود تھیں۔ یعنی ایک طرف تو مسیح کا نسل داؤد سے ہونا معلوم تھا اور دوسری طرف اس کی قیامت نے خاطر خواہ طور پر پہلے شاگردوں کے لئے اس کی الوہیت کی تصدیق کردی تھی۔

اُن کا عمدہ سکوت واقعہ کی تازگی اور پاکیزگی ان بیانات کی صحت پہ ایک حجت ہے جو ہر طرح کے خیال فاسد اور ادنیٰ قسم کے تجسس سے بالکل خالی ہے اگر ہم کو ان خوبیوں کی قدر کا صحیح اندازہ لگانا ہے۔ تو چاہئے کہ اپاکرفل انجیلوں کا مطالعہ کر کے خود دیکھ سکیں کہ انسانی تصور اور اختراع کیا کچھ کر سکتی ہے لیکن ہاں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ انہیں اپاکرفل انجیلوں سے محمد صاحب نے خداوند مسیح کی پیدائش کے بعض بیانات لے کر قرآن میں درج کئے ہیں (دیکھو سورۃ مریم) یہ صاف ظاہر ہے کہ ان غیر مستند اناجیل کے بیانات کو مؤلفوں نے اپنے بھدے خیالات سے بگاڑ دیا اور ان کی وقعت کم کر دی ہے۔ ایک میں اصل واقعہ نہایت احترام کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور دوسرے میں انسان کے غیر پاکیزہ قوت متخیلہ کا افسانہ درج ہے۔

(۳) آخری بات یہ ہے کہ انجیل نویسوں نے جس بات پہ زور دیا ہے اور جس پہ ہمیں بھی زور دینا چاہئے وہ ایک سلبی بیان یعنی باپ کا نہ ہونا نہیں ہے بلکہ ایک ایجابی حقیقت ہے یعنی روح القدس کا سایہ کرنا اور اس حقیقت کے سبب ہمیں ماننا اور ثابت کرنا ہے کہ مسیح کے ساتھ اور مسیح کے وسیلہ انسانیت کے بہاؤ میں ایک نیا چشمہ یا نئی قوت کا داخلہ ہوتا ہے کہ جس کا منبع انسانیت نہیں ہے فضل اور سچائی یسوع مسیح کی معرفت پہنچی ہے۔ یوحنا ۱: ۱۷۔

خداوند مسیح کے معجزات

یہ مناظرہ کا ایک پرانا مضمون ہے اور مناسب طور سے اس پہ

بحث کرنے کا یہ موقعہ نہیں ہے تاہم چونکہ اس موضوع پر نئے طور سے اعتراض کیا جا رہا ہے ہم ذیل میں اختصار کے ساتھ اس پر غور کریں گے۔ مسیح کے معجزات کے خلاف جس قسم کی دلائل پیش کی جا رہی ہیں ایک چھوٹی سی کتاب میں صفائی کے ساتھ ظاہر کی گئی ہیں۔ یہ کتاب محمد اینڈ کرائسٹ (محمد اور مسیح) ہے کہ جس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے اور جو مولانا محمد علی میر جماعت احمدیہ لاہور کی تصنیف ہے

اس کتاب میں انجیلی بیانات کا ایسا استعمال کر کے جو نامناسب اور تنقید کے بغیر ہے۔ مصنّف اپنے دعوے کو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ شفا بخشنے کے جو واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ وقوع میں نہیں آئے ہوں گے ورنہ لوگوں کی ایک کثیر تعداد مسیح کی پیرو ہو جاتی۔ وہ حجت پیش کرتا ہے کہ اگرچہ "سب" یا "بہتیرں" کے شفا پانے کا ذکر ہے مگر تاہم مسیح کے علاوہ شاگرد تھوڑے تھے اس لئے ایسے واقعات کا بیان بطور استعارہ یا تمثیل سے کیا گیا ہے۔ وہ کہتا "ہے کہ یہ سارا قصور خود مسیح کا نہایت آزادانہ طور پر تمثیل کے استعمال کرنے میں ہے۔" ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ سوائے متعصب شخص کے اور کوئی کیونکر اناجیل سے اس قسم کے نتیجے نکال سکتا ہے کیونکہ شفا بخشنے کے بیانات میں ایک موقعہ پر ہم پڑھتے ہیں کہ خود مسیح نے تعجب کیا کہ کیوں اور زیادہ لوگ ایمان نہیں لائے اور پھر اس تنہا شکر گزار کوڑھی کو جو سامری تھا جب اچھا ہونے پر لوٹ کر شکریہ ادا کرنے آیا تو مسیح نے کہا۔ "کیا دسوں پاک صاف نہیں ہوئے؟ پھر وہ نو کہاں ہیں؟ کیا سوا اس پردیسی کے اور نہ نکلے جو لوٹ کر خدا کی تمجید کرتے۔" لوقا ۱۷ : ۱۱ - ۱۹

اس موقعہ پر بھی ہم صفائی سے سمجھ لیں اور صاف دلی کے ساتھ مان لینے کو تیار ہیں کہ مسیحیت کو ثابت کرنے کے لئے مسیح کے معجزات کا سہارا ڈھونڈنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے جیساکہ پیشتر ہوتا رہا ہے اور نہ اُس کی الوہیت کے ثبوت کے لئے ہم ان کے محتاج ہیں۔ مسیحیت کے دعوے کا ثبوت معجزات کے بجائے اور باتوں میں پایا جاتا ہے۔ کیونکہ خود معجزات کا مدار در حقیقت اُن کے واقع ہونے کی گواہی پر ہے جو ہمارے پاس موجود ہے۔ اگر یہ سچ ہیں تو یوں یہ ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں یعنی مسیحیت معجزات کی اور معجزات مسیحیت کی تائید کرتے ہیں تاہم بے دھڑک ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مسیحیت کی خصوصیت ہی ایسی ہے جو معجزات کو قابل یقین بنا دیتی ہے اس سلسلہ میں چند باتیں قابل غور ہیں۔

(۱) مغرب کے انتہا پسند نکتہ چین بھی ہمارے زمانہ میں مسیح کے شفا بخش کاموں کے بیان کو جن میں بدروحوں کا نکالنا بھی شامل ہے سچ ماننے کو تیار ہیں لیکن وہ اُنہیں معجزات نہیں کہتے۔ باقی رہے مسیح کے دوسرے بڑے کام تو سائنس نے قانونِ فطرت کے یکساں ہونے پر اس قدر زور دیا ہے کہ زمانہ حال تک اس قانون کے باقاعدہ عمل میں کسی قسم کی مداخلت کے بیان پر سخت اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہم اُن کو قبول کرنے کے لئے ایسے ثبوت کا مطالبہ کرنے پر مجبور ہیں جو نہایت ہی پکے ہوں۔

(۲) بہر حال یہ دوسرے بہتیرے کام زیادہ صفائی سے ہماری سمجھ میں آجائیں گے۔ اگر ہم یہ معلوم کرلیں کہ فطرت ایک زندہ مرضی کا اظہار ہے اور کہ فطرت کا نظام ہی جو ہمیں نظر آرہا ہے۔ ایک اعلیٰ ہستی کا پتہ بتا رہا ہے کہ جس پر سب کا انحصار ہے۔ اب ہم جو انسان ہیں

مختلف طریقوں سے فطرت پر اپنی مرضی کا اثر ڈالتے ہیں۔ چنانچہ موجودہ سائنس کی کامیابیاں ہمارے باپ دادوں کو حیرت میں ڈال دیتیں تو کیوں نہ خدا جو زندہ مرضی ہے اپنے اعلیٰ مقاصد کے لئے فطرت پر جو آخر کار اُس کی اپنی مرضی کا شکل پذیر اظہار ہے۔ حکمت کے ساتھ آزادانہ طور پر عمل کرے۔

(۳) خداوند مسیح کے معجزات نہ اچنبھے کے کام تھے اور نہ آپ کی قدرت کے محض تماشے تھے۔ بلکہ یہ آپ کی دعاوی کے گواہ اور آپ کی گہری اور بے اندازہ شفقت کے ثبوت اور بڑی روحانی حقیقتوں کی علامتیں تھیں۔ آپ نے کوئی معجزہ اپنی شخصی اغراض کے پورا کرنے کے لئے یا مشککین کو قائل کرانے کے لئے کبھی نہیں کیا اور اگرچہ آپ جانتے تھے کہ جن میں ایمان جڑ پکڑ رہا ہے اُن کے حق میں آپ کے معجزات کے ثبوت کس قدر مفید ہیں تاہم آپ یہ بھی پوری طرح جانتے تھے کہ جہاں ایمان نہیں ہے وہاں معجزات سے کوئی تعلیمی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان موخر الذکر لوگوں کے دلوں میں محض جسمانی فائدہ کے لئے اُن سے ایک جوش اور اشتیاق پیدا ہو جاتا جو لوگوں کی توجہ آپ کی تعلیم سے ہٹا دیتے۔

(۴) اور پھر خداوند مسیح کے معجزات کے ثبوت نہایت زبردست ہیں۔ انجیل کے معجزانہ اور غیر معجزانہ بیانات کے درمیان ایک گہرا تعلق ہے۔ بغیر پورے بیانات کو نقصان پہنچائے کوئی معجزانہ بیان خارج نہیں کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ آپ کے بہتیرے اقوال میں آپ کے معجزات کا اقرار پایا جاتا ہے۔

علاوہ ان کے خداوند مسیح کے معجزات میں سنجیدگی اور وقر پائے

جاتے ہیں اور پھر اس موقعہ پر اُن کے اور اپاکرلیفا اناجیل کے بیانات کے فرق پر ہمیں تعجب ہوتا ہے۔ اِن میں مسیح کا خاکہ اس طرح کھینچا گیا ہے کہ گویا آپ غصّہ ور۔ کینہ ور اور بد اخلاق تھے۔ اب اگر انجیل شریف کے معجزات ظہور میں نہیں آئے تو پھر اس قسم کی مبالغہ آمیز باتوں سے جو اپاکرلیفا میں پائی جاتی ہیں یہ کیوں خالی ہے۔ اگر انجیل نویسوں کے پاس اصل واقعات بیان کرنے کو نہ ہوتے تو وہ ضرور غلطی میں پڑ جاتے۔

لوگوں کی سریع الاعتقادی بھی معجزات کے باعث نہیں ہو سکتی بلکہ تحریری واقعات کی شہادت اس کے خلاف ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ "سب حیران ہو گئے اور خدا کی بڑائی کر کے بولے۔ ہم نے ایسا کبھی نہیں دیکھا" مرقس ۲: ۱۲۔ اور پھر یہ کہ "دنیا کے شروع سے کبھی سننے میں نہیں آیا کہ کسی نے جنم کے اندھے کی آنکھیں کھولی ہوں" یوحنا ۹: ۳۲۔ آپ کے دشمنوں نے کہ جن سے آپ کے معجزات کا انکار بن نہیں پڑا۔ ان کی تاویل میں نامناسب وجوہات اختراع کیں۔

آخر میں ہم یاد رکھیں کہ خداوند مسیح کو تواریخ میں ایک عدیم النظیر جگہ حاصل ہے۔ آپ کی آمد سے ایک نئے دَور کا آغاز ہوتا ہے تو پھر کیا یہ کوئی تعجب کی بات ہے کہ اس قسم کے واقعات کا ظہور آپ کے زمانہ میں ہُوا۔

خُداوند مسیح کا اخلاقی چال چلن

گناہ کے متعلق جو خیال مسیحیوں میں مُدّت سے چلا آرہا ہے اور جس خیال کی بنیاد حوّا کے واقعہ پر ہے کہ جس کا ذکر پیدائش کی کتاب میں

پایا جاتا ہے اس کا استعمال نہ صرف مغرب کے متشککین نے بلکہ احمدیوں نے بھی یہ ثابت کرنے کو کیا ہے کہ خود خداوند مسیح بھی گناہ کی آلائش سے نہ بچ سکے اور اپنے اس دعوے کی تائید میں احمدی مصنف لکھتا ہے کہ مسیح شرابی تھا اور کہ اُس نے اپنی ماں کی توہین کی۔ یہودیوں کو گالیاں دیں۔ اس میں صبر نہیں تھا۔ وہ آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ بدچلن عورتوں کے ساتھ اس کی دوستی تھی۔ وہ آزمائش کے وقت ثابت قدم نہیں رہا مصیبت کے وقت خدا پر سے اُس کا بھروسہ جاتا رہا۔ موسوی شریعت کی حکم عدولی کی۔ اُس نے بہتیرے بے گناہ جانوروں کو ہلاک کیا اور جب اُس پر زیادہ دباؤ ڈالا گیا تو پسح لو ٹ لینے سے جھجکا اور کہ وہ بزدل تھا اور موت سے ڈرتا تھا وغیرہ۔

اس سلسلہ میں ایسے مصنف یہ کہتے ہیں کہ "مسیحیت کی بنیاد" یا "مسیحی مذہب کے کونے کا پتھر" "موروثی گناہ" کی تعلیم ہے۔ تعجب آتا ہے کہ مسلمانوں کو مسیحیت کی کتنی بنیادیں دکھائی گئی ہیں۔ (دیکھیے صفحہ ۳۸۶) ہمیں یہ کب دانش عطا ہوگی کہ ہم قطعی طور پر یہ صفائی سے بتا سکیں کہ "کلیسیا کی ایک ہی بنیاد ہے یعنی یسوع مسیح اسکا خداوند" ہم نے اس تعلیم کا ذکر یہاں اس لئے کیا ہے کہ مسلمان مسیح کی "بے گناہی" کی تردید میں اس کا استعمال کرتے ہیں۔ اب یہ "بے گناہی" ایسا فقرہ ہے کہ ہم خود اس کے استعمال کے عادی ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ فقرہ مسیح کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے کافی نہیں ہے کیونکہ یہ فقرہ سلبی ہے لیکن ہمارا اعتقاد خداوند مسیح کے متعلق ایجابی ہے۔ ہاں ایسا خیال کہ جس کا قدرتی اظہار اُس وقت ہوتا ہے کہ جب ہم اُس

کی پُرزور اور فیاض اور فتح مند محبّت اور وفاداری کا جو اُسے خدا اور انسان کے ساتھ بھی ذکر کرتے ہیں۔ اُس کی زندگی اور سب سے بڑھ کر اُس کی موت میں ظاہر ہوئی۔ جب ہم خداوند مسیح کے متعلق یہ دعوےٰ کرتے ہیں کہ وہ بے گناہ تھے تو آخر اس فقرہ سے ہماری کیا مُراد ہوتی ہے۔ غالباً یہ کہنا صحیح ہے کہ جو اس فقرہ کو استعمال کرتے ہیں تو دو باتوں کا اثر اُن کے ذہن میں موجود ہوتا ہے یعنی موروثی گناہ اور عوضی کفارہ۔ اور ان دونوں کا تقاضا ہے کہ یہ ایمان رکھا جائے کہ خداوند مسیح میں گناہ کرنے کا امکان ہی نہیں تھا یعنی کہ آپ فوق الفطرت طور پر بے گناہ تھے لیکن پھر اس سے یہ بھی ماننا لازم آئے گا کہ نہ صرف آپ کی پیدائش معجزانہ تھی بلکہ آپ کا پیٹ میں پڑنا بھی معجزانہ تھا۔

اب اس سوال کے جواب میں کہ "خداوند مسیح گناہ کی آلائش سے کیسے بچے؟" یہ لوگ جو بنی نوع انسان کے پوری طور پر بگڑ جانے کی تعلیم مانتے ہیں۔ اُن کا جواب ہے کہ "کنواری سے پیدا ہونے ہی کے باعث آپ گناہ کی آلائش سے بری رہے اور اس حیثیت میں بنی نوع انسان سے آپ مختلف ہیں۔ موروثی گناہ کے متعلق ایسا خیال رکھنے والوں کے ذہن میں دو مختلف خیالات کے درمیان گڑبڑی ہے یعنی گناہ کرنے کا امکان اور گناہ بالفعل کوئی بھی کسی کے فعل کو موروثی طور پر حاصل نہیں کر سکتا اور نہ کوئی کسی ایسے فعل کا قصوروار ٹھہر سکتا ہے جو اس سے سرزد نہیں ہوا ہے ہاں گناہ کے امکان کے ساتھ پیدا ہونا یہ اور بات ہے۔

اب جب ہم اس امتیازی فرق کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ تو خداوند مسیح کے فوق الفطرت طریقہ پر گناہ سے بری ہونے کے دعویٰ کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ صرف ماں سے بغیر باپ کے پیدا ہونا بھی گناہ سے اس قسم کی بریت نہیں دے سکتا اور بغیر بے ادبی کے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر خداوند مسیح کو صرف ماں سے پیدا ہونے پر خدا بے گناہی عطا کر سکتا تھا تو ماں باپ دونو سے پیدا ہونے پر بھی آپ کو خدا بے گناہی بخش سکتا تھا۔ بہرحال شوہر کا نہ ہونا خداوند مسیح کی ماں کو بے گناہ نہیں کر دیتا اور اگر ہم یہ نہیں مانتے تو پھر رومن کیتھولک عقیدہ ہمیں ماننا پڑے گا کہ خود مریم مقدسہ موروثی گناہ سے پاک تھیں اور تب یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ضرورت پڑتی ہے کہ مقدسہ مریم کی والدہ بھی موروثی گناہ سے بری ہوں اور پھر آپ کی نانی بھی اور اسی طرح یہ سلسلہ پشت در پشت پوری نسل کو موروثی گناہ سے پاک ٹھہراتا ہوا حوا تک پہنچتا ہے کہ جسے بھی اس صورت میں گناہ سے منزہ ہونا چاہئے۔ لیکن ٹھیک اسی موقعہ پر مسلمان بعض مسیحیوں کے اپنے الفاظ اُن کے خلاف استعمال کرتا اور اصرار کرتا ہے کہ آدم کی برگشتگی کی تعلیم کا اطلاق مقدسہ مریم پر بھی ہونا چاہئے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ تم مسیحی مانتے ہو کہ دُنیا میں گناہ حوا کے ذریعے آیا۔

اب پہلی تین انجیلوں میں خداوند مسیح کے اخلاقی چال چلن کے اس مضمون پر کوئی "تعلیم" نہیں ملتی۔ انجیل نویس نہ تو اپنے بیان کو مؤثر بنانے کے لئے مبالغہ کرتے ہیں اور نہ اُس کے چال چلن کی

تنقید کرتے ہیں اور پھر بھی یہ کہنا سیدھی سادی سچائی ہے کہ ہم کو اُن کے بیانات میں خداوند مسیح کے حق میں کوئی ایسی بات تلاش کرکے بھی نہیں ملتی کہ جسے ہم گناہ کہہ سکیں۔ وہ کسی بہادر کا جلال بیان نہیں کر رہے ہیں یعنی اُن کے کل بیان میں سچائی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اور یہ بیان مسیح کی زندگی کے اصل واقعات سے ہی ماخوذ ہے ہمیں مسیح کا وہ بیان کرتے ہیں وہ غیر مستقل مزاج نہیں ہے اور نہ وہ سریع الحس ہے۔ بلکہ ایک مرد ہے جو صاحب عزم۔ دلیر۔ مستقل۔ مباحثہ میں زود فہم اور سرگرم ہے۔ ظلم کے خلاف غصہ کرنے اور ریاکاروں کی ملامت کرنے میں خوفناک ہے اور پھر بھی اُس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

تاہم دیانت داری ہمیں یہ ماننے پہ مجبور کرتی ہے کہ انجیل کے بیانات میں ایسے واقعات موجود ہیں جو اگرچہ خداوند مسیح کی طرف گناہ منسوب نہیں کرتے تاہم پہلی نظر میں آپ کو بے گناہی سے خارج کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ احمدی ان واقعات سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر خداوند پر اعتراض کرتے ہیں۔ ان میں سے صرف تین خاص واقعات کا ہم یہاں ذکر کریں گے۔

(۱) خداوند مسیح نے بپتسمہ کیوں لیا؟ خود متی کو یہ دقت پیش تھی (مقابلہ کرو مرقس ۱: ۴ و ۹ آیات کا متی ۳: ۱۲-۷ آیات سے) اور یہاں لازمی طور پہ یہ سوال اُٹھتا ہے کہ منجئ جہان نے کیوں ایسی رسم کو پورا کرنا قبول کیا کہ جس کا مطلب اوروں کے حق میں گناہ کا اقرار تھا؟

یاد رہے کہ اس بپتسمہ کا مطلب گنہگاروں کے لئے بھی گناہ کے اقرار سے بڑھ کر کچھ اور بھی تھا اور خداوند مسیح کے حق میں گناہ کے اقرار کے برعکس اس کا مطلب تو کچھ اور ہی تھا یعنی سب کے لئے یہ ایک نئے آغاز، ایک نئی زندگی اور علانیہ طور پر مخصوصیت کا ایک نشان تھا کہ جس وقت سے ایک نئے دَور کی ابتدا ہوتی تھی۔ مگر خداوند مسیح کے لئے اس کا مطلب اس سے بھی بڑھ کر کہیں زیادہ کچھ اور تھا۔ یعنی یہ دَورِ مسیحائی کی معہودہ علامت روح القدس کا نزول تھا اور خداوند مسیح کو اس کا تجربہ ہوا۔ چنانچہ کل انجیل نویس اس کا ذکر کرتے ہیں۔ (مرقس ۱: ۱۰ متی ۳: ۱۶ لوقا ۳: ۲۲ یوحنا ۱: ۳۲) اور پھر یہ کہ اگرچہ اس فعل سے آپ نے بہ حیثیت ابن آدم کے نسل انسانی کے ساتھ اپنے آپ کو ایک نمونہ ظاہر کیا۔ تاہم آپ کا یہ فعل گناہ کے اقرار یا پاکیزگی حاصل کرنے کی غرض سے نہیں تھا۔

(۲) خداوند مسیح کی آزمائشوں کا ہم کیا مطلب نکالیں؟ پہلی تین انجیلوں سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ خداوند مسیح واقعی آزمائے گئے۔ اب ہم سوائے اس کے اور کیا نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ آپ کے آزمائے جانے کی استعداد آپ میں ہو نہیں سکتی تھی اگر آپ میں شکست کا امکان بھی نہ ہوتا۔

ہمارا یقین ہے کہ خداوند مسیح کی جنگ ایک حقیقی جنگ تھی آپ کو اپنی طاقت کا استعمال کر کے آزمائشوں کو شکست دینی پڑی اور کہیں بھی بڑی واضح طور پر اس کا خاکہ نہیں کھینچا گیا ہے

جیساکہ گتسمنی کے باغ میں۔

اب اگر خداوند مسیح واقعی عبرانیوں کے خط کے لکھنے والے کے بیان کے مطابق "ساری باتوں میں ہماری طرح آزمایا گیا تاہم بے گناہ رہا" (عبرانیوں ۴: ۱۵) تو یہ صاف ظاہر ہے کہ آپ کی بے گناہی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ گناہ میں گرنے کی آپ میں استعداد نہیں تھی۔

آپ کی بے گناہی کا کوئی اور تصور آپ کے چال چلن کو اخلاقی پہلو سے بالکل خالی کر دیتا ہے اور علاوہ اس کے جو واقعات اناجیل میں قلمبند ہیں۔ اُن سے کسی اور خیال کی تائید نہیں ہوتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کسی درد یا کسی مزاحمت سے آپ بچائے نہیں گئے لیکن سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ بڑی دلیری سے آپ نے اُن سب پر غلبہ حاصل کیا۔ یہ ایسی بات ہے کہ جس میں ہمیں جو لڑ رہے ہیں مدد ملتی ہے "کیونکہ جس صورت میں اُس نے خود ہی آزمائش کی حالت میں دُکھ اٹھایا تو وہ اُن کی بھی مدد کر سکتا ہے جن کی آزمائش ہوتی ہے۔" (عبرانیوں ۲: ۱۸)

(۳) خداوند مسیح نے یہ کیوں کہا۔ "کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خُدا۔" (مرقس ۱۰: ۱۸ مقابلہ کرو متی ۱۹: ۱۷ لوقا ۱۸: ۱۹)

یہاں بھی ہم پھر دیکھتے ہیں کہ متی گھبرا گیا۔

اگرچہ اس عبارت سے دقت تو پیش آتی ہے لیکن یہ بے دھڑک کہا جا سکتا ہے کہ یہاں کسی قصور کا اعتراف نہیں ہے اور نہ ہی اس میں بے گناہی کا انکار ہے۔ اس واقعہ پر سرسری نظر ڈالتے ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ خداوند مسیح صوبے دار کی چکنی چپڑی تعریف کا نہایت نرمی سے انکار کرتے ہیں لیکن اس میں کچھ اور بھی پایا جاتا

ہے۔ یعنی گویا کہ آپ اس موقعہ پر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ آپ کو معلوم ہے کہ بُرائی کے خلاف ابھی آپ کو اور جنگ کرنی ہے۔ خاتمہ ابھی نہیں ہُوا ہے۔ چنانچہ آپ کی دعائیہ زندگی سے بے شک اس معاملہ پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ آپ کے صحت بخش کاموں سے نہ صرف آپ کے وقت اور طاقت پر ہی دباؤ پڑتا تھا بلکہ آپ کی روح پر بھی۔ اور آپ نے صفائی سے لگاتار دُعا کی ضرورت کو محسوس کیا۔ تاکہ روحانی اعتبار سے اپنے آپ کو ایمان کے عجیب کاموں کے لئے مستعد رکھ سکیں۔ اب یہ کچھ ایسی بات ہے کہ جس کا خُدا میں ہونے کا تصوّر ہی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ خدا تو کامل ہے یعنی ازل سے نیکی درجۂ کمال کو اس میں پہنچی ہوئی ہے۔ لیکن مسیح میں صرف موت کے بعد کمی اور گناہ کا آخری امکان اس کی مقدس زندگی سے مغلوب ہُوا۔ "وہ دکھوں کے ذریعہ سے کامل کیا گیا۔" (عبرانیوں ۲: ۱۰) اور آخری دُکھ صلیب کا دُکھ تھا۔

آخر میں ہمیں غور کرنا چاہئے کہ پہلی تین انجیلوں کے بیانات میں اخلاقی خطا کا احساس مسیح میں بالکل نہیں پایا جاتا۔ آپ معافی کے لئے کبھی دعا نہیں کرتے لیکن اوروں کو معافی مانگنے کے لئے کہتے ہیں۔ آپ خدا سے معافی مانگنے کا بالکل اظہار نہیں کرتے۔ آپ نے کبھی اپنے آپ کو پست نہیں کیا کہ جس کی ضرورت خطا کے احساس سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ ایسی باتیں ہیں کہ جو غیر متعصب ناظرین کے لئے نہایت مؤثر ہیں۔ خداوند مسیح میں یہ اخلاقی صفت آپ کی زندگی کا ایک حقیقی حصہ ہے۔ برعکس اس کے دنیا کے تمام بڑے

بڑے بہادروں میں کمی کا احساس موجود ہے۔ یہاں تک کہ "مقدسین" بھی اپنی نالائقی کو محسوس کرتے ہیں بلکہ اُن میں یہ احساس اور بھی تیز ہوتا ہے۔ لیکن خداوند مسیح نے خدا کے ساتھ لگاتار سلسلہ کو سخت آزمائش کے وقت بھی قائم رکھا۔ یہ کامل آشتی کبھی نہیں بگڑی۔

مختصر یہ کہ اناجیل آپ کے لئے کوئی گناہ قلمبند نہیں کرتے کیونکہ قلمبند کرنے کو کوئی گناہ تھا ہی نہیں۔ خداوند مسیح بغیر گناہ کے تھے لیکن یہ بے گناہی فوق الفطرت نہیں تھی بلکہ اس میں تھی کہ آپ لڑے اور فتحیاب ہوئے۔

دوبارہ جی اُٹھنا

خداوند مسیح کی موت پر مرزا غلام احمد قادیانی کے خیالات کا ذکر ہو چکا ہے اور مولانا محمد علی نے اپنی کتاب محمد اینڈ کرائسٹ میں اس معاملہ میں اپنے آپ کو مرزا کا شاگرد ظاہر کیا ہے۔ لیکن یہ غور طلب بات ہے کہ مرزا صاحب نے جس کام کی آخری وصیت اپنے پیروؤں کو کی تھی۔ مولانا محمد علی اس کا پورا ہو جانا مرزا صاحب کی طرف منسوب کرتے ہیں (دیکھو صفحہ ۱۴۸) چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "آپ نے (مرزا نے) صلیب توڑ ڈالی................. کیونکہ آپ نے اناجیل سے دکھا دیا کہ مسیح صلیب پر فوت نہیں ہوئے جیسا کہ اُنیس سو سال سے عیسائی غلطی سے مانتے چلے آئے ہیں۔ بلکہ زخمی ہو کر بچ نکلنے کے بعد ایک سو بیس سال کی عمر میں

فطری موت سے مرے۔ چنانچہ ایک بیان میں یہ صریحاً قلمبند ہے[1]۔" اور پھر مولانا محمد علی اپنی کتاب مذکورہ کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتے ہیں کہ یہ اُس "خون کے سبب تھا جو صلیب پر بہا" (کلسیوں ۱: ۲۰) کہ نجات حاصل کی گئی۔ اور کہ اگر "مسیح نہیں جی اُٹھا تو ہماری منادی بھی بے فائدہ ہے۔" (۱۔ کرنتھیوں ۱۵: ۱۴) اور اب مصنف کہتا ہے کہ "مسیح صلیب پر نہیں مرا۔ اور نہ مُردوں میں سے جی اُٹھا۔ اِس لئے مسیحی مبلغوں کی مُنادی بے فائدہ ہے اور بے فائدہ ہے اُن کا ایمان بھی۔ مسیحی مذہب نے اپنی بنیاد مسیح کی صلیبی موت اور اُس کے بعد پھر اُس کے جی اُٹھنے پر رکھی ہے لیکن ان دونوں بیانات کا تواریخی شہادت کے زور پر جو خود اناجیل سے ملتی ہے بالکل غلط ثابت کر دیا گیا ہے اور اس بنیاد کے ساتھ ہی بالائی عمارت بھی زمین پر گر پڑتی

---

[1] مولانا محمد علی اس بیان کی تائید میں کوئی سند پیش نہیں کرتے یہاں اس قدر اور بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے روسی سیاح نکولس نوٹوویچ کے من گھڑت فسانہ کا بہت استعمال کیا ہے کہ جو ۱۸۸۷ء میں لداخ گیا اور جس نے اعلان کیا کہ اُسے بدھ کے ایک مندر میں ایک پرانا نسخہ ملا ہے کہ جس میں بیان ہے کہ مسیح نے اپنی جوانی کے دنوں میں ہندوستان کا سفر کیا تھا۔ میکس مولر۔ آگرہ کالج کے پروفیسر جے۔ اے۔ ڈگلس اور ایس۔ پی جی کے پادری احمد شاہ اُن سب نے اس بیان کا شرمناک جھوٹ ہونا ثابت کر دیا ہے۔

ہے۔"

یہ افسوس کی بات ہے کہ یہ مصنف جو بڑی مستعدی کے ساتھ "تواریخی شہادت" کا ذکر کرتا ہے۔ پہلے کرنتھیوں کے پندرھویں باب کے اقتباس پیش کرنے میں پولوس کے بیان کو پوری طرح نقل نہیں کرتا یعنی "اگر مسیح نہیں جی اٹھا.......... تو.................... تم اب تک اپنے گناہوں میں گرفتار ہو" (آیت ۱۷) اور پھر یہ کہ "فی الواقع مسیح مُردوں میں سے جی اٹھا ہے اور جو سو گئے ہیں اُن میں پہلا پھل ہوا" (آیت ۲۰) اور حقیقت تو یہ ہے کہ پولوس اس باب کے ابتدائی حصہ میں اس واقعہ کی "تواریخی شہادت" پیش کرتا ہے اور در حقیقت وہ چار مرتبہ یہ بیان کرتا ہے کہ وہ شخصی طور پر شاگردوں کو ایک اور موقع پر پانچ سو کو دکھائی دیا۔

مولانا محمد علی قرآن کی اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے کہ "نہ اُنہوں نے (یہودیوں) اُن کو قتل کیا اور نہ اُن کو صلیب چڑھایا وغیرہ" سورۃ النساء آیت ۱۵۷ مرزا قادیانی کی تصنیفات سے کئی ایک دلائل اس دعوے کے ساتھ کہ یہ اناجیل کے بیانات سے ماخوذ ہیں پیش کرتے ہیں کہ جن سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ مسیح صلیب پر کفارہ نہیں ہوتے۔ اس قسم کے چودہ دلائل مولانا محمد علی نے پیش کئے ہیں۔ اُن میں سے دو دلائل اُن کے انجیلی اقتباس کی عدم صحت اور اُن کے دلائل کی غلطی کی مثال میں پیش کرنا کافی ہے۔

دلیل نمبر۱۳ ۔ یسُوع مسیح نے اپنے دو شاگردوں کے ساتھ جو اُس کے دونو طرف تھے۔ گلیل کا سفر کیا (؟) جس سے ظاہر ہے کہ وہ پناہ لینے کے لئے بھاگ رہا تھا کیونکہ اگر اُس کا مقصد آسمان پر صعود کرنے کا تھا تو گلیل کو سفر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔"

دلیل نمبر۱۴ ۔ "یسُوع نے تمام رات اپنی گرفتاری سے پیشتر صلیب کی لعنتی موت سے بچنے کے لئے دُعا کی..........

یہ الہٰی قانون ہے کہ مصیبت اور تکلیف کے وقت راست باز کی دُعا ہمیشہ قبول کی جاتی ہے اور ایسا معلوم پڑتا ہے کہ اپنے بچائے جانے کا وعدہ بھی اُسے اپنے آقا سے مل چکا تھا اور جب صلیب پر وہ یہ کہہ کر چلایا کہ اَے میرے خدا۔ اَے میرے خدا تُو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا تو اس کا اشارہ اسی وعدہ کی طرف تھا۔ عبرانیوں کے پانچ باب کی ساتویں آیت سے معاملہ اور بھی صاف ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہاں صفائی سے لکھا ہے کہ اُس کی دُعا قبول ہوئی۔"

مگر عبرانیوں کے خط کا لکھنے والا مسیح کی موت کا ذکر پہلے ہی دوسرے باب کی نو آیت میں کر چکا ہے اور برابر یہ موت اُس کے ذہن میں ہے اور اس لئے اس بات کے ماننے کی معقول وجہ ہے کہ عبرانیوں کے پانچویں باب کی ساتویں آیت کا وہ مطلب ہو نہیں سکتا کہ جس پر قادیانی زور دیتے ہیں بلکہ اُس کا مطلب کچھ اور ہے اور درحقیقت جب ہم انجیلی بیانات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ہم پاتے ہیں کہ آپ کی "التجاؤں میں جو آپ نے گتسمنی

میں " زور زور سے پکار کر اور آنسو بہا بہا کر " اور ایسے پسینہ کے ساتھ کہ " جو گویا خون کی بڑی بڑی بوندیں " تھیں کیں سب سے بڑی درخواست یہ تھی کہ میری مرضی نہیں بلکہ تیری ہی مرضی پوری ہو۔ (متی ۲۶ : ۳۹-۴۲ و ۴۴ + مرقس ۱۴ : ۳۶ و ۳۹ لوقا ۲۲ : ۴۲) اور ہم یہ بھی پاتے ہیں کہ آپ کی یہ درخواست قبول ہوئی یعنی خدا کی مرضی پوری ہوئی اور اُس کی درخواست کا دوسرا حصہ کہ " یہ پیالہ مجھ سے ہٹا لے " اگرچہ " سُنی گئی " قبول نہیں ہوئی۔ کیونکہ اُس نے وہ پیالہ پیا جو عبرانیوں کے لکھنے والے کے الفاظ میں اُس نے " ہر ایک آدمی کے " لئے موت کا مزہ " چکھا ۔ (عبرانیوں ۲ : ۹)

حقیقت تو یہ ہے کہ مسیح کے جی اُٹھنے کا تواریخی ثبوت کہ جسے مغرب کے مشہور علماء مانتے ہیں بہت زبردست ہے۔ ہم یہاں صرف چند خاص باتوں کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱) اناجیل میں خود مسیح کی اپنی پیشین گوئیاں اپنی موت اور جی اُٹھنے کے متعلق نہایت صفائی سے لکھی ہوئی ہیں۔

(۲) مسیح کے شاگرد جو اپنے آقا کی شرمناک موت پر گھبرائے ہوئے اور شکستہ دل تھے یکایک اُن میں تبدیلی کا واقع ہونا ضرور کافی اور معقول وجہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہاں صفائی سے دکھایا گیا ہے کہ جسے ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ مایوسی اُن پر آخر کو غالب نہ ہوئی۔ اور وہ سیکھ گئے کہ صلیب کا مطلب مسیح کے لئے خدا کی سزا کا حکم نہیں تھا بلکہ زندگی اور فتح کے لئے خدا کا مقرر کردہ وسیلہ تھا اور کہ وہ فوراً ہی مسیح اور اُس کی قیامت کا اعلان دلیری سے اُس کے بدخواہوں

کے شہر پناہ یروشلیم میں کرنے لگے۔ اُن کی اس تبدیلی کی صرف ایک ہی معقول وجہ ہے جو خود انہوں نے بتائی ہے کہ اُن کو پورا یقین تھا کہ اُن کا آقا مُردوں میں سے جی اُٹھا ہے اور بے شک اگر اس قسم کا مستقل بھروسہ اُن میں نہ پایا جاتا تو خود مسیحیت کا مستقبل امید افزا نہ ہوتا اور نہ ہی ہو سکتا تھا۔

(۳) پھر پولوس کا مسیحی ہونا کہ جس کی گواہی جو اس واقعۂ قیامت مسیح کے پچیس برس بعد ہی ایک خط میں قلمبند ہوئی اور جس کا حوالہ ہم پیش کر چکے ہیں ایک کافی سبب کا متقاضی ہے۔ یہ کیسے ہوا کہ مسیحیت کا یہ کٹر مخالف کہ جس کا فریسی ذہن ایک مصلوب کے مدعی مسیح ہونے پر ضرور پہلے برانگیختہ ہوا ہوگا۔ ہاں یہ کیسے ہوا کہ وہ یسوع ناصری کا ایک زبردست پیرو بن گیا۔ پولوس خود اس کا جواب دیتا ہے کہ زندہ مسیح اُسے بھی دکھائی دیا۔

(۴) زندہ مسیح کا شاگردوں کو دکھائی دینے کے بیانات کے ساتھ ہی ساتھ خالی قبر بھی آپ کے جی اُٹھنے کا نہایت عجیب ثبوت ہم پہنچاتی ہے اگر شاگردوں کو پورا یقین نہ ہوتا کہ قبر واقعی خالی ہے تو وہ حکام سلطنت کا مقابلہ ذرا بھی بھروسہ کے ساتھ کر نہیں سکتے تھے۔

آخر میں ہمیں پھر یہاں ماننا پڑتا ہے کہ ہم کسی معمولی واقعہ پر بحث نہیں کر رہے ہیں بلکہ انسانی تواریخ کا اہم ترین واقعہ ہماری زیر نظر ہے۔ خداوند مسیح کے کلمات۔ دعاوی۔ وعدوں اور اُمیدوں کے لئے جو اپنی زمینی زندگی کے درمیان کیے اور جن کا یقین دلایا اُن کے

ثبوت کی ضرورت تھی اور یسوع کو مُردوں میں سے زندہ کر کے یہ ثبوت خُدا نے دیا۔ ہمیں خداوند مسیح کی عجیب زندگی کا اور صدیوں کے دوران میں لوگوں کی زندگیوں پر آپ کی فتح کا سبب معلوم کرنے کی ضرورت ہے اور ہمیں اس کا سبب اُس ایمان میں ملتا ہے کہ وہ "زندہ" ہے جو مر گیا تھا۔" اور ابدالآباد رہیگا۔" (مکاشفہ ۱: ۱۸)

چھٹی فصل

ہمارے طریق تبلیغ پر ایک تحقیقی نظر

ہم یسُوع میں خدا کی نجات بخش محبّت کے "گواہ" ہونے کے لئے بلائے گئے ہیں (لوقا ۲۴: ۴۸) اور اسی وجہ سے ہمارا خاص مقصد انجیل کے فوائد میں مسلمانوں کو شریک کرنا ہے لیکن ہمارا یہ کام ایسے مزاج کے سبب نہایت مشکل ہو گیا ہے کہ جس کا ذکر گزرے ابواب میں ہُوا ہے۔

جب دوسرے لوگ انجیل کی بشارت کو خوشی سے سُنتے ہیں تو مسلمان انجیل کے منادوں کو اکثر شک اور بعض اوقات حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ روحانی لاپرواہی ایک ایسا خاصہ ہے جو تمام دنیا کے لوگوں میں پایا جاتا ہے اور جب مسلمانوں میں ہم یہی بات پاتے ہیں تو ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوتا لیکن ان کی پُر استقلال اور سخت مخالفت جو صلیب کے پیغام سے اُن کو ہے ہماری طبیعت کو صدمہ پہنچاتی اور

ہمیں پست ہمت کر دیتی ہے۔
ہم جانتے ہیں کہ اُن لوگوں کے دلوں میں جنہوں نے نئی پیدائش حاصل نہیں کی ہے کچھ ایسی بات موجود ہے جو نجات کے پیغام کے خلاف لڑتی ہے۔ مسلمانوں کی مخالفت کا بڑا سبب بھی یہی ہے۔ لیکن سوال یہ درپیش ہے کہ۔ کیا جس طریقہ سے انجیل ہم اُن لوگوں کو پیش کرتے ہیں اس میں کوئی غلطی ہے یا جو ہمارا طریق تبلیغ ہے وہ ہی غلط ہے۔
پس ہمیں سب سے پہلے اپنے طریقہ پر غور کرنا ہے کون ہم میں ایسا ہے جو مسلمانوں کے ساتھ دوران ملاقات او منادی میں اور کتابوں کے ذریعہ بحث کر کے نہیں تھک گیا ہے۔
آج کل کے محض عقلی دلائل پر زور دینے والے مسلمانوں کے کینہ سے بھرے اور لاپرواہی سے ادا کئے ہوئے بیانات سے ہم بے صبر ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایک طرف پاک اور بے عیب مذہب کے ماننے والے بنتے ہیں اور دوسری طرف کروڑوں راسخ الاعتقاد مسلمانوں کے عزیز ترین اعمال و اعتقادات کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یسوع مسیح کا ذکر ہتک آمیز الفاظ میں کر کے مسیحیت کو بدنام کرنا چاہتے ہیں۔
تاہم ہمارا کام یہی ہے کہ مسلمانوں میں انجیل کی منادی کریں۔ پولوس فرماتے ہیں۔ "مجھ پر افسوس ہے اگر میں انجیل کی منادی نہ کروں۔" اور ہم پولوس کے ساتھ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ "ہر ایمان لانے والے کے لئے انجیل خدا کی قدرت ہے۔" خواہ

یونانی ہو خواہ یہودی مسلمان ہو یا ہندو۔ جب یہ ہمارا اعتقاد ہے تو مسلمانوں کے دلوں تک راہ پانے کے لئے یقیناً ہمارے لئے ممکن ہے کہ کوئی اور زیادہ موثر طریقہ معلوم کر لیں کیونکہ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ آخر کو انسان دل سے ایمان لاتا ہے۔

کوئی طریق تبلیغ ہمارے خیال میں کیوں نہ ہو ہمیں اپنا مقصد نہایت صفائی کے ساتھ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ ہم کس مقصد کی کامیابی کی کوشش میں ہیں۔ اس سوال کی روشنی میں ہم اس بات کا انکار نہیں کر سکتے کہ اب تک مسیحیوں اور مسلمانوں کے درمیانی تعلقات کی چند خاص صورتوں پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ ذرہ دیکھ یہ ہیں:۔

(۱) سب سے پہلے اہم مسئلہ بحث کا اور کتب مناظرہ کا ہے:۔
مسیحیت کے اس طریق تبلیغ پر تمام مسیحی کارگذاروں کا خیال یکساں نہیں ہے۔ بعض بالکل بحث مباحثہ پسند نہیں کرتے۔ بعض جس قدر کم ہو سکے بحث مباحثہ کرتے ہیں۔ بعض اپنی منادی اور تحریروں میں دلیرانہ طور پر بحث مناظرہ کے طریقہ کا استعمال کرتے ہیں تاکہ مسلمانوں کی غلطیوں کی تردید کریں۔

اس تیسری قسم کے لوگ اپنے طریق تبلیغ کی حمایت میں گذرے زمانہ کے ان بڑے لوگوں کے نام شاید پیش کریں یعنی فانڈر۔ عماد الدین۔ والپی، فرنچ۔ لیفرائے۔ راس ادر تسڈل۔ بے شک یہ وہ عظیم الشان ہستیاں تھیں جنہوں نے خدا کی بادشاہت کے لئے بڑے کام کئے ہیں۔ ہم خدا کا شکر ادا کئے بغیر ان کو یاد نہیں کر سکتے۔ ان کی محنتوں نے کئی طرح سے ہمارا کام آسان کر دیا ہے۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس کام کو انہوں نے کرنے کا ارادہ کیا تھا ایک اعلےٰ حد تک وہ کام پورا ہو چکا ہے۔ انہوں نے اسلام کی کمزوریاں اور محمد صاحب کے اخلاقی نقائص ظاہر

کر دیئے ۔ اور کتاب مقدس اور مسیحی تعلیمات پر جو مسلمانوں کے غلط خیالات تھے اُن کا رد کیا ہے ۔ اب ہمارے زمانہ میں اُن کے کام کو دُہرانے کی ایسی ضرورت نہیں ہے جیسے تب تھی۔

جن کے نام اُوپر بیان ہوئے ہیں اُن میں سے ایک نے بڑا عرصہ گزرا یہی خیال پیش کیا تھا ۔ ڈاکٹر عماد الدین جو اپنے وقت کے بڑے مناظرہ کرنے والے تھے ۔ ۱۸۸۵ء میں اپنے پچیس سالہ کاموں کی رپورٹ لکھتے ہُوئے فرماتے ہیں "مسلمانوں کے ساتھ مناظرہ پر کتابیں تصنیف کرتے میں اب وقت صرف کرنا ہمارے لئے فضول ہے ۔ گرے ہُوئے دشمن کے جسم کو کیوں روندیں "تب سے لے کر جتنی مدت گزری ہے اُس سے ظاہر ہے ....

کہ " دشمن " کی حالت کی یہ تشخیص نہیں تھی لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اگرچہ الفاظ مذکورہ کو لکھے ہُوئے پچاس برس کا زمانہ گذر چکا ہے تاہم ایسی کتابوں کا ایک حصہ جنہیں ڈاکٹر عماد الدین نے فضول کہا ہے تب سے اب تک شائع ہو رہی ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو سبق آنے والی نسلوں کو آپ نے سکھانا چاہا تھا اُس نے لوگوں کے دلوں میں جگہ نہیں پائی ہے ۔ درحقیقت اس قسم کی کتابیں اور رسالے جو پُرانے طرز پر لکھی گئی ہیں اب تک ہمارے بُک ڈپو میں موجود ہیں اور تقسیم کی جا رہی ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بدقسمتی سے مسیح کی صلیب کے چند قدیم سپاہی بحث کے طریقے کو برتتے ہُئی جس قدر کام پُورا کرنے کے ارادے سے نکلے تھے اُس سے بھی آگے نکل گئے ہیں ۔ چنانچہ یہ ذیل کی باتوں سے ظاہر ہے ۔

(۱) اپنے اس طریق تبلیغ کے دوران میں جو زور اُنہوں نے عقل

اور "محبت" پر ڈالا ہے۔ اُس کے سبب ایسے نومرید اسلام سے مسیحی کلیسیا میں داخل ہوئے ہیں جو بجائے خدا کے فضل اور اس کی اس نجات بخش محبت کے گواہ ہونے کے جو مسیح میں ظاہر ہوئی ہے وہ اسلام پر مسیحیت کی فوقیت کے ذہنی ثبوت کے حامی ہیں۔ بلا شبہ ہند پاکستان کی کلیسیائی زندگی کے لئے ایسی گواہی کا نہ ملنا ایک معنی میں نقصان ہے۔

(ب) اب اسی طرح بحث کے طریق تبلیغ کے سبب ایسے مسلمان بھی ہیں جو اگرچہ بحث میں شکست کھا چکے ہیں تاہم انہوں نے اپنا ایمان نہیں بدلا ہے۔ ہاں اگر کچھ تبدیلی اُن میں ہوئی ہے تو وہ یہی ہے کہ ان کی طبیعت میں مخالفت اور بڑھ گئی ہے۔ سنا گیا ہے کہ مصر کے چند مسلمان ڈاکٹر اس صاحب کو اُن کے ایک ٹریکٹ کے سبب مار ڈالنا چاہتے تھے۔ اب یہ ایسا معاملہ معلوم پڑتا ہے کہ جس پر ہمیں توقف کرنا اور غور کرنا ہے۔ کیا ایسا طریقہ صحیح ہو سکتا ہے کہ جس کے ذریعہ ہم دلیل تو جیت جاتے ہیں لیکن شخص ہمارے ہاتھ سے جاتا رہتا ہے اور شخص بھی وہ جس کے لئے مسیح مصلوب ہوا۔

(ج) جنہوں نے مسلمانوں اور مسیحیوں کے ترقی پذیر تعلقات کا مطالعہ کیا ہے اُن پر ظاہر ہے کہ حال میں جو مسیحیت کے خلاف ناگوار کتابیں مسلمانوں کی طرف سے شائع ہوئی ہیں اگرچہ سب نہیں تاہم ان کا بڑا حصہ۔ پہلے زمانے کے مسیحی مصنفوں کی اُن کتابوں اور رسالوں سے اشتعال پاکر لکھی گئیں جو انہوں نے اسلام کے خلاف تصنیف کی تھیں۔ صدیوں

سے مسیحیوں نے فقرہ "اسلامی مناظرہ" کا استعمال کیا ہے اور اب مسلمان مسیحیوں کی تقلید میں فقرہ "مسیحی مناظرہ" کا استعمال کر رہے ہیں۔

کیا یہ کام دوسرے مزاج اور مختلف طریقہ سے کرنا ممکن نہیں ہے۔ پولوس کرنتھیوں کے خط میں لکھتے ہیں "ہم مسیح کے ایلچی ہیں۔ گویا ہمارے وسیلے سے خدا التماس کرتا ہے۔ ہم مسیح کی طرف سے منت کرتے ہیں کہ خدا سے میل ملاپ کر لو" (۲۔ کرنتھیوں ۵:۲۰)

یہاں ان الفاظ میں ہم ذمہ واری کا ایسا تصور پاتے ہیں جو ہمیں محض مناظر ہونے سے بچا سکتا ہے۔ یہاں ہمیں یاد دلایا گیا ہے کہ ہمیں ایسا کام کرنا ہے جو مباحثہ سے کہیں اعلیٰ اور کہیں زیادہ ضروری ہے۔

اس سلسلہ میں چند برس پیشتر کا ایک دلچسپ واقعہ یاد پڑتا ہے کہ جب مصر کے مسیحی کارگزاروں کی ایک جماعت چند ایسے اصولوں پر متفق ہوئی کہ جس کے مطابق مسلمانوں کے درمیان وہ کام کریں اور جن اصول پر اُن کے لئے کتابیں و رسالے لکھ کر ان میں تقسیم کریں وہ اصول مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) ان مباحثہ و مناظرہ کی کتابوں و رسالوں کی اشاعت بند کر دینا جو مسلمانوں کے لئے رکاوٹ کا باعث ہیں اور جن سے اُن کو بے فائدہ رنج پہنچتا ہے۔

(۲) مسلمانوں کے لئے صرف ایسی کتابیں اور رسالے لکھنا اور استعمال کرنا جو لوگوں کو مسیحیت سے واقفیت بخشیں اور اُن کو قائل کریں یعنی جن کتابوں کے ذریعہ مسیحیت ایسا مذہب پیش کرے

جس کے مطابق زندگی بسر کرنا خُدا کو پسندیدہ ہو۔
(۳) نہ تو محمد صاحب کا ذکر کرنا اور نہ اُن کے چال چلن کے نقائص کو بیان کرنا۔
(۴) منادی کرتے وقت ان اصول کا لحاظ رکھنا۔
(۲) ہم دیکھ چکے ہیں کہ کلیسیا کی بعض روایتی تعلیمات ایسی ہیں کہ جنہیں مسلمان ناپسند کرتے ہیں یہ تو صریحاً ظاہر ہے کہ وہ ان تعلیمات کو بالکل نہیں سمجھتے اور جب موقعہ ملتا ہے تو اُن کی بزور تردید کرتے ہیں مثلاً انہیں ہمارے اس کلام سے سخت نفرت ہے کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے۔
جب حالت یہ ہے تو جاہل اور متعصب لوگوں کی جماعت میں منادی کے دوران میں بغیر تشریح اور بغیر ضرورت ایسے بھڑکانے والے فقرے کا استعمال کرنا فضول سے بھی بدتر ہی نہیں بلکہ غلط ہے۔
ہمارے خداوند کا کیا مطلب تھا جب کہ آپ نے فرمایا۔ پاک چیز کُتّوں کو نہ دو اور اپنے موتی سوروں کے آگے نہ ڈالو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اُنہیں پاؤں کے نیچے روندیں اور پلٹ کر تمہیں پھاڑیں۔ (متی ۷: ۶) خداوند لوگوں کو کتے اور سؤر کے نام سے نہیں پکار رہے ہیں بلکہ خداوند کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم خُدا کی گہری باتیں متعصب لوگوں اور اُن سے جن کے دل تیار نہیں ہیں کہتے رہیں تو یہ بے وقوفی ہے اور اس طرح ان تعلیمات کو پیش کرتے ہیں جو اُن کی سمجھ سے باہر ہیں تو ہم مسیح کی صلیب کے دشمنوں کو کفر بکنے کا موقعہ دیتے ہیں۔
فی الحال جو کچھ کہنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ متعصب مسلمانوں

کو خداوند کے متعلق کسی "تعلیم" کو سنانے یا اُن کو اُس کے منوانے سے کہیں بڑھ کر ضروری کام مسیح کے لئے ہمیں کرنا ہے۔

(۳) اب ہمیں اپنے مقصد پر یعنی جس غرض سے ہم مسلمانوں کے پاس پیغام لے کر جاتے ہیں اور اپنے شخصی چال چلن پر غور کرنا رہ گیا ہے۔ چاہئے کہ ہمارا مقصد شبہ سے بری اور ہمارا چال چلن ملامت سے پاک ہو۔ بزرگ ہنری مارٹین نے قریب ایک سو چھپیس ۱۲۵ برس پیشتر دانا پور ضلع پٹنہ سے یہ الفاظ لکھے ہیں۔

"مسلمانوں کے سامنے دلیل پیش کرنے میں سب سے بڑھ کر سنجیدگی کی سخت ضرورت ہے کیونکہ اس کے بغیر بڑے سے بڑا ثبوت بھی وہ ہنس کر اڑا دیتے ہیں۔ لوگوں کو نو مرید بنانے کی سرگرمی ان میں پائی جاتی ہے اور عام طور پر اس سرگرمی کا وہ غلط مقصد سمجھتے ہیں لیکن ان کی روحوں کے لئے محبت کے ساتھ فکرمندی کا اظہار کرنا بلاشبہ اُن کے لئے نئی بات ہے اور اس سے اسی قسم کی سنجیدگی اُن کے دماغوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔

یقیناً جس طرح یہ الفاظ تب سچ تھے اسی طرح اب بھی ہیں۔ پس کتنی سخت ذمہ واری ہمارے اوپر ہے۔ ہماری غرض اور ہمارا مقصد ہمیشہ یہ ہونا چاہئے کہ خدا کی مدد سے اُن لوگوں کے دلوں کو ہم چھوئیں۔ اُن کے ضمیر کو ہم متاثر کریں اور یسوع مسیح کے منجی ہونے کی شخصی پہچان تک ان کو لے جائیں۔ اب اگر ہم چاہتے ہیں کہ مسلمان تعظیم کے ساتھ ہماری باتوں کو سنیں تو ہمیں سنجیدگی کے علاوہ علم کی بھی ضرورت ہے۔ اُن کے دین و ایمان کی زیادہ ضروری باتوں

کا ہمیں علم ہو اور اُن کی تواریخ سے ہم واقف ہوں یہ اس لئے اور بھی ضروری ہے کہ ہم اس قسم کی غلطیاں کرنے سے باز رہیں جو مسلمانوں کو ناگوار لگتی ہیں۔ ٹھیک جس طرح جب مسیحی مذہب کو مسلمان صحیح طور پر نہیں سمجھتے اور حقیقت کو بگاڑتے ہیں تو اندیشہ ہے کہ ہمیں برا لگے۔

ہمیں چاہئے کہ حلیمی۔ انکساری اور صبر کی خوبیوں کو مسلمانوں کے ساتھ پیش آنے میں برتیں۔ یہ سچ ہے کہ یہ خوبیاں صرف مسیحیوں ہی میں نہیں پائی جاتی ہیں تاہم لوگوں کا حق ہے کہ اگر اوروں میں نہیں تو یسوع مسیح کے ایلچیوں میں ضرور ان خوبیوں کی توقع رکھیں ان خوبیوں کی ہمیں اور بھی زیادہ ضرورت ہے کیونکہ ایسا وقت بھی آتا ہے کہ جب ہمارے مزاج کی سخت جانچ ہوتی ہے۔ بشپ لیفرائے مسلمانوں کے ساتھ برتاؤ میں اپنی نیک طبیعت کے لئے جو ہمیشہ اُن میں پائی جاتی تھی اور اپنے اس یقین کے لئے مشہور تھے کہ مسیحیوں کو مسلمانوں کے ساتھ غیر طرفدار انصاف پسند طبیعت رکھنا ایسی بات ہے کہ جس کے بغیر اور سب فضول ہے۔ پھر بھی ایک ایسی پاک زندگی سے بڑھ کر جو مسلمانوں کے درمیان اور اُن کے سامنے بسر کی جائے اور کوئی چیز اُن کے لئے زیادہ مؤثر نہیں ہے۔ ایسی زندگی بسر کرنے کی عادت ڈالنا صرف اس لئے ضروری نہیں ہے کہ جس انجیل کی ہم منادی کرتے ہیں اُسے لوگوں میں پیش کرسکیں۔ بلکہ اس لئے بھی کہ ہم اپنے ایمان اور صبر۔ ہمدردی اور محبت کی جانچ سہہ سکیں۔

بلور لیٹن انگلستان کا مشہور ناول نویس اپنی کتاب "شہر پومپئی کے آخری ایام" میں ایک سرگرم مبشّر کے بارے میں لکھتے ہوئے یوں کہتا ہے۔ "جو برداشت کر سکتے ہیں۔ وہی لوگوں کی زندگیوں کو تبدیل کرنے کے لائق ہیں" اسی طرح ہنری مارٹن بھی ملک ایران کے شیراز کے اپنے تجربوں کو اپنے روزنامچہ میں لکھتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "مولویوں کی حقارت اور ٹھٹھے کی برداشت اُن پتھروں سے زیادہ مشکل ہے جو لڑکے اکثر مجھ پر پھینکتے ہیں۔"

لیکن ایسی پاک زندگی تب ہی ممکن ہے جب ہماری اپنی زندگیوں میں مذہب کا حقیقی تجربہ ہو۔ خدا کو جاننا۔ اُس کی طاقت اور حضوری سے آگاہ رہنا۔ اُس سے باتیں کرنا اور یہ محسوس کرنا کہ اُس نے ہم سے بات کی ہے۔ مسیح کو اور اُس کی دوستی کی مٹھاس کو جاننا۔ شخصی نجات میں شادمان ہونا اور اپنے دلوں میں خدا کے اطمینان اور خوشی کا تجربہ کرنا یہ وہ باتیں ہیں کہ مسلمانوں میں واقعی مؤثر طور پر خدمت کرنے کے لئے بالکل لازمی ہیں۔

وہ مرد اور عورت جسے یہ تجربہ حاصل نہیں ہے یا جس کے لئے یہ باتیں حقیقی نہیں ہیں یا جس کے لئے مسیح کی نجات بخش اور مجبور کرنے والی محبت ہی لوگوں سے کہنے کی سب سے بڑی چیز زندگی میں نہیں ہے تو ایسے شخص کے لئے بہتر ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ مذہبی بحث نہ کرے۔ مبادا شرم اور ندامت اُن کے ہاتھوں اُسے اُٹھانا پڑے

ساتویں فصل

ہمارا سب سے بڑا کام

اور اب آخر میں جب کہ اس مسلمان قوم کا ذکر ہمارے ذہن میں تازہ ہے سبھوں سے جن کا اس سے تعلق ہے ہماری درخواست ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ معمولی دوستی پیدا کرنے کی ہی کوشش کریں۔
ہم اُن میں منادی کرتے ہیں اُن کو تعلیم دیتے ہیں۔ اُن کے لئے کتابیں لکھتے ہیں۔ اُن کے ساتھ مناظرہ کرتے ہیں۔ ہم اُن کی اور اُن کے دین و ایمان کی نکتہ چینی کرتے ہیں اور بے شک یہ سارے کام اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک ہیں لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم اکثر اس نہایت ہی قیمتی شے کو جس کا دینا ہماری طاقت میں ہے ہم انہیں نہیں دیتے یعنی اپنی دوستی۔

مسیحی مذہب اگر صحیح طور پر سمجھا جائے تو اس کا مطلب ایک اعلےٰ دوستی پیدا کرنا ہے یعنی خداوند مسیح کے ساتھ دوستی رکھنا اور اس بات کا صاف اظہار کہ اس مذہب کو ہم نے اپنا کر لیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب ہم اُس بڑے حقیقی دوست کی ملاقات اُن لوگوں سے کرانے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ روح ہم میں پائی جانی چاہئے کیونکہ وہ ہم میں بھی اپنی خوبیوں سمیت موجود ہے۔
اب اگر اس دوستی کے پیدا کرنے کے لئے ہمیں اور کسی

تحریک کی ضرورت ہے تو یاد رکھنا چاہئے کہ مسلمان حقیقت میں ایک پرانی اور سخت بھول کے شکار ہیں۔ یہ بڑی غلطی محمد صاحب کے وفات کی غلطی ہے۔ جس کا سب سے افسوس ناک نتیجہ یہ ہے کہ مسیح مصلوب میں وہ کوئی ایسی خوبصورتی نہیں دیکھتے کہ جس کے سبب وہ آپ کے مشتاق ہوں۔

علاوہ اس کے اگر ہم چاہتے ہیں کہ مسلمان ہمارے ساتھ زیادہ دوستانہ برتاؤ کریں تو یہ ضرور ہے کہ ہم خود اپنے آپ کو اُن کا دوست بنائیں اور اس معاملہ میں موجودہ صورت حال خواہ کچھ ہی ہو ہم پیروانِ مسیح کو چاہئے کہ خود پہلے دوستی اُن سے شروع کریں۔ بہتیرے دلائل اس بات کی تائید میں پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن کیا یہ یاد رکھنا کافی نہیں ہے کہ سب کچھ ہمیں اپنے خداوند ہی سے ملا ہے کہ جس نے ہم سے محبّت رکھی اور اپنے آپ کو ہماری خاطر موت کے حوالے کر دیا۔

اس مقصد کو مدِّ نظر رکھ کر سب سے اعلےٰ چیز جو ہمارے پاس ہے اُس میں مسلمانوں کو شریک کرنا چاہئے۔ ہم ذیل کے چند مستحسن اور مقبول طریقوں پر غور کریں۔

(۱) اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ مسیحی ان سپاہیوں کی مانند ہیں جو ایسی توپوں سے دشمن کا مقابلہ کر رہے ہیں جن سے دور تک گولہ باری کی جاتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کے قریب نہیں ہوتے ہیں اور نہ اُن کے ساتھ واقفیت پیدا کر سکتے ہیں۔

جن سے ہم ملاقات کرنا چاہیں اُن کے ناموں کی فہرست تیار کر لینا کوئی مشکل نہیں ۔ پھر چاہیئے کہ وقتاً فوقتاً اُن سے ملاقات کیا کریں اور اُن ملاقاتوں میں صرف امیر اور تعلیم یافتہ لوگ ہی نہ ہوں بلکہ جاہل اور غریب بھی ہوں ۔ اگر خاص موقعوں پر اُن کے معاملات میں ہم دلچسپی لیں ۔ مثلاً اُن کے بچوں اور اُن کی تعلیم میں۔ اُن کی بیماری اور شادی میں تو شاید ہی کوئی اُن میں ایسا ہو گا جو بُرا مانے ۔ اُن میں بعض ایسے ہوں گے جو معمولی باتوں میں آپ کی مدد مانگیں گے یعنی اُن کو نوکری دلا دینا ۔ اُن کے بچوں کو اسکول یا کالج میں داخل کرا دینا ۔ اُن کی طرف سے زمینداروں یا میونسپلٹی کے حکام سے ملنا بے شک ایسے کاموں میں وقت لگتا ہے لیکن ان سے بہت مفید نتیجے نکلتے ہیں ۔ ان ایسے معمولی اور بے دریغ مہربانی کے کاموں کے ذریعے سمجھ ہمدردی اور دوستی کے پُل بنتے ہیں ۔

اور جب مسلمان ہم سے ملاقات کرنے آئیں تو اُن سے ملنے کے لئے ہم کو کافی وقت نکال لینا چاہیئے کسی کو یہ معلوم نہ پڑے کہ اُس کا آنا ہمارے لئے بے جا مداخلت کا باعث ہے اگر ہم اُس وقت ایسے مشغول ہوں کہ لمبی گفتگو کرنا ممکن نہ ہو تو کوئی اور دن اور وقت مقرر کریں اور وقت مقررہ پر اُن سے ضرور ملیں ۔

(۲) مسلمان بڑے غور کرنے والے ہیں اور مسیحی کی مذہبی زندگی کی پرستشانی کو جلد پہچان لیتے ہیں ۔ اس لئے چاہیئے کہ مسیحی کا گھر ایسی جگہ ہو جہاں دُعا ہوا کرتی ہے ۔ کسی مسلمان کو تعجب نہ ہو گا نہ بُرا لگے گا ۔ اگر اسے ہمارے خاندانی دُعا کے وقت ٹھہرنے دینے

کو کہا جائے بلکہ اگر اُسے معلوم ہو کہ ہمارے یہاں خاندانی دُعا نہیں ہوتی ہے تو اُسے حیرت ہوگی۔

اگر کبھی ایسا اتفاق ہو کہ کوئی دین دار مسلمان مرد یا عورت سچے دل سے ہم سے دُعا کی درخواست کرے تو اُسے ہم خاص شرف سمجھیں۔ مصنف ہذا سے ایک ساٹھ برس کے ضعیف مسلمان نے ایسی درخواست کی۔ اُس نے انجیلوں کا مطالعہ کیا تھا اور اُس کے دل میں راہِ حق اور زندگی کے متعلق ایک نئی فکر اور کچھ شک پیدا ہوا۔ اُس نے نہایت سنجیدہ اور پُردرد آواز میں درخواست کی کہ میرے لئے دعا کیجئے خدا سے میرے لئے دُعا کیجئے میں بوڑھا ہوں اور زیادہ مدت تک نہ جیوں گا اور میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ خدا کے راستہ کا مجھے یقین ہو جائے۔ کچھ عرصہ بعد جب وہ زندگی کی آخری بیماری کے بستر پر پڑا تھا تو مجھے اُس کی اس خدمت کرنے کا موقعہ بار بار ملا۔

اب اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمارے سامنے ایک کام لیکن یہ انمول قیمت کا کام ہے جو ہم مسلمانوں کے لئے کر سکتے ہیں جب کوئی ترقی نظر نہ آئے۔ جب لوگوں کے دل سخت۔ دماغ سست اور مرضی برخلاف ہو تو ہم اپنا بوجھ اور اُن کا بوجھ بھی دُعا میں خدا کے پاس لے جائیں۔ اگر کبھی کوئی ایسا کام ہے کہ جس کے لئے لگاتار دُعا کی ضرورت ہے تو وہ یہی ہے یعنی صبر اور اُمید کے ساتھ مسلمانوں میں مسیح کو پیش کرنا۔ کسی نے اس کے متعلق سچ کہا ہے ہم اپنے گھٹنوں یعنی دعا کے وسیلے زیادہ ترقی کرینگے۔

(۳) مسلمانوں کے ساتھ گفتگو میں معمولی باتوں کو رُوحانی باتوں کا ذریعہ بنانے کے ہر موقعہ سے فائدہ اٹھانا مناسب ہے بہتیرے مسلمان گفتگو کی اس تبدیلی کو پسند کریں گے اور بخوشی اس میں شریک ہوں گے۔ ایک مرتبہ ریل گاڑی کے ایک ڈبے میں دو مسلمان اور ایک مسیحی مشنری سفر کر رہے تھے۔ اُن دو مسلمانوں میں جو ضعیف اور سرگرم اور ذی حیثیت آدمی معلوم ہوتا تھا اُس نے مشنری کے ساتھ انجیل کی اصلیت پر بحث چھیڑنی چاہی۔ مشنری نے جواب دیا کہ چونکہ ہم اجنبی ہیں اس لئے میرے خیال میں ایسی بحث سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا اور بجائے اس کے اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں قرآن سے پڑھ کر سناؤں کہ گناہ گاروں کی نسبت خدا کا کیا خیال ہے۔ سورہ ابراہیم کی دوسری رکوع میں لکھا ہے۔ کیا خدا کے بارے میں کسی طرح کا شک ہو سکتا ہے۔ وہ آسمان و زمین کا خالق ہے اور وہ تمہیں بلاتا ہے کہ تمہارے گناہوں کو بخش دے۔

دوران گفتگو میں مشنری نے بتایا کہ کس طرح لوگ خدا کی پکار کی طرف کان نہیں لگاتے اور گناہ کرتے جاتے ہیں اور اُس کی رحمت کا انکار کرتے رہتے ہیں اور کس طرح یسوع مسیح نے خدا باپ کے خیال کو جو گناہ گاروں کے لئے ہے صاف طور پر ظاہر کیا یعنی کہ خدا کے دل میں افسوس ہے کہ لوگ اپنے گناہوں کو چھوڑ کر اُس کی معافی قبول نہیں کرتے۔

ان سیدھے سادھے الفاظ کا جو دوستانہ طبیعت میں ادا

کئے گئے تھے۔ اس ضعیف مغرور دماغ شخص پر بڑا اثر ہوا۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور تھوڑی دیر تک وہ کچھ نہ بول سکا اور تب اپنے ساتھی کی طرف مخاطب ہو کر اُس نے کہا۔ "یہ سچ ہے۔ پادری صاحب نے درست فرمایا ہے ایسی باتیں ہم بھول جاتے ہیں"۔

یہ مسیحی اپنی گفتگو محض بحثی باتوں سے زیادہ بلند کر کے اُس شخص کے قلب کی رفاقت کو متاثر کر سکا۔ جب اس قسم کی گفتگو کے خاتمہ میں آپ کا مسلمان دوست کہے کہ اس قسم کی باتوں سے فائدہ ہوا تو یقین رکھئے کہ آپ کی گفتگو سے کچھ نہ کچھ حاصل ہوا ہے۔

(۴) مسلمانوں کے لئے کتابوں اور رسالوں کے انتخاب میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اور بڑے امتیاز کے ساتھ اُن کو تقسیم کرنا چاہئے۔ ہر کتاب اور رسالے کے مضمون کو تقسیم سے پیشتر پڑھ لینے کا اصول قائم کر لینا ایک اچھا دستور ہے۔ دانا طبیب مریض کی شکایت کی پہلے ہوشیاری کے ساتھ تشخیص کر لیتا ہے اور تب مرض کے مطابق جو علاج درست سمجھتا ہے ویسا فیصلہ کرتا ہے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ مسلمانوں کے لئے جو کتابیں اور رسالے پائے جاتے ہیں اُن میں سے بعضوں کی خوراک نہایت بیتر ہے اور اگر اُن میں سے بعض لاپرواہی سے استعمال کی جائیں تو اندیشہ ہے کہ اُن کے دل میں بجائے تبدیلی پیدا کرنے کے اُن کی طبیعت میں اشتعال پیدا کر دیں۔

آج کل جس قسم کی کتب و رسائل نکل رہے ہیں اُن میں

ایک خوشگوار تبدیلی پائی جاتی ہے بعضوں سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ کو سمجھنے اور ان کی مشکلات کو حل کرنے کی دلی کوشش کی جا رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایسے فقروں کا استعمال جو اُن کے احساس کو برانگیختہ کرے ترک کیا جا رہا ہے۔

لیکن واقعی کوئی کتاب بائبل کی اور خصوصاً نئے عہد نامہ کی جگہ نہیں لے سکتی۔ لیکن جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں بہتیرے مسلمان بائبل کو تعصّب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس لئے ان نئی قسم کی کتابوں اور رسالوں کے ذریعہ ہمارا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ اُن کو بائبل پڑھنے کی طرف راغب کریں۔ خوش قسمتی سے اب ایسے مسلمانوں کی تعداد پیشتر سے زیادہ ہے جو بائبل پڑھنا پسند کرتے ہیں۔

(۵) جن لوگوں کو پیغام پہنچایا گیا ہے اُن کا پیچھا کئے جانا نہایت ہی ضروری ہے۔ اسے فراموش نہ کرنا چاہئے کہ جن پر کچھ اثر ہو چکا ہے اُن پر کوششیں مسیح پاس لانے میں برابر جاری رہیں۔ اُنکے دل کا دروازہ ہماری طرف کچھ کھل گیا ہے۔ اب خدا کے نام میں ہم اندر داخل ہونے کی کوشش کریں۔ اس مقصد کے لئے اپنی طاقتوں کو بہت لوگوں پر منتشر کر دینے کی بجائے ہم اپنا دھیان چند محدود لوگوں پر لگا دیں۔

(۶) ہم نے ایسے کام میں ہاتھ لگایا ہے کہ جس میں ہماری ساری طاقتوں کی ضرورت ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اپنا تمام علم ساری دانائی کل تدابیر اپنا جوش اور اپنا پورا زور۔ اپنی دعائیں۔ اپنی سرگرمی اور اپنی محبّت اس بڑے مقصد پہ لگا دیں کہ مسلمانوں میں مسیح ان حیثیوں

میں پیش کیا جائے کہ وہ گناہ گاروں کا دوست مسیح مصلوب جو مُردوں سے جی اٹھا۔ زندہ خداوند۔ خدا تک پہنچانے والا راستہ ہے یقیناً آج کل ہر مناد اور مسلمانوں میں کام کرنے والے کا یہی سب سے بڑا کام ہے اور اس کے لئے ہمیں خود اپنے آپ کو مخصوص کرنا ہے ہنری مارٹین کے وقت سے لے کر آج تک کئی مشنری صاحبان جنہوں نے مسلمانوں میں خدمت کی ہے اُن کو پورا یقین ہے کہ یہ بڑا کام صحیح طور پر صرف وہ چلا سکتے ہیں جو اگر ضرورت پڑے تو جان تک دینے کو تیار رہوں۔

(۷) آخر میں جب ہم ان طریقوں پر سوچتے ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے تو ایک اور بھی سب سے عمدہ طریقہ ہمارے ذہن میں آتا ہے جس کے ساتھ کامیابی کا یقین بھی شامل ہے اور وہ یہ ہے کہ میں اگر زمین سے اونچے پر چڑھایا جاؤں گا تو سب کو اپنے پاس کھینچونگا (یوحنا ۱۲: ۳۲) اس وعدہ میں مسلمان بھی شامل ہیں۔

مصنف ہذا جب مسیحیوں اور مسلمانوں کے گذرے تعلقات کے بیان کو سوچتا ہے تو ایسا معلوم پڑتا ہے جیسے میدانِ جنگ کے استعارے میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے مورچوں پر قبضہ کر لینے کی بار بار کوشش کی ہے لیکن ان کو ان کوششوں میں کامیابی کم ہوئی ہے اور مسلمانوں نے اپنے لئے اور بھی گہرے خندق کھود لئے ہیں۔

لیکن جنگی تدابیر میں ایک اور مشہور اور مؤثر طریقہ ہے یعنی دشمن کو اُس کے اپنے مورچہ سے باہر لبھا کر کھینچ لینا ہے۔ ہمارے خداوند

کے الفاظ مذکورہ سے اس قسم کے طریقہ کا خیال نکلتا ہے یہ وہ طریقہ ہے کہ جس کے ذریعہ ہم اپنے آپ کو نہیں اور نہ اپنے دلائل کو بلکہ خداوند کو لوگوں کی توجہ کا مرکز عظیم بنا دیتے ہیں "میں اگر اونچے پر چڑھایا جاؤں تو سب کو اپنے پاس کھینچوں گا۔" ہمیں چاہئے کہ ہم اس طریقہ کے مطالعہ اور استعمال کرنے میں اپنے آپ کو زیادہ مضبوط بنائیں۔

یہاں یہ ضروری ہے کہ مسیح کے الفاظ کے پورے معانی پر زور دیں کہ جس کا مطلب خود شاگرد بہ آسانی نہ سمجھ سکے اور جو کچھ جائز مطلب ان الفاظ کا نکالیں ان میں یقیناً یہ بات پائی جائے گی کہ ہمیں "مسیح مصلوب" کو پیش کرنا ہے۔ یہ اس لئے اور بھی زیادہ اہم ہے ہم یاد رکھیں کہ جس طرح یہودی کے لئے اُسی طرح مسلمان کے لئے صلیب ٹھوکر اور بے وقوفی ہے اور مسلمان اسے اپنی راہ سے ہٹانے کی حتیٰ المقدور کوشش کرتا ہے۔ اب چونکہ ہمیں ان میں سے بعضوں کے خیال معلوم ہیں اس لئے اب وقت ہے کہ ہم اُس بات کا عزم بالجزم کرلیں کہ جس طرح پولوس نے کرنتھیوں کے لئے کہا تھا ہم بھی مسلمانوں کے درمیان "یسوع بلکہ یسوع مسیح مصلوب کے سوا اور کچھ نہ جانیں گے"۔

اگر یہ سچ ہے کہ انجیل خوشی کا اور سارے آدمیوں میں رضامندی کا پیغام ہے تو یہ بھی درست ہے کہ یہ اعلان کرتی ہے کہ فتح کا راستہ صلیب ہی کے ذریعہ ہے اور کثرت کی زندگی موت کے وسیلہ ملتی ہے اور یہ حقیقت بھی مسلمانوں کے لئے ٹھوکر ہے۔ پس مسلمانوں کے

درمیان ہمارا یہ کام ہے۔ " اُن کے آنکھوں ہی کے سامنے یسُوع مسیح کو مصلوب دکھانا" (گلتیوں ۳: ۱)

یہ ہمارا ایمان ہے اور اگر ہم اپنا کام وفاداری کے ساتھ کرینگے تو یہ ہمارا بھروسہ بھی ہے کہ زندہ مسیح اپنی لاثانی محبّت اور طاقت کے ذریعہ اُن لوگوں کو اپنے پاس کھینچے گا۔

ہاں ہم اپنی منادی اور اپنی تحریر کے ذریعہ مسیح کو بلند کر سکتے ہیں لیکن سب سے بڑھ کر اپنی زندگیوں کے ذریعہ یعنی اپنی طبیعت میں مسیح کی مانند ہو کر۔ اس لئے یہ نہایت ہی اہم معاملہ ہے کہ ہم اس بات میں ناکامیاب نہ رہیں۔

کسی نے مسلمانوں میں انجیل کی بشارت کے کام کو اس طرح بیان کیا ہے۔ " یہ کوشش اس قسم کی ہے کہ دنیا کے سب سے زیادہ مغرور شخص کو ایسے شخص کے وسیلہ کہ جسے وہ حقیر سمجھتا ہے ایسی چیز قبول کرنے کے لئے پیش کی جائے کہ جس سے اُسے نفرت ہے۔" اس کا جواب ہم یہ دیتے ہیں کہ فخر صرف مسلمانوں کا خاصہ نہیں ہے بلکہ یہ سارے بنی نوع انسان میں پایا جاتا ہے۔ خدا کے فضل نے جو کچھ مغرور سے مغرور مغربی اشخاص کے لئے کیا ہے وہ مسلمانوں کے لئے بھی کر سکتا ہے اور کر رہا ہے۔ پھر اس کی یہ نفرت ایسی چیز سے ہے کہ جسے وہ سمجھا نہیں ہے کیونکہ وہ غلط فہمی اور مغالطہ کا شکار رہے۔ اس لئے اب ہمارا کام یہ ہے کہ اُس کی مدد کریں کہ وہ خُدا کے جلال کی پہچان کا نور جو یسُوع مسیح کے چہرے میں ہے دیکھ لے اور پھر دُنیا بھر میں کون ایسا مسلمان ہے جو حقیقی مسیحی مرد یا عورت کو حقیر سمجھتا ہے۔

یہ سوال ہمارے سامنے اس سب سے بڑی ضرورت کو پیش کرتا ہے کہ اپنے آقا کا مزاج اپنے اندر پیدا کریں۔ پروفیسر ہنری ڈرمنڈ جنہوں نے زور دیا ہے کہ سچے مسیحی کو چاہئے کہ ہر روز پہلے کرنتھیوں کے تیرھویں باب پر جو پولوس کی نظم "محبت" کہلاتی ہے دھیان کیا کرے۔ آپ کی ایک کتاب "تبدیل شدہ زندگی" میں ایک قابل یادعبادت پائی جاتی ہے۔ جو خاص طور سے یہاں درست بیٹھتی ہے

"مسیح کی مانند بن جانا صرف یہی چیز پیدا کرنے کے لائق دنیا میں ہے۔ یہ ایسی چیز ہے کہ جس کے آگے انسان کا حوصلہ بے وقوفی ہے اور اس سے تمام ادنیٰ چیزوں کا حصول فضول ہے۔" پھر اپنے اسی خیال کو وسعت دیتے ہوئے فرماتے ہیں کسی کے دیکھتے رہنے سے ہم بدلتے جاتے ہیں۔ جن کی ہم قدر کرتے رہتے ہیں ہم اُن کی مانند بن جاتے ہیں کیونکہ یہی بڑا قانون اثر ہے۔

آپ کہتے ہیں کہ چند مرد اور چند عورتیں ایسی ہیں کہ جن کی صحبت میں ہم ہمیشہ اچھے بن جاتے ہیں۔ جب ہم اُن کے ساتھ ہوتے ہیں دل میں کمینے خیالات نہیں سوچ سکتے نہ ادنیٰ باتیں مُنہ سے نکال سکتے ہیں۔" اب اگر ایسے لوگوں کے ساتھ رہنے سے کہ جن کی خوبی اُس اعلیٰ ہستی کی خوبی سے کروڑہا درجہ گھٹی ہوئی ہے جب انسانی فطرت کو بلند اور پاکیزہ بنا سکتی ہے تو مسیح کے اثر کی کیا کوئی حد ہو سکتی ہے۔

غالب ہو رہوں گر تو میرے ساتھ

آٹھویں فصل

ہندوستان کی کلیسیا اور اسلام کے مسیحی نو مرید

سترھویں صدی کے دوسرے حصّہ میں فرانسس برنیئر نے جو دربارِ مغلیہ میں ایک فرانسیسی ملازم تھا۔ فرانس میں اپنے ہم وطن دوستوں کو یہ لکھا کہ "اگر دس برس کے عرصہ میں ایک بھی مسیحی مسلمانوں میں سے دیکھنا چاہتے ہو تو تم کو مایوس ہونا پڑے گا"۔ یہ ممکن ہے کہ اُس کی اس قسم کی حوصلہ شکن پیش بینی کا سبب یہ ہو کہ اُس کا زیادہ تعلق اورنگ زیب سے تھا کہ جس سے زیادہ دین اسلام کا حامی اور کوئی مسلمان بادشاہ نہیں گذرا ہے۔ دوسری طرف اُس کے ماننے میں بھی شک کی گنجائش کم ہے کہ برنیئر جیسا تیز فہم صاحبِ بصیرت شخص اس زمانہ میں بھی اُن بعض رکاوٹوں کو سمجھ گیا ہوگا جو اسلام کی صفتِ امتیازی میں داخل ہیں اور جن کے باعث جب کبھی کوئی مسلمان اپنی اطاعت خداوند مسیح کی طرف منتقل کرتا ہے تو یہ واقعہ اُس کی زندگی کا گویا ایک ماجرا بن جاتا ہے۔

تاہم برنیئر کی یہ مایوس کن پیش بینی وقتاً فوقتاً بار بار غلط ثابت ہوتی رہی ہے۔ اس ملک میں موجودہ تبلیغی کاموں کے ابتدائی ایام سے نہ صرف سال بھر میں ایک بلکہ اکثر ایک سال میں دس مسلمان بھی مسیحی ہوئے ہیں۔ درحقیقت اسلام سے

نکل نکل کہ اس قدر لوگ ہندوستان کی مسیحی کلیسیا میں داخل ہوئے ہیں کہ دوسرے ملکوں کے مسیحی کارندے کہ جہاں مسیحی تبلیغ کا نتیجہ تھوڑا آیا ہندوستان سے کم رہا ہے۔ مسلمانوں کو خداوند مسیح کے لئے جیتنے میں ہند و پاکستان کو موقعہ کی سرزمین کہتے ہیں۔

مسلمان کو مسیحی بنانے کی خوشی کا تجربہ ہنری مارٹین کو حاصل تھا لیکن وہ اس فکر اور غم سے بھی واقف تھا جو ایک مسلمان کو مسیح کے پاس لے جانے کی کوشش میں اکثر اوقات دُکھ کا احساس بھی پیدا کر دیتا ہے اور یہی تجربہ ماضی کے بہادر مبشّرین کا بھی تھا۔ یعنی فنڈر۔ راس۔ لیفرائے۔ رولینڈ۔ بٹمین۔ پنٹل۔ ویری اور وائٹ ٹریٹ سٹانٹن۔ علاوہ ان کے خاص کر مشرقی بنگالہ میں جہاں اسلام کے نو مسیحیوں کا شمار غالباً سب سے زیادہ ہے وہ پنگورن۔ جونس۔ ٹیکل۔ گولڈسیک اور بہتیرے اور لوگوں کی محنت کا ثمرہ ہے اور پھر خود اُن نو مریدوں کے احسانات کا جو کلیسیائے ہندوستان پر ہیں کون اندازہ لگا سکتا ہے کہ جن میں مولوی صفدر علی۔ مولوی عماد الدین۔ پادری وارث الدین۔ ولایت علی دہلوی۔ کلکتہ کے امام مسیح۔ آگرہ کے سلامت علی جیسے نو مسیحیوں کا شمار ہے۔ اِن کے علاوہ بہتیرے گمنام اور غیر معروف لوگ ہیں کہ بعض اوقات کلیسیا میں شراکت کا بہت کم علم عوام کو ہوتا ہے۔

انہی میں سے وہ لوگ تھے کہ جنہوں نے ایمان ہی کے سبب سے دکاوٹوں کو مغلوب کیا۔ راست بازی کے کام کئے۔ وعدہ کی ہوئی چیزوں کو حاصل کیا۔ تلوار کی دھار سے بچ نکلے۔ بشارت کے کام

میں بہادر بنے اور افسوس! کہ بعض مار کھاتے کھاتے مر گئے۔ مگر رہائی منظور نہ کی۔ بعض ٹھٹھوں میں اُڑائے جانے اور کوڑے کھانے بلکہ زنجیروں میں باندھے جانے اور قید میں پڑنے سے آزمائے گئے۔ بعضوں نے ٹھوکریں کھائیں۔ سنگسار کئے گئے اور بے جان سمجھ کر سڑک کے کنارے پر چھوڑ دیئے گئے۔ آزمائش میں پڑے۔ محتاجی میں۔ مصیبت میں۔ بدسلوکی کی حالت میں مارے مارے پھرے اور ان سب کے باوجود اپنے اُس نئے ایمان کو جو مُنجی پر تھا تھامے رہے۔

ان نتائجِ مذکورہ کے باوجود بھی اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمانوں میں بشارت کی مشکلات جیسا کہ برنیر نے خود معلوم کیا تھا اب تک عام وقتوں سے کہیں زیادہ ہیں۔

اس کے متعلق بعض باتوں سے تو ہم بخوبی واقف ہیں مثلاً مسلمانوں میں سے نومسیحیوں کے شمار میں کمی اور بپتسمہ کے بعد بعض کے واپس چلے جانے کا خدشہ۔ اس قسم کی صورتِ حال کے بعض اسباب کا پتہ لگانا مشکل نہیں ہے اور اس کتاب کا غور سے پڑھنے والا اس کی اسلام کی تشریح کو پڑھتے ہوئے کچھ وجوہات خود معلوم کرلے گا۔ لیکن کچھ اسباب ایسے ہیں کہ اس کتاب کو سرسری طور سے پڑھنے والے پر صفائی سے ظاہر نہیں ہوں گے۔ اگرچہ ان میں سے بعض خود مسیحیوں ہی میں پائے جاتے ہیں۔ ہم نے ان موخر الذکر لوگوں کی خاطر یہ فصل اس یقین پر لکھی ہے کہ جب تک اسباب سمجھ میں نہ آئیں اور ان

کا مقابلہ دلیری کے ساتھ نہ کیا جائے ۔ نقائص کا علاج نہیں کیا جا سکتا ہے ۔

جن کو اس صورتِ حال کی حقیقت کا علم ہے اُن کے ذہن میں دو باتیں اُٹھتی ہیں کہ جنہیں مسیحی کلیسیا کا سخت دقت طلب مسئلہ ہی کے نام سے پکار سکتے ہیں ۔ یہ مسئلہ کوئی نیا نہیں ہے اور نہ درحقیقت ہند و پاکستان ہی کے حالات کے ساتھ مخصوص ہے ۔ اس کے متعلق صرف دو افسوسناک باتوں کا ذکر کرنا کافی ہے اور یہ مسئلہ فوراً سامنے آجاتا ہے ۔

(۱) مشرقی ممالک کی مسیحی کلیسیاء بہ حیثیت مجموعی عام طور پر اسلام سے آئے ہوئے نو مسیحیوں کو بڑے تپاک کے ساتھ قبول نہیں کرتی ہے ۔

(۲) خود نو مرید نئی جماعت میں اکثر اوقات تنہائی محسوس کرتا ہے کیونکہ وہ معلوم کر لیتا ہے کہ کوئی اُسے نہیں چاہتا ۔

ہمیں یقین ہے کہ اس مؤخر الذکر حالات کے تحت خداوند مسیح کے تمام سچے پیرو اس صورت حال کو مسیحی کلیسیا کی سخت ملامت کا باعث سمجھنے لگیں گے ۔

انکساری اور پوری صاف دلی کے ساتھ آئیے تاکہ مشکلات کے اصل اسباب تک پہنچنے کی کوشش کریں ۔

(۱)

ہماری تجویز ہے کہ پہلے ہم متلاشی اور نو مسیحی دونو کے حالات کو سمجھنے کی کوشش کریں ۔

(۱) متلاشی عام طور پر اسلام کی عمدہ باتوں سے پوری طرح واقف ہوتا ہے۔ مثلاً اپنے ایمان کی خاطر مسلمانوں کی سرگرم عقیدت مندی پر جو اکثر اوقات جنون آمیز جوشش کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ گواہی دے سکتا ہے اور بتا سکتا ہے کہ ان میں کتنے ایسے ہیں جو اپنے ایمان کی خاطر اگر ضرورت ہو تو سب کچھ یہاں تک کہ جان بھی دے ڈالنے کو مستعد ہیں اور پھر وہ ایمان داروں کی حقیقی برادری۔ اُن کے مساوات صاف دلی اور سادگی سے واقف ہوتا ہے۔

اس قسم کی باتیں اسے پیشتر ہی متنبہ کر دیتی ہیں کہ اگر اپنے باپ دادوں کے دین کو ترک کرنے کی اُس نے جرأت کی تو اُس کے اپنے لوگ اس کے ساتھ کس قسم کا سلوک کرینگے۔

(ب) اب ہم فرض کریں کہ متلاشی نے آگے قدم بڑھایا ہے اور اُس نے نہایت ہی اہم فیصلہ کر لیا ہے اور اسلام سے علیحدہ ہو گیا ہے تو وہ ایک نومرید اور علانیہ مسیحی ہے۔

سلہ ایک مسلمان کے قول سے جو اس نے ایک نومرید سے کہا ہمارے اِس خیال کی تائید ہوتی ہے جو حسب ذیل ہے "ہم اپنی کھوئی ہوئی سلطنت اور حکومت پر وقتاً فوقتاً زار زار رو چکے ہیں۔ ہمارا فخر توڑ ڈالا گیا ہم دولت و کامیابی سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔ ہمارا علوم و فنون ہم سے جاتا رہا۔ مراسم آداب کو بھی ہم رخصت کر چکے ہیں۔ اب صرف ایک چیز ہمارے پاس رہ گئی ہے یعنی اپنے مذہب سے عقیدت مندی اگر یہ جاتی رہی تو ہم بھی اسکے ساتھ جاتے رہینگے اگر یہ معدوم ہو گئی تو ہم بھی نیست ہو جائیں گے۔

اب اُس پر کیا گزرتا ہے؟ اُس کے مسیحی ہونے پر جہاں تک کل مسلمانوں کا تعلق ہے۔ اُس کی اپنی جماعتی حیثیت اور نیک نامی چھن جاتی ہے۔ وہ ایک ادنیٰ جماعت میں شامل ہو جاتا ہے وہ جانتا ہے کہ اس جماعت کے بشر کاء کو زیادہ تر مسلمان ذلیل سمجھتے ہیں۔ اب اُس کے اپنے ہم مذہب اپنی دشمنی کا اُسے نشانہ بناتے ہیں۔

اُسے سب سے سخت مخالفت کا سامنا اپنے رشتہ داروں اور خود اپنے گھر میں کرنا پڑتا ہے۔ ممکن ہے کہ ایسے موقعوں پر والدین غصہ کے باعث اپنے بس میں نہ رہیں۔ ایک نو مسیحی نے بتایا کہ کس طرح اُس کی نہایت عزیز ماں کی خودکشی کی دھمکی کے سبب عرصہ تک علانیہ مسیحیت قبول کرنے سے وہ رُکا رہا اور اُس نو مسیحی کے اس بیان سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کیسا مشکل ہے ایک دوسرے نو مسیحی نے کہا کہ جب وہ لڑکا ہی تھا تو موت کے ذریعہ اپنی ماں کے ہٹائے جانے میں اُس نے خدا کا ہاتھ کام کرتے دیکھا۔ پھر بعض اوقات نو مسیحی کی بیوی اپنے مرتد خاوند سے طلاق لینے کی کوشش کرتی ہے اور لے بھی لیتی ہے اور تھوڑے ہی عرصہ بعد دوسرے شخص کو شادی میں دے دی جاتی ہے۔

پھر کیا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ جب نو مسیحی کہتے ہیں کہ اپنے لوگوں سے اُن کی جُدائی اُن کے لئے دل توڑنے والے تجربہ سے کم نہیں ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ موجودہ حالات کے تحت انسانی نقطۂ نگاہ سے اپنے عزیزوں کے ساتھ ملاپ یا دوبارہ

اتحاد کی کوئی اُمید نہیں رہتی ہے۔ اُن کی ساری ملکیت اُن سے چھن جاتی ہے اور اُنہیں آخرکار معلوم ہو جاتا ہے کہ کوئی مسلمان اُن کے ساتھ کسی طرح کا تعلق نہیں رکھے گا۔ پھر ان باتوں پر اِس حقیقت کا بھی اضافہ کیجئے کہ اُنہیں ہر طرح کا ظلم بھی سہنا پڑتا ہے جو اسلامی جماعت کو چھوڑ کر علیحدہ ہو جاتے ہیں اُن کے احساسات کو صدمہ پہنچانے کے لئے مسلمانوں کے پاس خاص طریقے ہیں۔ ایسے نومسیحیوں کا شمار کم نہیں ہے کہ جنہوں نے مار کھائی۔ قید ہوئے۔ فاقہ کیا اور جنہیں زہر دیا گیا۔

پھر ان سب کے علاوہ نومسیحی کو زندگی کا بالکل نیا طرز اختیار کرنے اور نئی جماعت کے ساتھ تعلقات کو پیدا کرنے کی ضرورت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ اسلامی زندگی کے کشادہ اور سہل طریقہ کو چھوڑ کر مسیحی زندگی کا تنگ اور محتاط طریقہ اختیار کرتا ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ اب اُسے ایک حد تک خود ضبطی اور خود انکاری کی زندگی بسر کرتا ہے یعنی جو باتیں مسلمان ہونے کی حالت میں نہ اس پر واجب تھیں اور نہ جن پر اُس کا عمل تھا۔

یہ تمام باتیں برداشت کرنی مشکل ہیں لیکن ہم کو ماننا پڑتا ہے کہ یہی اُس کی پوری صلیب نہیں ہے جو اُسے اٹھانی ہے۔ اب جب کلیسیا کا وہ شریک بنتا ہے اکثر اُسے مایوس کرتی ہے اور کم از کم دو طریقوں سے۔

(۱) نومرید اکثر بڑی بڑی امیدیں باندھ کر آتا ہے اور

یقیناً یہ اُس کے لئے جائز ہے۔ وہ ایمان کی خاطر اسی قسم کی سرگرم عقیدت مندی اور ایمان داروں کی تحقیقی برادری اور مسیحی کلیسیا میں اُسی طرح کی خود انکاری ڈھونڈتا ہے کہ جس طرح کی وہ اسلام میں دیکھ چکا ہے۔ لیکن اکثر گہری روحانیت کی عدم موجودگی کا جب اُسے پتہ لگتا ہے اور اسلام کے پنجگانہ نماز کی جگہ جب اور کچھ اُسے نہیں ملتا اور جب وہ بہتیرے گھروں میں خاندانی دُعا کا نہ ہونا پاتا ہے تو اُسے سخت تعجّب ہوتا ہے۔ جب وہ اس حقیقت پر غور کرتا ہے کہ ہر مسلمان ایک معنیٰ میں ایسا مبلّغ ہے کہ جسے اپنے ایمان کی بات دوسروں تک پہنچانے کا شوق ہے تو اُسے حیرت ہوتی ہے کہ مسیحی کلیسیا کے لوگوں میں بشارتی جوش کیوں اس قدر کم ہے۔

(۲) اس کے علاوہ جلد اُسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ بہتیرے مسیحی اُسے کچھ مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ بعض لوگ کنایۃً ایسا ظاہر کرتے ہیں کہ گویا اپنے درمیان اُسے نہیں چاہتے یا اُن کا خیال ہے کہ اُس نے اپنا مذہب کسی نہ کسی غرض کے پُورا کرنے کے لئے تبدیل کیا ہے۔ بدقسمتی سے ایسے لوگ بھی ہیں۔ جو نومسیحیوں پر الزام لگانے کو تیار رہتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اُن کے خیالات گندے ہوتے ہیں اور وہ اپنے ساتھ عورتوں کی نسبت اسلامی خیال لے کر آتے ہیں اور وہ بڑے مغرور ضدی اور جھگڑالو ہیں۔ لیکن یقیناً سب سے زیادہ دل پر چوٹ لگانے والی اور نہایت بے موقعہ بات اُن کا علانیہ یہ کہنا ہے کہ کبھی نہ

کبھی وہ اسلام میں واپس چلا جائے گا۔

یہ اس قسم کی ذہنیت کے افسوس ناک نتیجہ کا عملی اظہار ہے۔ مسیحی لوگ اپنی بیٹیاں اور اپنی بہنیں اسلام سے آئے ہوئے نومسیحیوں کو شادی میں دینے سے انکار کرتے ہیں۔ اپنے رشتہ داروں سے جدا ہوتے وقت ان نومسیحیوں میں اگرچہ جدائی کا بہت گہرا احساس تھا لیکن ان کی اس وقت کی حالت نے تنہائی کے اور بھی تلخ احساس کا اُن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

جو کچھ کہ نومسیحی چاہتا ہے اور جس کی مسیح کے پیروؤں سے اُسے توقع کرنا جائز ہے وہ مرتبہ اور روپیہ نہیں بلکہ میل ملاپ اور ہمدردی لحاظ اور مہربانی ہیں۔ اُس کے اس توقع کی بنیاد خود خداوند مسیح ہیں اور اب ہم نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہتے ہیں کہ جہاں کہیں اور جب کوئی نومسیحی اپنی نئی زندگی کے ابتدائی ایام میں ان مسیحیوں میں یہ باتیں نہیں پاتا کہ جن کے درمیان وہ رکھ دیا گیا ہے تو اُس کے لئے حقیقی خطرہ ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ بخوبی واقف ہے کہ صرف ایک ہی لفظ یعنی توبہ کے کہنے پر وہ واپس جا سکتا ہے اور جو اُس کو دوبارہ اپنی جماعت میں لینے کی کوشش میں لگے ہیں بڑے تپاک سے اس کا خیر مقدم کریں گے۔

(۴)

نومریدوں کے ساتھ مسیحیوں کی اس ذہنیت کے سبب کی تشریح میں تو کچھ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسی ذہنیت کے درست ٹھہرانے کے لئے یقیناً کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔

(۱) ایک سبب تو ماضی کی یاد اور وہ پُرانی نفرت اور ڈر ہے جو اُس زمانہ سے کہ جب مسلمان بحیثیت فاتحین کے مفتوحوں پر ظلم کرتے اور اُن کی تحقیر کرتے تھے موروثی طور پر ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے نیز دوسرے مذاہب سے آئے ہُوئے مسیحیوں کو یہ شک رہتا ہے کہ اب بھی اُن میں یہ غرور پایا جاتا ہے۔ یہ تو صریحاً ظاہر ہے کہ یہ ایسی بات ہے جو جلد نہیں دُور کی جا سکتی۔

(۲) ہندوستان کی کلیسیا اب تک تبلیغی کلیسیا نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ زمانہ حال سے پیشتر ہندوستانی کلیسیا کا متلاشیوں کی دیکھ بھال اور نو مسیحیوں کو مسیحی رفاقت میں شریک کرنے کے کام میں کوئی حصّہ نہیں رہا ہے اور یہی سبب ہے کہ کلیسیا کے بہتیرے شرکاء کو ان نو واردوں سے صاف دلی کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں ہے اور ان کی خبر گیری کرنا وہ اپنا کام نہیں سمجھتے۔

(۳) اس کا تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایسے واقعات بھی پیش آ چکے ہیں کہ بعض نو مریدوں کا رویہ اطمینان بخش نہیں رہا ہے۔ لیکن صرف ایسے بعض واقعات کو کہ جب وہ مسیحیوں میں شادی کرنے کے بعد اپنی بیوی اور بچّے چھوڑ کر واپس چلے گئے ہیں تو سب کے لئے ایک نظیر ٹھہرا لینا بے انصافی ہے۔

(۴) اسلام سے آیا ہوا نو مسیحی دیگر مسیحیوں سے مختلف ہوتا ہے۔ اُس کی اصطلاحیں مختلف ہوتی ہیں اور اُس کا طرز خیال جُدا ہوتا ہے۔ اُس کا نقطۂ نگاہ اوروں سے علیحدہ ہوتا ہے،

اور اُس کے دستورات مختلف ہوتے ہیں اور اکثر اُس کا پہناوا بھی اوروں سے مختلف طرز کا ہوتا ہے اور دوسرے اُس کا چہرہ دیکھ کر بھی بعض اوقات بتا سکتے ہیں کہ یہ اوروں سے مختلف ہے۔

(۵) اور بے شک مسلم نومسیحی کو خود اس بات کا اعتراف ہوگا کہ اُس میں یہ امکان ہے کہ نئی جماعت میں وہ چند ناپسندیدہ بلکہ ناگوار باتیں بھی لے کر آجاتے ہیں اور اُس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں زندگی کا معیار مسیح کی کلیسیا کے معیار سے ادنیٰ ہے اور خود اُن کے اپنے اقرار کے بموجب اُن میں یہ بُرائیاں زیادہ نمایاں طور پر پائی جاتی ہیں۔ یعنی اسراف خود ضبطی کا نہ ہونا۔ غصہ ور طبیعت حلیمی اور عمیق دور اندیشی کی کمی۔

(۶) اپنی اطاعت کو خداوند مسیح کی طرف منتقل کرنے کے باوجود بھی اخوّت اسلامی کی کھینچ تان کو محسوس کرتا رہتا ہے اور وہ اس بات پر فخر کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اُس کا تعلق وسیع دنیائے اسلام کے ساتھ رہ چکا ہے۔

یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ بعض باتیں جوان نومریدوں کے حق میں مسیحی کہتے ہیں ان کا خاص سبب ہے۔ مذکورہ بالا وجوہات پر اور بھی مزید اضافہ کیا جا سکتا ہے لیکن شاید جس قدر کہا گیا وہ کافی ہے۔

(۲)

اب ان حقیقتوں کی موجودگی میں ہمیں وہ تاکیدی کام نظر آتا ہے کہ جس کا کرنا تمام ایسے سنجیدہ مزاج مسیحیوں کو درپیش ہے جو یقیناً غیر مسیحیوں کے سامنے نہ صرف یہ دعوےٰ ہی کرنا چاہتے ہیں کہ مسیح یسوع

میں نہ "یونانی رہا۔ نہ یہودی۔ نہ ختنہ۔ نہ نامختونی۔ نہ وحشی نہ سکوتی۔ نہ غلام نہ آزاد" بلکہ ویدی کلیسیا میں اسے سچی حقیقت ثابت کر دکھانے کی فکر میں ہیں۔

وہ کام یہ ہے کہ طرفین کی مشکلات کو پوری طرح مانتے ہوئے اس کُل مسئلہ کو باہمی بدگمانی اور نکتہ چینی کی سطح سے اوپر زیادہ پاکیزہ فضا کی بلندی پر لے جائیں کہ جہاں ہم اس مسئلہ پر اُس کے نقطۂ نگاہ سے غور کر سکیں کہ جس نے ہم سے محبت کی اور اپنے آپ کو ہماری خاطر دے دیا" اور یوں اُس کی اور آپس کی باہمی رفاقت کے وسیلہ سب سے بڑے کارِ عظیم میں متحد ہوں یعنی خدا کی بادشاہت کے پھیلانے میں۔

اگر ہم کسی کافی بڑے منصوبہ کے بس میں آجائیں تو کل نالائق تصورات خود ہی آخر کار معدوم ہو جائیں گے۔ اب اس قسم کا بڑا منصوبہ یہ ہے کہ ہم کلیسیا پر غور کریں اور کلیسیا کو اس طرح تیار کرنے میں مصروف ہوں کہ یہ نو مریدوں کا گھر بن جائے۔ یہ کام ہر اعتبار سے کس قدر زیادہ اطمینان بخش ہوگا کہ بجائے یہاں وہاں نو مریدوں کا گھر یا دار الاقامتہ قائم ہونے کے ہر علاقہ میں کلیسیا درحقیقت نو مریدوں کے لئے گھر یا دار القیام بن جائے۔

اس منصوبہ کو پورا کرنے کے لئے چند خاص صورتوں کی پیروی کی ضرورت ہے۔

(۱) بجائے غیر ملکی تنخواہ دار کارندوں کے چاہئے کہ ہر مقامی کلیسیا بشارتی کاموں کا خاص مرکز بن جائے۔ گذشتہ زمانہ میں کلیسیا نے اس کام میں کوتاہی کی ہے اس کا کچھ سبب تو موقعہ اور تربیت دونوں کی کمی

ہیے۔ اب اگر آج ہندوستان میں کلیسیا کی گواہی کو متاثر بنانا ہے تو اس نقص کو ضرور دور کرنا چاہئے۔ پنجاب کے پادری جے۔ ایچ ہنرک صاحب جنہوں نے اس مسئلہ پر خوب غور کیا ہے صحیح طور پر فرماتے ہیں کہ "مسلمانوں میں بشارت کے کام کا بڑا مسئلہ میرے خیال میں کلیسیا کو اُس فصل کی خبر گیری کرنے کے لئے مستعد کرنا ہے جو معلوم ہوتا ہے کہ خداوند نے تیار کی ہے۔ کوئی کلیسیا فصل کی خبر گیری کرنے کے لئے کبھی مستعد نہیں ہو سکتی ہے جب تک کہ اُس فصل کے حاصل کرنے میں بھی اُس نے حصّہ نہ لیا ہو۔ اگر مسلمانوں میں بشارت کا کام خاص کر تنخواہ دار ماہر مبشّرین کے ذریعہ ہوتا رہے گا تو ہم دیکھتے رہیں گے کہ ایک مُردہ اور سرد پڑی ہوئی "کلیسیا" اُن روحانی بچوں پر نظر بھی نہیں ڈالتی کہ جنہیں مشنری کبھی کبھی لا کر اُس کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس قسم کے لائحہ عمل کے نہ ہونے کے باعث کلیسیا اپنی خوشی اور اخلاقی حُسنِ انتظام کا بہت بڑا حصّہ کھو رہی ہے۔

اسی طرح قاہرہ کے مرحوم کینن گیرڈر نر نے کہ جن کے دل پر اس معاملہ کا بھاری بوجھ تھا یہ کہا کہ "اس سبب سے جو کلیسیا یا جماعت اسلام سے نکلے ہوئے نو مریدوں کے لئے ایک گھر بننا چاہتی ہے اور بننے کی کوشش کرتی اور بن جانے میں کامیاب ہو جاتی ہے وہ بذات خود ایک خوشخبری ہے کیونکہ کلیسیا اس طریقہ سے ایک بہترین اعلیٰ ترین اور سب خوشخبریوں سے بڑھ کر مسیح کے موافق خوشخبری کی یہ منادی کرتی ہے جو ایسی خوشخبری ہے کہ ہر شخص اُسے نہایت آسانی سے سمجھ سکتا ہے اور جو بغیر خوشخبری کے ہیں وہ نہایت آسانی کے ساتھ اسے پیار کر سکتے ہیں اور نہایت طاقت کے ساتھ یہ خوشخبری اُنہیں اپنی طرف لانے کو کھینچ لے گی۔ ہاں اور اس کا تو ذکر ہی چھوڑ دو کہ

درحقیقت یہی کلیسیا غیر مسیحیوں کے درمیان منادی کے عام مفہوم میں بشارت کے کام کو نہایت ہی سرگرمی کے ساتھ انجام دے گی۔

پس ہم دیکھتے ہیں کہ متلاشیوں کا پیچھا کرنے اُن کو تعلیم دینے اور اُن کی خبرگیری کرنے کے لئے ہماری نگاہ خاص کر کلیسیا پر ہونی چاہئے اور اس لئے جب کوئی متلاشی مسیحی زندگی اختیار کرنے کی خواہش ظاہر کرتا ہے تو خود مشنری کا تعلق ہو یا کسی اور کا چاہئے کہ اس کا تعارف مقامی کلیسیا کے جتنے مسیحیوں سے ہو سکے کرا دیا جائے تاکہ مسیحی جماعت کے لوگ اس سے واقف ہو جائیں اور عظیم فیصلہ تک اُس کی رہنمائی کرنے میں اُن کا بھی کچھ حصہ ہو۔

(۲) بپتسمہ کے امیدواروں کی تیاری میں جس قدر وقت اور توجہ اب تک دینے کا دستور رہا ہے اُس سے زیادہ کی ضرورت ہے۔

جو دلی تبدیلی کا دعویٰ کرتے ہیں اُن کے اغراض اور یقین کو تجسسانہ طور پر پرکھنا چاہئے۔ اس معاملہ میں کمی کا ہونا بپتسمہ کے بعد واپس چلے جانے کی ایک وجہ ہے۔ بعض اوقات متلاشی جلد ہی مطمئن ہو جانے پر مائل ہوتا ہے اور ایسے لوگ اخلاقی اور روحانی دقتوں کو لے کر آنے کی بجائے عام طور پر وہ ذہنی دقت لے کر آتے ہیں اس لئے ہمیں محتاط ہونا چاہئے کہ ہم کلیسیا میں ایسوں ہی کو نہ لے آئیں جو دراصل مذہب تبدیل کئے ہوئے مناظرین ہیں۔ .... یعنی ایسے لوگ کہ جن کا ذہن تو قائل ہو گیا ہے لیکن ان کا دل تبدیل نہیں ہوا ہے مقدس پولوس کا یہ قول کسی اچھی سند پر مبنی ہے کہ راست بازی کے لئے ایمان لانا دل سے ہوتا ہے (رومیوں ۱۰: ۱۰) ہندوستان کی کلیسیا کو ایچیول

کی ضرورت نئے مذہبی "جنونیوں" کی نہیں۔

جو دقتیں نومریدوں کو پیش آتی ہیں انہیں ذہن میں رکھ کر ہمیں چاہیئے کہ مناسب وقت پر نئناہشی کی ایسی ہدایت کریں کہ وہ اپنا بھروسہ خدا پر رکھے اور یسوع مسیح کے اچھے سپاہی کی طرح دُکھ اٹھانے کو تیار ہو۔ اُسے یہ ضرور سمجھا دینا چاہیئے کہ جو قدم آگے کو وہ اٹھانا چاہتا ہے وہ مسیح کی خاطر ہے اُسے یہ بتا دینا درست بھی ہوگا جو پولوس کو شروع ہی میں بتا دیا گیا تھا کہ مسیح کی خاطر اُسے کس قدر دُکھ اٹھانا پڑے گا (اعمال ۹: ۱۶) ہاں بلکہ خداوند مسیح کو تنہائی برداشت کرنی پڑی اور آپ کی طرح کوئی تنہا نہیں رہا اور پھر بھی مسیح ہمارے لئے اور نومرید کے لئے کافی ہے اگرچہ باقی سب طرف سے ہاں کلیسیا سے بھی ہمیں مایوسی کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے

اگرچہ ان امیدواروں سے ہمارے مطالبات کا معیار بپتسمہ سے قبل کے حالات کے تحت مختلف ہوگا تاہم چند باتیں ایسی ہیں جو کم از کم امیدواروں میں ہونی چاہئیں۔

(۱) مسیح پر ایمان رکھنے کے مطلب کو کافی طور پر سمجھ لینا۔

(۲) روز کی زندگی اور عمل میں اس نئے ایمان کو ظاہر کرنا۔

(۳) روحانی زندگی کی ترقی کے لئے روزانہ دُعا اور جو پڑھ سکتے ہیں مطالعہ بائبل کی عادت ڈالنا۔

(۴) مسیح کے لئے گواہی دینے کی سچی آرزو کا ہونا۔

(۵)۔ نومریدوں کی خبرگیری پر یعنی جو کلیسیا کے حال ہی میں شریک ہوئے ہیں جس قدر توجہ دی گئی اُس سے کہیں زیادہ ان کی خبرگیری کرنے کی ضرورت ہے چنانچہ یہ ذیل کا بیان ہمارے لئے خود اپنی ملامت کا

باعث ہے کہ جو کسی نومرید کو کسی معقول سبب کی بناء پر کہنا پڑا "جب میں متلاشی تھا تو جتنی زیادہ پرواہ میری کی جاتی تھی تھوڑی تھی۔ لیکن اب جب کہ میرا بپتسمہ ہو چکا تو میری صورت بھی اُن کو ناگوار لگتی ہے اور میں اُن کے لئے ایک مصیبت ہوں۔"

ہمیں اپنے "حاصل" کو محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ اس کا بپتسمہ ہو چکا ہے تو بھی ایسے شخص کو اور تعلیم کی ضرورت ہے اور سب سے بڑھ کر اُسے ایک دانا صلاح کار اور ایک پکا دوست چاہیئے اور اس مقصد کے لئے مقامی کلیسیا کے پاسبان سے بڑھ کر اور کوئی زیادہ موزوں نہیں ہے۔ آگے چل کر ہم اسی موضوع پر اور زیادہ کہیں گے۔

(۴)

اس قسم کی مطلوبہ اصطلاحات کے پورا کرنے میں کہ جس کا ذکر کچھ تفصیل کے ساتھ ہم کر چکے ہیں عملی قدم بڑھانے کو چاہیئے کہ سنجیدہ مزاج مسیحی ہر جگہ اس کام کی تیاری کریں جو تبدیلی خیالات کی مہم کہلاتی ہے۔ اگر ہندوپاک کی مسیحی کلیسیا ان تمام مطالبات کو جو اُس سے کئے جائیں گے پورا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اور اگر خاص کر وہ نومریدوں کا گھر بننا چاہتی ہے تو بہتر ہے ہندوستانی مسیحیوں کے زاویۂ نگاہ میں کئی ایک بڑی تبدیلیوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں کہ زمانۂ حال میں جن کا ہونا سخت ضروری ہے۔

(۱) اسلام سے آئے ہوئے نومریدوں کے متعلق ایسے اقوال دُور تک پھیلے ہیں کہ جن میں لاپرواہی اور سخت دلی پائی جاتی ہے اور جو اس

لائق نہیں ہیں کہ مسیحی اُن کا استعمال کریں۔ ان سخت جملوں سے کلیسیا کے شرکاء کی بدگمانی اور رشک کا اظہار ہوتا ہے جو ان نو مریدوں کے متعلق اُن کے دل میں موجود ہوتے ہیں لیکن اس سے بھی زیادہ ان نومسیحیوں کے احساس کو ان سے کہیں زیادہ سخت صدمہ پہنچتا ہے کہ جنہیں ایسے دوستوں کی ضرورت ہے جو بھائی سے بھی زیادہ قریب ہوں۔

ان سطروں کے پڑھنے والوں کو جو ایسے اقوال سے واقف ہیں چاہئے کہ اس بات کا مصمم ارادہ کریں کہ وہ ایسے الفاظ کا استعمال ہرگز نہ کریں اور ان کے استعمال سے دوسروں کو بھی روکیں اس مہم کے تمام ایسے اقوال کو مٹ جانا چاہئے کہ جن سے دونوں فریق کو بے حد نقصان پہنچتا ہے۔

(۲) تبدیلیٔ دل کی اس مہم کے لئے ہمیں چاہئے کہ تمام پادریوں۔ پاسبانوں، مناددوں، بائبل سکھلانے والی عورتوں۔ اُستادوں۔ کلیسیا کے شرکاء باپ۔ اور ماں کی تائید حاصل کریں۔

چاہئے کہ یہ بڑا منصوبہ یعنی کلیسیا کا نومریدوں کے لئے گھر ہونا وعظوں لکچروں۔ جماعتی مطالعوں اور کتب و رسائل کے ذریعہ تمام مسیحیوں میں پھیلایا جائے۔ اگر ہم آنے والی نسل کو ٹوٹنے اور نقصان دہ راہ سے بچانا چاہتے ہیں تو جتنی جلدی ہم کر سکیں ہمیں یہ کام شروع کر دینا چاہئے۔

(۳) ہماری مقامی کلیسیاؤں کو زیادہ ضرورت ان دنوں اندریاس کی نہیں ہے بلکہ برنباس کی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اندریاس کی رُوح درکار ہی نہیں۔

مقدس پولوس کا ابتدائی تجربہ جو اُسے یروشلم کی کلیسیا کے شرکاء

سے پیش آیا ممکن ہے کہ اسلام سے آئے ہوئے نومریدوں میں بھی دہرایا جائے۔ پولوس نے مسیح کے شاگردوں میں مل جانے کی کوشش کی مگر ناکامیاب رہا اور یہ ناکامیابی اُس کے اپنے قصور سے نہ تھی بلکہ اُن کے قصور سے۔ (اعمال ۹: ۲۶)

حقیقت یہ ہے کہ سب اُس سے ڈرتے تھے "کیونکہ اُن کو یقین نہ آتا تھا کہ یہ شاگرد ہے"۔ پولوس کی حالت کیسی مایوس کن ہو گی یہاں تک کہ آخرکار برنباس اُس کی حمایت پر کھڑا ہوا اور تنہا اُس کا ساتھ دیا اور اُسکی طرف سے تجویز پیش کی۔ برنباس کی ہمت اور مہربانی اور ساتھ ہی یروشلم کی کلیسیا کی جرأت پوری طرح درست ٹھہریں اور پولوس اُن کا عزیز اور ایسا شخص کہلایا کہ جس نے "اپنی جان خداوند یسوع مسیح کے نام پر نثار کر رکھی ہے"۔ (اعمال ۱۵: ۲۵ و ۲۶)

(۴) یہ بھی ضروری ہے کہ مسیحی گھروں کے دروازے ایسے لوگوں کے لئے مستعدی سے کھول دیئے جائیں جو اپنے مسیحی ہونے کے سبب خاندانی دائرہ کی خوشی سے محروم ہیں۔ اسلام کے بعض نومریدوں نے مسیحی خاندان کی مہمان نوازی میں شریک ہو کر اور ہمدردی، محبت اور دوستی کی فضا سے اپنے آپ کو گھرا پا کر بڑی تسلی پائی ہے۔

(۵) اگرچہ متلاشی کو مادی مدد دینے کے وعدہ سے پورا احتراز کیا جاتا ہے پھر بھی ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ جونہی وہ مسیح کا اقرار کر کے نومریدین جاتا ہے تو اُس کے لئے ہم پر خاص فرائض عائد ہو جاتے ہیں یعنی جسطرح ہم اب تک اُس کی رُوح کے لئے فکرمند رہے ہیں۔ اب ہمیں اُس کے جسم کی بھی فکر کرنی چاہئے اور یہ اس خاص سبب سے کہ مسیحی ہو جانے

پر اُسے بہت مرتبہ زندگی کے گذران کی چیزوں کی بھی سخت ضرورت پڑیگی۔ ہاں اُس کے مسیحی ہو جانے پر ہمیں ایک بائز موقعہ ملتا ہے کہ اِس طرح اُس کی مدد کر کے ہم جو اُسے تعلیم دے چکے ہیں اُس کو عملی سبق بتائیں۔ یاد رہے کہ جب تک نو مسیحی خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لائق نہ ہوں وہ مالی امداد کی ہم سے توقع کرنے میں بے شک حق بجانب ہیں اور ہم اگر اُن کی مدد کرنے میں کوتاہی کریں تو وہ ہماری اپنی بائبل ہمارے خلاف پیش کر سکتے ہیں۔ (یعقوب ۲: ۱۵-۱۷ و ۱ یوحنا ۳: ۱۷، ۱۸)

ہم اِس خیال سے کہ ہماری امداد سے کہیں نقصان نہ پہنچے اِس قدر ڈرتے ہیں کہ یہ قول بالکل بھول جاتے ہیں کہ "اصل خطرہ موقعہ کے استعمال میں نہیں بلکہ موقعہ کو کھو دینے میں ہے"۔